

سلسلہ مطبوعاتِ ادارہ ادبیاتِ اردو شمارہ ۲۶

# پانچ گونہ

عبدالحق صدیقی

ام اے۔ ال ال بی۔ استاذِ تدریس  
جامعہ عثمانیہ

۱۹۳۹ء

مطبوعہ ملکیتِ سید ابوالحسن حسین پریس حیدرآباد دکن

۱۵  
صفحات (۳۵۰)

# مضامین

۱- دیباچہ	صفحہ ۳	گیارھواں باب سلطنت کی توسیع و ترقی	صفحہ ۱۰۸
۲- مقدمہ	۵	بارھواں باب عبدالرحمن	۱۱۳
حصہ اول سلطنت کی تاسیس		حصہ چہارم سلطنت کا زوال	
پہلا باب قطب شاہی گھرانہ	۹	تیرھواں باب حکومت کی کمزوری	۱۲۱
دوسرا باب سلطنت کا آغاز	۲۰	چودھواں باب احمد نگر کا خاتمہ اور گولکنڈے کی حکم برداری	۱۲۹
تیسرا باب عہد انتشار	۳۳	پندرھواں باب کرناٹک کی فتوحات اور ان کا بندوبست	۱۴۲
حصہ دوم سلطنت کا استحکام		سولھواں باب مغل سلطنت سے پرفاش	۱۵۴
چوتھا باب ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے	۴۷	سترھواں باب ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی	۱۷۳
۱- پانچواں باب ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی	۵۹	۱۸- اٹھارھواں باب مادنا کی وزارت	۱۸۸
۲- چھٹا باب سلاطین دکن کی باہمی کشمکش	۶۸	۱۹- اسیسواں باب جنگ ملکہیٹر	
۳- ساتواں باب جنگ تالیکوٹ	۷۸	۲۰- بیسواں باب گولکنڈے کا محاصرہ اور اس کا خاتمہ	۲۲۴
۴- آٹھواں باب سلطنت کی تعمیر	۸۶	حصہ پنجم گولکنڈے کا تمدن	
حصہ سوم سلطنت کا عروج		اکیسواں باب سیاست و معاشرت	۲۵۳
۱- نواں باب دکن کا سیاسی توازن	۹۱	۲۱- بیسواں باب معاشی حالت	۲۷۵
۲- دسواں باب دکن پر مغلوں کے حملے	۱۰۰	۲۲- بیسواں باب علمی سرپرستی	۲۸۸

چوبیسواں باب دکن کی ترقی و ترقی

# فہرست تصاویر

صفحہ	سرورق	
		۱۔ گو لکنڈے کا عام منظر
۲۰		۲۔ سلطان قلی قطب شاہ
۳۲		۳۔ جمشید قلی قطب شاہ
۵۰		۴۔ ابراہیم قلی قطب شاہ
۹۰		۵۔ محمد قلی قطب شاہ
۱۱۲		۶۔ سلطان محمد قطب شاہ
۱۲۰		۷۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ
۱۱۰	۱۲۰	۸۔ سلطان ابوالحسن قطب شاہ
۱۹۷		۹۔ علی عادل شاہ ثانی
۲۴۸		۱۰۔ مقابلہ سلاطین گو لکنڈہ
		۱۱۔ مقبرہ ابوالحسن تانا شاہ

# وساچہ

سے کی جہاں میری لشتیں گزری ہیں ایک مبسوط تاریخ لکھنا چاہتا تھا جو میرا  
یہاں کے مطالعے کے کوئی تمدن و سیاست کی صحیح تلاش نہیں ہو سکتی لیکن  
اگیا اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں نے بھی اس میں بہت تاخیر کی۔  
ہا، اور بدعات مضامین بھی لکھے تھے جو تقریباً ہر دور اور عہد پر حاوی ہیں  
کتاب کی شکل میں پیش کر دوں لیکن جب میں ان مضامین کو جمع کرنے بیٹھا تو  
میں بہت کچھ کام کرنا ہے، کیونکہ اس موضوع کے مطالعے میں جن ماخذوں سے  
ماضی ماخذ ہیں اور کچھ بیرونی مورخوں اور سیاحوں کے بعض مورخوں اور  
فی بہت غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور بعض مورخوں نے دانستہ اشتہار بازی  
کے نصب العین سے متعلق صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہے اس میں بڑی چھان بین کی  
زاف ہے کہ باوجود اس محنت کے میں اس مضمون کا حق ادا نہیں کر سکا ابھی اس کے  
یاہر ہیں، اگر ان کا مطالعہ ہو تو اس تاریخ میں پیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔  
ناظرین کے سامنے پیش ہے وہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ترمذی کا لکھا  
ج حیدر آباد میں علمی کام کرنے والوں کی بڑی جوصلہ افزائی محترم



سچ تو یہ ہے کہ موصوف کے شدید نقائص اور اصرار سے یہ کتاب تیار ہوئی ورنہ اس میں بہت تاخیر ہوتی۔  
 ہمارے ادبی کرم فرما پر وفیر عبدالقادر صاحب سروری کی حوصلہ افزائی اور ادبی مشوروں کا میں  
 ہوں موصوف نے ہرگز سے وقت میری حوصلہ افزائی کی، نیز مجھے بھوپال راؤ صاحب ام اے کا شکریہ ادا  
 جسے مجھے کرناٹک اور مادنا کے خاندان سے متعلق معلومات دستیاب ہوئیں یہ معلومات مدراس کے  
 انے اور تلنگی ماخذوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ آخر میں عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی اس ہی عثمانیہ کا بھی  
 روری ہے جنہوں نے مسودوں کی ترتیب اکائیوں اور پروت کی اصلاح میں پوری مدد دی مولوی  
 کامل نے میرے دوسرے فرائض اپنے ذمے لے کر میرا کام بہت ہلکا کر دیا، ورنہ یہ کام جلد نہ ہو سکتا۔  
 ہے کہ لکھائی اور چھپائی کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں رہ گئیں جو بعض جگہ بدنام معلوم  
 نائیکے آخر میں ایک صحت نامہ منسلک کر دیا گیا ہے جس سے اس خرابی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

صدیقی

حمایت نگر وڈو حید آباد کن

جمادی الاول ۱۳۵۸ھ

جون ۱۹۳۹ء

# مقدمہ

گو لکندے کی دو سو سال کی تاریخ ہے، دکن کی اور ہمسر سلطنتوں کے ساتھ پندرہویں صدی کے آخری عشرہ میں اس کی داغ بیل پڑی تھی اور سترہویں صدی کے اواخر میں اس کا خاتمہ ہوا چونکہ یہ ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی گوشے میں واقع تھی اس لیے اپنے موقعہ محل کے اعتبار سے یہ ہندوستان کے بڑے سیاسی اور تمدنی مرکزوں سے بہت دور تھی اس کا بہت سوں کو علم نہیں تھا، اور اب بھی ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے باول نا خواستہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو بہ شکل تاریخ ہند کے ایک گوشے میں جگہ ملتی ہے لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو سلطنت گو لکندہ آندھرا ویش کی بہت بڑی سلطنت تھی۔ اس کی ایک وسیع تاریخ ہے جس کے ہر مد و جز میں تمدن کی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ وہ سلطنت تھی جس کا خوشگوار تمدن دو سو سال تک تلنگانے کے رہنے والوں کو گرویدہ کیے ہوئے تھا اگرچہ بعض ممالک میں یہ پیروں کی سلطنت مشہور تھی، اور وسط ایشیا کے تاجر صرف پیروں کی وجہ سے اس کو جانتے تھے لیکن مغربی سیاحوں کو اس کا درختاں تمدن کھینچ لاتا تھا جو سیام شمالی ہندوستان دیکھتے تھے وہ گو لکندہ دیکھنے کے لیے ضرور آتے تھے اور اپنے ساتھ نئے تاثرات لے جاتے تھے اٹالوی سیاح بونی نے گو لکندے کا نظرا فرورق کھینچ کر لکھا تھا یہ ہے وہ گو لکندہ جو دو تین صدیوں تک ہندوستان کا اعجوبہ بنا ہوا تھا۔

قلب شاہی سلطنت کو اس لامرکزیت کی پیداوار سمجھنا چاہیے جو پندرہویں صدی کے آخر میں تمام دکن پر چھا گئی یہ ایسا گھناٹا پاندھیر تھا جس کی تاریکی میں دور ہیں اہل بصیرت بھی مستقبل کا صحیح پتا نہیں لگا سکے کہ دکن کس طرف جا رہا ہے یہ اہل میں سلطنت پھرتی کا افسوسناک زوال تھا جس نے دیکھتے دیکھتے تمام دکن کو متزلزل کر دیا۔ چودھویں صدی کے وسط میں سلطنت قائم ہوئی تھی اور اپنے لائق بادشاہوں کی رہنمائی میں سو سال تک پروان چڑھتی رہی اس کے باقی دکن کے تاریخ ساز "امرے" صدہ "تھے جنہوں نے اپنے ایک برگزیدہ حلیف علاؤ الدین چنگیز شاہ سے مل کر انشا بادشاہ منتخب کر کے اس سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور رفتہ رفتہ اس کو مستحکم کیا۔

فیروز شاہ بہمنی کے آخری عہد تک جو اس سلطنت کا بام عروج تھا اس کی رفتار ترقی میں کوئی فرق نہیں آیا پہنچاؤ میں نہ اس سلطنت نے دکن کی خوابیدہ طاقتوں کو جگایا تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلائی بلکہ فیروز شاہ کے جانشین محمد شاہ ولی بہمنی کے عہد سے جو ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا یہ سلطنت بدقسمتی سے طبقہ واری کش کش کا شکار ہونے لگی جو بالآخر اس کے لیے پیام موت ثابت ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ملک کی آبادی دو مخالف فرقوں میں منقسم ہو گئی جو دکنی اور غیر دکنی کہلاتے تھے۔ اول الذکر تو سلطنت بہمنی کے حقیقی حامل "امراءِ مدہ" کی اولاد تھے جو اپنے کو دکن کا حقیقی وارث سمجھتے تھے کیونکہ انہیں کے آباؤ اجداد نے دکن کو اپنا گھرنایا اور بہمنی سلطنت کو سنوارا تھا۔ آخر الذکر میں نوادر دکن و ایرانی افراد تھے جو حکومت کی ہرمان نوازی سے فائدہ اٹھا کر چپکے چپکے سلطنت پر چھا گئے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں طبقوں میں رقابت پیدا ہوئی جو بالآخر بہت شدید ہو گئی۔ یہ بہت دھڑاں منظر تھا کہ جو طاقتیں متحدہ طور پر ملک کی خدمت میں مصروف تھیں وہ اب ایک دوسرے کی رقابت میں ضائع ہونے لگیں اور اس سے ملک کو بہت نقصان پہنچنے لگا۔ اس کش کش کا پہلا منظر علاء الدین ثانی کے عہد میں اور دوسرا منظر محمد شاہ لشکری کے عہد میں سامنے آیا جبکہ ان دونوں طبقوں میں سخت خونریزی ہو گئی بھلف حسن بھری اور محمود گاہاں اسی کش کش کا شکار ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ محمود گاہاں نے جو محمد شاہ لشکری کا وزیر تھا تمام مملکت کچھ اس طریقے سے اپنے میں جمع کر لی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی شخص اس سلطنت کا رکھوال نہیں ہو سکا کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے کوئی صحیح جانشین نہیں پیدا کیا تھا جو اس کی کھلی خود غرضی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ محمود گاہاں کے قتل کے بعد جو ۸۹۶ھ میں ہوا سلطنت بہمنی کا فوراً شیرازہ بکھرنے لگا جو لوگ اس سلطنت کے عمائد سمجھے جاتے تھے وہ علانیہ مغرت ہونے لگے اور جب ایک سال کے بعد ہی محمد شاہ لشکری کا انتقال ہو گیا اور اس کا کس بیٹا محمود شاہ اس کا جانشین قرار دیا گیا تو اس انتشار میں اور اضافہ ہوا چنانچہ ۸۹۶ھ میں جس کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہیے تمام صوبہ دار جو مختلف صوبوں پر قابض تھے خود مختار ہو گئے اور اس طریقے سے نظام شہری معادل شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اگرچہ اس گٹا ٹپ میں قلب شاہی سلطنت بھی قائم ہوئی تھی مگر عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں کا کل اثر کش کش کی درست پیدائش اور سمجھنا وسیع نہ ہو گا۔ اول تو قلب شاہی سلطنت کے بانی

سلطان قلی قطب شاہ کو طبقہ داری کش کش سے قطعاً تعلق نہ تھا، کیونکہ بیدریں اس کا ورد محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہوا تھا جبکہ محمود گاداں اور نظام الملک بھری مرگئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو طبقہ داری کش کش کی آگ ابھی باقی تھی لیکن اس کے اکثر شعلے بجھ گئے تھے محمود گاداں کی اکھاڑا بندی کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اب کسی جماعت بندی کے موقعے باقی نہ تھے چنانچہ جب سلطان قلی بہمنی دربار میں داخل ہوا تو اس کو کسی فرقہ بندی سے سابقہ نہیں پڑا، محمود گاداں کے فریق کی طرح یہ بھی نوازد تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اہل بیدریں نے ۱۱۹۶ھ میں محمود شاہ پرورش کی تھی تو حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی نے بھی بادشاہ کی مدد کی اور اس کی جان بچائی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو نوواردوں کے ساتھ خاص ہمدردی اور اہل ملک کے ساتھ کوئی رقابت نہ تھی۔ برخلاف اس کے سلطان قلی نے اپنے بلند کردار کی وجہ سے ملک اور شاہی محل میں بہت جلد اپنا سنگ بٹھا دیا اور اسی وجہ سے اس کو سلطنت کی بڑی بڑی حدتیں دی جائے لگیں اس کے علاوہ سلطان قلی ۱۱۹۶ھ میں تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تھا جو سلطان محمود شاہ کی عطا تھی برخلاف اس کے نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے ہانی محمد شاہ لشکری کے عہد کے صوبہ دار تھے اور یہ اپنے صوبوں میں ۱۱۹۶ھ میں خود مختار ہو گئے تھے جبکہ سلطان قلی تلنگانے کا صوبہ دار بھی نہیں ہوا تھا، نیز سلطان قلی نے اپنے مربی محمود شاہ کے انتقال کے بعد ۱۱۹۶ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اس زمانے تک نہ صرف یہ سلطنت بہمنی کا صوبہ دار رہا بلکہ اپنے بادشاہ کی ہر طرح مدد کی جو اس کی وفاداری کی دلیل ہے اس طریقے سے تلنگانے کی قطب شاہی سلطنت اور سولھویں صدی کی عام سیاسی رو سے علیحدہ رہی اور اس کا پس منظر وہ نہیں تھا جو نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کا ہے۔

گو لکنڈے کی سلطنت بڑے آب و تاب کے ساتھ قائم کی گئی تھی اس کی تعمیر میں وہ نصب العین شامل تھا جو تمدن سلطنت کے لیے ضروری ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کی تاسیس اور تعمیر ایسے افراد کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جو بڑے تمدن کے حامل تھے اور بڑی خاندانی روایات کے ساتھ تلنگانے میں آئے تھے جب سلطنت قائم ہوئی تو اس کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا گیا جو اس کے جغرافیہ اور حدود کی خصوصیات کے لیے مناسب تھا۔

نے اپنے کو اس سرزمین سے ایسا پیوست کیا کہ دو پشتوں کے بعد یہ بالکل دکنی ہو گئے۔ تلنگی ریلا کو  
 کی روایتیں خود اختیار کر لیں ملک کی رہنمائی کے لیے لائق ارباب بست و کشادہ مامور کیے۔  
 دکن پہنچا یا ملک میں بہترین تمدنی ذخائر جمع کیے۔ شہروں کی تعمیر کر کے اہل تلنگانہ کی تمام  
 بے جگہ جمع کردیں۔ مسجدیں۔ مدرسے۔ خانقاہیں اور کاروان سرا میں بنائی تھیں۔ باغ و عمارات کے  
 ن قدر خدمت کی گئی کہ اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اہل ملک کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا  
 لیا کہ تلنگانہ کے تمام طول و عرض میں ایک روشنی بھیل گئی۔ اسلامی علوم و فنون کے ساتھ اردو  
 طرح خدمت کی گئی کہ گویا یہ ان کی زبان ہے چنانچہ قلوب شاہی و در کو اردو و تلنگی کا سنہری زمانہ  
 ہا پائدار تمدن تھا کہ گولکنڈے کے زوال کے بعد یہ فنا نہیں ہوا اب بھی تلنگانہ کے طول و عرض میں  
 یہ بہتیرے آثار اور نقوش پائے جاتے ہیں۔ تلنگانہ کی معاشرت میں اس کے اجزاء موجود ہیں۔  
 بعد بھی اس سلطنت کے شاعر و ادیب جنوبی دکن یعنی کرناٹک میں اپنی جگہ کر کے مشرق و سخن کی  
 و بہت بڑا ادبی سرمایہ پیدا کیا جس کو قلوب شاہوں کی یادگار سمجھنا چاہیے۔

حضور

سلطنت کی تاریخ

# پہلا باب

## قطب شاہی گھرانہ

آباد اجداد اسلطان قلی قطب شاہ جس کے مبارک ہاتھوں سلطنت گولکنڈہ کی بنیاد پڑی تھی ترکستان کے ایک بہت بڑے قبیلے قراقریو کا رکن تھا۔ گولکنڈہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلے نے ترکستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تھی اور وہاں سے پیش قدمی کر کے یہ قبیلہ مغربی ایران پر قابض ہو گیا تھا۔ قرا یوسف سکندرشانی اور جہاں شاہ جیسی زبردست شخصیتیں اس قبیلے میں پیدا ہوئیں، جو ایران کی طویل القدر حکمران تھیں! اور وسط ایشیا کی تاریخ میں تیمور صاحبقران کے بعد انہیں کا درجہ تھا۔ اس قبیلے نے چنگیز خاں کا پرزور مقابلہ کیا تھا اور اس کی کبھی اطاعت اختیار نہیں کی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ابوسعید خراسانی کے زمانے تک خود مختار رہے۔ قرا یوسف تیمور کا ہم عصر تھا جس نے تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کر کے اپنے اور اپنے قبیلے کی ہستی قائم رکھی تھی۔ ترکستان کا بھی واحد قبیلہ تھا جس کے مقابلے میں تیمور اور اس کے حاشیہ نوں کو ناکامی کی صورت میں ہونے لگا تھا۔ جہاں شاہ نے شاہ رخ مرزا کو بارہا شکستیں دی تھیں جب اس کا انتقال ہوا تو بھی جہاں شاہ تیموری سلطنت کے ایک وسیع حصے پر مسلط ہو کر شاہ رخ تخت و تاج کا مالک ہو گیا تھا۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری ترک قبیلوں کے امیا کا زمانہ ہے اسلام سے وابستہ ہونے کے بعد ان میں تہذیب و تمدن

پیدا ہوئی اور منتشر ہو کر دنیا کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے۔ قبیلہ قراقرم کی ترقی بھی غالباً اسی زمانے میں ہوئی ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے ادائل میں اس قبیلے میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے اور یہ قبیلہ بچکت ہو کر شاہ راہ ترقی پر گامزن ہو گیا اس قبیلے کا سب سے پہلا سردار اغرخاں بن قراخاں بتایا جاتا ہے جس نے سب سے پہلے اس قبیلے کی تعمیر کی تھی۔ اکثر مورخ لکھتے ہیں کہ یہ شخص یافت بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اگرچہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے یہ لوگ ترکستان کے حاکم تھے، لیکن اس قبیلے کی اصل ترقی اغرخاں کے زمانے سے شروع ہوتی ہے جس نے اسلام قبول کر کے قراقرم قبیلے میں روح پھونکی تھی چنانچہ اغرخاں کی وجہ سے یہ لوگ ترکستان کے اکثر اقطاع پر قابض ہو گئے اغرخاں نے ستر سال بادشاہی کی۔ تورہ بیگ ترکستان کا والی ہو گیا تھا۔ یہ ترکستان کا وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب کہ اس ملک پر چنگیز خاں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل تورہ بیگ اس بڑھتی ہوئی آندھی سے گھبرا کر اوراد النہر کی طرف بھاگ گیا۔ مگر جب چنگیز خانی سیلاب سلطان خوارزم پر اُمنڈنے لگا تو تورہ بیگ نے کفار منگول کا مقابلہ ضروری سمجھا اور اپنی بساط کے موافق چنگیز خاں کی مزاحمت کی اور اپنی سلطنت کو بچائے رکھا۔ چنانچہ اسی پُر زور مدافعت کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ کبھی چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حلقہ گروش نہیں ہوئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حملوں سے ہٹ کر یہ معنی لینا کہ یہ مسلط ہو گئے تھے اور ہمدان ان کا مرکز بن گیا تھا۔

قراوسف تورہ بیگ کی چھٹی پشت میں تھا جو اپنی خاندانی سلطنت کا جانشین ہوا۔ یہ وسط ایشیا کے جلیل القدر حکمرانوں میں سے ہے جو تیمور صاحبقران کا ہم عصر تھا جب سندھ بھری میں تیمور کے حملے شروع ہوئے تو اس پہلے پریشی مصیبت آگئی۔ لیکن قراوسف کی عظمت تیمور کی سردار تھی قراوسف نے تیموری حملوں کی پوری مزاحمت کی۔ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو بچائے رکھا بلکہ تیموری بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں اس نے اپنی قوم کی حالت



فراہم کرنی۔ تیمور کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں کے ساتھ متعدد معرکے ہوئے اور قرا یوسف کی تمام تر زندگی اسی جدال و قتال میں گزری۔ ان تیموری سیلابوں کے باوجود حین کے سامنے کسی طاقت کا ٹھیرنا محال تھا، قرا یوسف کی عظیم شان سلطنت قائم تھی جو عراق و عرب کی آخری سرحد سے لیکر آذربائیجان تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۸۲۳ھ ہجری میں اس کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے میرزا دہ سکندر کو جو سکندر ثانی کے نام سے مشہور ہے تخت نشین کیا گیا جہاں شاہ سکندر کا بھائی ہے جب سکندر کو اس کے بیٹے کی قیادت قتل کر دیا تو جہاں شاہ نے اپنی طاقت بڑھائی اور عراق عرب پر قابض ہو گیا، اور جب ۸۴۶ھ ہجری میں شاہ رخ مرزا کا انتقال ہو گیا تو اس کے لیے اور بھی راستے صاف ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت تاج شاہی زبیر سرکر کے اس نے اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دیا اور اس قدر زور سے پیش قدمی شروع کر دی کہ ۸۵۳ھ ہجری میں یہ عراق عرب و عجم کے پورے ملک پر قابض ہو گیا اور اس کے مدد و سلطنت آذربائیجان سے دریائے عمان تک پہنچ گئے۔ ۸۵۹ھ ہجری میں یہ بغداد پر قابض ہوا، اور ۸۶۲ھ ہجری میں شاہ رخ تخت پر بیٹھ گیا۔ قبیلہ قراقرم کی یہ غیر معمولی ترقی تھی۔ جہاں شاہ کو صرف یہ ڈرتھا کہ سکندر ثانی کے بیٹے شاہ زادہ الوند اور کی قیادت اس کی مخالفت کریں گے۔ ان شاہ زادوں کے ساتھ اس نے کوئی دشمنی نہیں کی، بلکہ ان کے ساتھ ایک بزرگ خاندان کی طرح پوری ہمدردی کی۔ کی قیادت کا تو انتقال ہو گیا تھا، مگر الوند اپنے باپ سکندر کا جانشین ہو گیا جہاں شاہ نے نہ صرف اپنا موروثی ملک ہمدان اس کے سپرد کر دیا، بلکہ اس کے ساتھ ازواجی تعلقات بھی پیدا کر لیے۔ الوند کے بیٹے پیر قلی بیگ سے شاہ زادہ یوسف کی بیٹی یعنی اپنی پوتی خدیجہ بیگم کی شادی کر دی۔ ان سے اویس قلی اور اللہ قلی دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان میں سے اویس قلی اپنے باپ پیر قلی کے انتقال کے بعد ہمدان کا والی ہو گیا۔ اویس قلی کی شادی ملک صالح کی بیٹی مریم خاتون سے ہوئی تھی جو اکابر ہمدان سے تھیں۔ ان کے بطن سے گولکنڈہ کا بانی سلطان قلی پیدا ہوا، اس کے نانا ملک صالح نے بچے کے خاندانی روایات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا نام سلطان قلی رکھا تھا جو بعض جگہ محمد قلی بھی لکھا گیا ہے، لیکن یہ صحیح

ہمیں معلوم ہوتا ہے اس سلسلہ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی ترکستان کے ایک بہت ہی معزز اور جلیل القدر حکمران خاندان کا رکن ہے۔ اس کا سلسلہ نسب ایک طرف قرا یوسف اور سکندر ثانی تک پہنچتا ہے تو دوسری طرف یہ اپنی ماں کی طرف سے جہاں شاہ کی اولاد میں ہے اس لیے اس خاندان قطب شاہیہ کو قرا یوسفیہ اور جہاں شاہیہ بھی کہتے ہیں۔ مورخ فرشتہ کے نزدیک یہ سلسلہ نسب زیادہ موثق نہیں ہے، وہ سلطان قلی کو قوم بہارلو سے منسوب کر کے میر علی شیر کو اس کا مورث اعلیٰ تصور کرتا ہے۔

ہر تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان قلی کے دکن آنے کا بہت بڑا سبب خاندان جہاں شاہیہ کی سلطان قلی کا دکن سے تعلق تھا ہی اور قبیلہ آقوخیلو کا ترکستان پر تسلط ہے یہ ترکستان کا دوسرا حریف قبیلہ تھا جو دیار بکر کا حاکم تھا اس قبیلے کے اراکین اور زمینیں قدیم زمانے سے قرا توخیلو قبیلے کے دشمن تھے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں شاہ کا ہم عصر امیر حسن بیگ جو دیار بکر میں خاندان قرا یوسفیہ کی بیگمنی کے درپے تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں شاہ کی غالب طاقت کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلتی تھی۔ ۱۵۶۷ء میں بھری میں جہاں شاہ کا اس قدر طوطی بول رہا تھا کہ سوائے اس امیر حسن بیگ کے ترکستان میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ لیکن جہاں شاہ کی بدقسمتی سے ایک موقع پر امیر حسن بیگ کی آرزو پوری ہو گئی جب جہاں شاہ نے دیار بکر پر حملہ کیا تو حسن بیگ نے ہلمع سازی کر کے صلح کر لی اور مجبوری اطاعت کا اظہار کیا جہاں شاہ نے غلطی سے اس اطاعت پر اعتماد کر کے دشمن سے غفلت کی اور پیش و پشت میں مشغول ہو گیا۔ حسن بیگ کو موقعہ تھا کہ جاتا ہے کہ اس نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر جہاں شاہ پر حملہ کر دیا جس میں ایران کا یہ بڑا تاجدار مارا گیا۔ اس کے بیٹے شاہ زادہ یوسف اور شاہ زادہ محمد گرفتار ہوئے اور تمام سامان شاہی دشمن کے ہاتھ لگا۔ جہاں شاہ کا جس نے ایران میں (۳۵۶) سال حکومت کی تھی اس طرح مارا جانا جہان کے خاندان قرا یوسفیہ کا

۱۔ حدیقۃ السلاطین - ۲۔ فرشتہ ص ۱۶۷۔ لیکن گولکنڈہ کی مستند تاریخوں سے جو خود گولکنڈہ میں لکھی گئیں، اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

۳۔ تاریخیں گولکنڈہ کے حالات کے لیے فرشتے سے زیادہ مستند ہیں۔ فرشتے نے گولکنڈہ کی تاریخ میں بہت غلطیاں کی ہیں۔

خاتمہ تھا۔ آتونیو، جہاں شاہ کی تمام سلطنت پر قابض ہو گئے اور قراویوسفی خاندان کے تمام اراکین کو قتل کرنے لگے۔ ہمدان کے اس چھوٹے سے خاندان کی تباہی آنکھوں کے سامنے تھی اس وقت ہمدان میں چونکہ پیر قلی اپنے باپ کے انتقال کے بعد وارث خاندان تھا، امیر حسن بیگ کی دشمنی کا نشانہ بن گیا۔ قرائن یہ تھے کہ اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا لیکن حالات کچھ موافق ہو گئے۔ اکابر ہمدان کی سفارش سے اس کی جان بچ گئی۔ یوں بھی پیر قلی نہایت خاموش اور خانہ نشین آدمی تھا، اکابر ہمدان نے حسن بیگ کو یہ سمجھایا کہ پیر قلی ایک خانہ نشین اور بے ضرر آدمی ہے اس کو نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں اس سفارش کی بنا پر پیر قلی کو چھوڑ دیا گیا، اور اس طریقے سے ہمدان کے اس قدیم خاندان کی ہستی باقی رہ گئی۔

جب تک حسن بیگ اور اس کا بیٹا خلیل سلطان زندہ رہے اس وقت تک ہمدان کے قراویوسفی خاندان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن جب ان کے انتقال کے بعد امیر یعقوب بادشاہ ہوا تو پورا دن عود کر آئے۔ امیر یعقوب نے رعایا کی چھان بین شروع کی اور ہمدان کا جائزہ لیا۔ اس وقت اویس قلی کا بیٹا سلطان قلی سن شہور کو پہنچ چکا تھا، اور اس میں سیاسی قابلیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے یعقوب کے ہمدردوں نے اسے سمجھایا کہ یہ شخص اپنے باپ اور دادا کی طرح خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ اس میں جہاں شاہی سطوت کے آثار پائے جاتے ہیں اور جب اہل نجوم سے حالات دریافت کیے گئے تو انھوں نے سلطان قلی کا زراچہ کھینچ کر اس کی بادشاہی کی پیشین گوئی کی اس سے امیر یعقوب بہت گھبرایا اور سلطان قلی کو مار ڈالنے کی کوشش کی جب اویس قلی کو یہ خبر لگی تو اس نے اکابر ہمدان سے اس معاملے میں مشورہ کیا ان لوگوں نے یہ رائے دی کہ امیر یعقوب پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اس سے ہمیشہ جان و مال خطرے میں رہینگے، اور بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ سلطان قلی کو قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان بھیجا جائے چنانچہ اس رائے کے مطابق سلطان قلی کو قسطنطنیہ دیکر اس کے چچا اللہ قلی کے ساتھ جس کا نام بعض جگہ علی قلی بھی بتایا جاتا ہے ہندوستان بھیجا گیا۔

قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ سلطان قلی کے ہندوستان آنیکے، یہی اسباب ہونے چاہئیں۔ گو ایک موبخ کا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کے ہندوستان آنیکا مقصد گھوڑوں کی تجارت تھا۔ یہ عراق کے گھوڑے لیکر ہندوستان آئے اور جب ہندوستان میں گھوڑوں کی قدر نہ ہوئی تو یہ بیدار آئے اور یہاں انھوں نے اپنے گھوڑے اچھے داموں فروخت کیے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس تجارت کے لیے وہ دو مرتبہ دکن آئے تھے۔ اگر حقیقت ہے کہ سلطان قلی اور اس کا چچا ہمدان کے رئیس تھے تو ان کے متعلق گھوڑوں کی تجارت کا خیال کرنا کہاں تک قرین عقل ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ عراقی گھوڑے بھی تھے، لیکن یہ کہنا کہ یہ گھوڑے تجارت کے لیے تھے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گولکنڈہ کے لیے آئے تھے۔ اُن کے ہندوستان آنیکا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے، اور وہ ان کے خاندان کا زوال ہے۔ کیونکہ ہمدان کی دنیا ان پر تنگ ہو رہی تھی، اور اس کی تمام تار و پون سے تصدیق ہوتی ہے۔ سلطان قلی دو مرتبہ ہندوستان آیا تھا، اس سے پہلے وہ ایک مرتبہ اور اپنے چچا کے ساتھ آیا تھا، اور اپنے تحفوں کے ساتھ دربار دکن میں باریابی حاصل کی تھی، اور یہاں کے اوضاع و اطوار اور طرز معاشرت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اسی زمانے میں وہ دکن میں متوطن ہو چکا تھا، مگر چچا کی وجہ سے مجبوراً اس کو عراق واپس ہونا پڑا۔ گو یہ بتانا مشکل ہے کہ اس وقت پہلی مرتبہ دکن آنیکی وجہ کیا تھی۔ غالباً ہمدان کا سیاسی پیچ و تاب ان لوگوں کو مجبور کر رہا تھا کہ ہمدان سے باہر ایک دوسری دنیا پیدا کریں۔ راستے میں یہ مسافر نیرود پر سے گذر رہے تھے، یہاں ان کو نیرود کے مشہور بیر طریقت حضرت شاہ نور الدین نعمت اللہ ثانی قدس سرہ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ چونکہ حضرت کی پوری جہاں شاہ مقتول کی بیٹی تھیں اس لیے حضرت کو سلطان قلی سے نزدیک کی قرابت ہوتی تھی حضرت نے اس سفر ہندوستان کے متعلق اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا، اور کہا کہ ہم تم کو جنوب ہندوستان کے اقطاع عنایت کرتے ہیں۔“ اور

جانناز کے نیچے سے چند اثر فیاں نکال کر اس کو دیں اور وعا دیکر رخصت کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی نے شمالی ہند میں کہیں قیام نہیں کیا، بلکہ ترکستان سے کوچ کر کے سیدھا دکن آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران و ترکستان میں لوگ بہمنی سلطنت سے ناواقف نہیں تھے اور جس زمانے میں سلطان قلی دکن آیا تھا، اس وقت محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا، جبکہ دکن میں باہر کے لوگ یعنی ترک اور ایرانی بہ کثرت تھے اور ان کی بہت آد بھگت ہوتی تھی۔ یوں تو فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت سے عجم کے علما و کن آنے لگے تھے، اور خود خواجہ حافظ شیرازی کو بھی دعوت دی گئی تھی لیکن بہمنی سلطنت کے آخری دور میں تو بیدر تمام ممالک عجم کا بڑا زبردست مرجع بن گیا اور ان لوگوں کی آمد و رفت سے دکن اور عجم کے ڈانڈے مل گئے تھے۔ ترکستان اور ایران کے اکثر اقطاع دربار دکن کی شان و شوکت اور اس کی علم نوازی سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں ان نوواردوں کے لیے کوئی کشش نہیں تھی، کیونکہ وہ ان دنوں طوائف الملوک کا شکار بنا ہوا تھا۔ خاندان سادات و لوہی کی کمزوری اور نیمبور کے حملے سے دہلی کی پٹھان سلطنت کے تار و پود اس قدر بکھر گئے تھے کہ یہاں باہر کے نوواردوں کے لیے کچھ نہیں رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں سلطان قلی کی قسمت آزمائی لامحالہ تھی۔ گو بعض تاریخوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان قلی پہلے شمالی ہندوستان میں ٹھیرا، اور جب اس کے ہمت کھن ماحول سے اس کے حوصلے پست ہو گئے تو پھر دکن آیا، اگر یہ صحیح سمجھا جائے تو سلطان قلی کا قیام شمالی ہند میں بہت مختصر ہوگا۔ کیونکہ شمالی ہند کی کساد بازاری اس کو زیادہ دنوں تک نہیں ٹھیرا سکتی تھی۔ اس لیے ہر طرح سے اس کا بیدر آنا صحیح ہے۔ غالباً حکومت کو نوواردوں کی خبر ہو جاتی تھی، اور دربار میں ان کو بلا یا جاتا تھا۔ کچھ اسی

۱۔ تاریخ قطب شاہی ص ۳۲ و ۳۳۔ حلیقۃ العالم ص ۱۱۔

۲۔ تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷۔

۳۔ تذکرۃ الملوک خانی ص ۱۳۴۔ تاریخ قطب شاہی ص ۳۳۔

طریقے سے سلطان قلی اور اس کا چچا سلطان محمود شاہ بہمنی کے دربار میں جس کی اس زمانے میں شہرت تھی، باریاب ہو گئے۔

۱۔ فرشتہ وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ سلطان قلی محمد شاہ ثانی کے عہد میں آیا تھا، چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ محمد شاہ لشکر کو ترک غلاموں کا بہت شوق تھا، اور اس نے بہت سے ترک غلام جمع کر رکھے تھے، اس لیے سلطان قلی بھی ترک غلاموں میں شریک ہو گیا۔ تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷۔ اول تو دوسری تاریخوں سے جیسے تاریخ قطب شاہی، تذکرۃ الملوک خانی، تاریخ قطبہ اور تاریخ ظفرہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے عہد میں آیا تھا، بلکہ فرشتے کے علاوہ تمام تاریخیں بالائے اتفاق واضح کرتی ہیں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے انتقال کے بعد محمود شاہ بہمنی کے عہد میں آیا تھا، چونکہ تاریخ قطب شاہی اور تاریخ قطبہ، گولکنڈہ کے حالات میں فرشتے سے زیادہ مستند ہیں اس لیے محمود شاہ بہمنی کا عہد ہی قابل تسلیم ہوگا، اس کے علاوہ تذکرۃ الملوک میں سلطان قلی اور اس کے چچا کا دوسری مرتبہ آنا ۸۹۲ھ ہجری میں بتایا گیا ہے، جو صریحاً محمود شاہ کا عہد ہے۔ کیونکہ محمد شاہ لشکر کا انتقال ۸۸۷ھ ہجری میں ہو گیا تھا، تذکرۃ الملوک خانی ص ۱۳۵۔ مگر فرشتہ بھی اس کو تسلیم کرتا ہے کہ سلطان قلی کی تمام تر ترقی محمود شاہ کے عہد میں ہوئی ہے، اس لیے اگر ہم تسلیم بھی کریں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے آخری عہد میں آیا تھا تو اس سے زیادہ حرج نہیں ہوتا، کیونکہ بالآخر سلطان قلی اپنی تمام سیاسی زندگی کے اعتبار سے محمود شاہ سے وابستہ ہے، لیکن فرشتے کے یہ الفاظ قابل غور ہیں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے ترک غلاموں میں شریک ہوا تھا، اول تو سلطان قلی کا درود محمد شاہ کے عہد میں ثابت نہیں ہوتا، دوسرے سلطان قلی کا ترک غلاموں کی صفت میں کھڑا ہونا خلاف قیاس اور خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ سلطان قلی ایران کے ایک بہت بڑے حکمران خاندان سے تھا جس کی فہرست میں قرا یوسف، سکند شانی اور جہاں شاہ جیسے جلیل القدر سلاطین پائے جاتے ہیں اگرچہ اس زمانے میں جبکہ سلطان قلی دکن آیا ہے یہ خاندان قرا یوسفیہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا، تاہم ان کی سیاسی عظمت ابھی باقی تھی۔ یہاں ان کا لوہا مانتا تھا، ان کا مال و جاہ و اراضی ابھی باقی تھے چنانچہ جب سلطان محمود نے ان کو قیام دکن کے لیے مجبور کیا تو، اللہ قلی نے اپنے مال و جاہ و اراضی کا عذر کر کے مجبوری ظاہر کی تھی۔ (تذکرۃ الملوک خانی ص ۱۳۴) ان حالات میں

جب یہ دونوں مسافر بہمنی دربار میں وارد ہوئے تو محمود شاہ بہمنی نے ان کی بہت آدابگت کی اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں ہمدان کے شاہی خاندان سے ہیں تو ان کی بہت قدر و منزلت کی گئی۔ اللہ قلی بیگ نے تحفے پیش کیے جن کو بادشاہ نے منظور کیا۔ پسند و نون کے بعد ترکستان سے امیر یعقوب کے انتقال کی خبر آئی، اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لیے اچھا موقع تھا، اور اب یہ اپنی کوشش سے پھر اپنی علمداری قسائم کر سکتے تھے۔ اس لیے اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی، مگر بادشاہ ان دونوں نوواردوں کی قابلیت اور وجاہت سے اس قدر متاثر تھا کہ ان کو بمانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اللہ قلی نے کہا کہ ترکستان میں ہمارے قبائل اور املاک ہیں، ہم ان کو نہیں چھوڑ سکتے، ہمارا دھارنا جانا ضروری ہے۔ بادشاہ اللہ قلی بیگ کے اسرار سے مجبور ہو گیا، مگر یہ کہا کہ... "اللہ قلی بیگ اگر تو میروی منتاری مگر سلطان قلی بیگ را بہیچ وجہ خصمت انصرون نمیدہم! اللہ قلی، بادشاہ کے ان الفاظ سے سہم کر رہ گیا۔ بھیت کی جدائی اس کے لیے حد درجہ دھڑکائی تھی۔ گھر واپس آکر سلطان قلی سے گفتگو کی سلطان قلی پہلے سے ترکستان سے بیزار تھا، اور آؤ نیلو قبیلے کے تسلط سے اس کا دل ٹوٹا ہوا تھا، چنانچہ اپنے پہلے ورود ہی میں یہ دکن کے توطن کا خواہش مند ہو گیا تھا۔ اس دفعہ تو وہ کسی طرح واپس ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ بھیت کے اس رنجان کو دیکھ کر اللہ قلی تنہا جانے پر مجبور ہو گیا۔ حالانکہ یہ جسدائی

---

سلطان قلی کو ایک ترک غلام سمجھنا خلاف واقعہ ہے۔ تمام قطب شاہی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان قلی اور اس کا بچا قیمتی تحفوں کے ساتھ بہمنی دربار میں آئے تھے، اور اگر ان کی حیثیت شاہانہ نہیں تو غلامانہ بھی نہیں تھی۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آدابگت کی جب سلطان قلی اور اس کا بچا پہلی مرتبہ دکن آئے تھے تو ان کے لیے نا قیام وظیفہ مقرر کیا گیا تھا جب یہ دوسری مرتبہ آئے تو ان کو مختلف عنایات سے سرفراز اور ان کو ٹھیرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے پہلے ورود میں اس نے دکن کے توطن کا ارادہ کر لیا تھا مگر چچا کی وجہ سے اس کو واپس ہونا پڑا۔



اس کے لیے بہت دردناک تھی۔ جب دوسرے روز یہ لوگ محمود شاہ کے دربار میں داخل ہوئے تو بادشاہ نے پوچھا  
 اللہ قلی بیگ حکایت دیروزہ چوں شد و بچہ قرار یافت؟ اللہ قلی نے اس کا جواب دیا:-

”امروز بادشاہ دیں پناہ است ع ہر چہ شاہ اشارت کند سعادت است“

اس طرح اللہ قلی کو تمنعے دیکر رخصت کر دیا گیا اور سلطان قلی ہمیشہ کے لیے دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش ہوا، اور اس کو اپنے مقرب درباریوں میں  
 شریک کر لیا، اور سلطان قلی سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ رہنا، اور عراق کا کبھی خیال نہیں کرنا۔ سلطان قلی کی ترقی کا  
 بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی جس کی وجہ سے اس نے دربار دکن میں بہت جلد ہونے حاصل کر لیا، اگر فرشتے کا  
 بیان صحیح سمجھا جائے تو، سلطان قلی کی ترقی اس کی علمی اور سپاہیانہ قابلیت کی بدولت ہوئی۔ اسی مورخ کے بیان کے  
 مطابق سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا، اور بہت خوش خط لکھتا تھا! اسی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ نے اس کو

۱۔ حدیقۃ العالم ص ۱۳۔

۲۔ تاریخ قطب شاہی میں سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ ایک شکار کا واقعہ بتایا گیا ہے چنانچہ اس کا بیان ہے کہ  
 ایک روز بادشاہ شکار کے لیے گیا، اور شکار کی کوشش کی۔ بادشاہ کے تمام درباریوں نے متعدد شکار کیے،  
 لیکن بادشاہ کو کوئی شکار پسند نہیں آیا۔ اتفاق سے سلطان قلی کا شکار بہت اچھا ثابت ہوا، اور بادشاہ کے  
 بہت پسند آیا اس سے خوش ہو کر بادشاہ نے سلطان قلی کو ایک سو پچاس عربی اور ترکی گھوڑے مع ساز و سامان  
 عطا کیے اور خلعت عنایت کی اور اس کے اخراجات کے لیے کدنگل اور اس کے مصارفات دیے گئے اور محمد اس خلعت  
 خطاب سرفراز ہوا (تاریخ قطب شاہی ص ۳۷)۔ لیکن یہ چیز غور طلب ہے کہ شکار کے ایک معمولی اور اتفاقی  
 واقعہ کی بنا پر بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ اس کو غیر معمولی معایات سے سرفراز کیا، بلکہ قیاس کہتا ہے کہ اس کی  
 ترقی کے کچھ اور ہی اسباب ہونے چاہئیں۔



محلات شاہی کا محاسب بنایا۔ اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خدمت کو سلطان قلی نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ شاہی حرم اس کے کام سے بہت خوش تھیں اور اس کی تعریف کرتی تھیں اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اس اثنا میں تلنگانے سے یہ شکایت وصول ہوئی کہ وہاں بعض پرگنات میں چور اور ڈاکو لوٹ مار کر رہے ہیں اور رعایا ادائی مالگزاری میں کوتاہی کر رہی ہے، اگر ان کی خاطر خواہ سرکوبی نہ ہوئی تو ان پرگنوں کی مالگزاری وصول نہ ہوگی۔ بادشاہ نے ان پرگنوں کے لیے دو تین ہزار سوار بھیجنے کی کوشش کی جب سلطان قلی کو یہ قصہ معلوم ہوا تو اس نے بعض اہل حرم سے بادشاہ کے پاس اپنے متعلق سفارش کروائی اور یہ درخواست کی کہ اگر یہ خدمت میرے سپرد کیجاتی ہے تو میں بغیر فوج کے یہ خدمت انجام دیتا ہوں چنانچہ بادشاہ نے یہ درخواست منظور کی اور سلطان قلی اپنے چند متعلقین کو ساتھ لیکر تلنگانے کے پُر آشوب پرگنوں میں پہنچا، اور اکثر زمینداروں کو اپنے ساتھ ہموار کر کے ان پرگنوں کو اور ان کے ساتھ ان اقطاع کو جو اکثر امراء سے متعلق تھے، پُر امن بنادے چوروں اور ڈاکوؤں کی خاطر خواہ سرکوبی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغی زمیندار ادائی مالگزاری کے لیے مجبور ہو گئے، اور یہ درحقیقت سلطان قلی کی بڑی قابلیت تھی کہ اس نے محض اپنے زور بازو سے یہ خدمت انجام دی۔ ایک اجنبی کے لیے جو تلنگانے سے قطعاً ناواقف ہو، زمینداروں کو اپنی سیاسی قابلیت سے ہموار کرنا، اور ان کی مدد سے وہاں اپنی جگہ پیدا کرنا بہت مشکل ہے، اور بہت بڑی قابلیت کی دلیل ہے۔ یہ اس کی آئندہ بادشاہی کا نشان تھا۔ سلطان قلی کی ترقی کا بہرہ لازماً شکار نہیں، بلکہ اس کی علمی، فوجی اور سیاسی قابلیت تھی، چنانچہ فرشتے کے قول کے مطابق اس واقعہ سے اس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں طرح کی قابلیت موجود تھی اس لیے فرامین میں اس کو صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

۱۷۔ فرشتہ اس واقعہ کو محمد شاہی عہد کی طرف منسوب کرتا ہے، لیکن اگر سنہ کی تحقیق کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق محمود شاہ کے عہد سے ہے، کیونکہ سلطان قلی محمد شاہ کے انتقال کے تقریباً چار سال بعد آیا ہے

# دوسرا باب

## سلطنت کا آغاز

۸۹۶ء کے غیر معمولی واقعے سے جبکہ اہل بیدر نے طبقے داری رقابت میں محمود شاہ بہمنی کو قتل کرنا چاہا تھا سلطان قلی کی عظمت و وبالا کردی اہل بیدر نے قلعے پر اچانک دھاوا بول دیا اور قلعے کے چاروں طرف کے راستے بند کر دیے تاکہ باہر سے کوئی مدد نہ آئے اگر اس وقت ترک و ایرانی مدد نہ کرتے تو بادشاہ کا خاتمہ ہو جاتا قلعے کے اندر حسن علی سبزواری اور سید مرزائی شہیدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس سلیہار جواؤں کے موجود تھا، باہر سے امداد آئے تک اس نے حملہ آوروں کو روکے رکھا، اور بادشاہ کی جان بچائی اس سچی وفا شعار سی سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو قطب الملک کا خطاب عطا کیا۔ اس کے تین سال بعد یعنی ۸۹۹ء میں مغربی ساحل پر ایک اور بغاوت کھڑی ہو گئی جو سلطان قلی کے لیے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی اس کی بدولت وہ تمام تلنگانے کے ممالک کا سوبے دار بن گیا۔ مغربی ساحل جس میں گودا وغیرہ شامل تھے، بہادر گیلانی نامی ایک بہمنی امیر کے زیر اقتدار تھا۔ اس سیاسی انتشار کے زمانے میں یہ بھی اور اُمراء نے بہمنی کی طرح کشش ہو گیا۔ اس کی سرکشی سے نہ صرف بہمنی سلطنت کو شکایت پیدا ہوئی، بلکہ گجرات کی سلطنت کو بھی ایک ٹھیس لگ گئی کیونکہ اسی سنہ میں اس نے بنا در گجرات کی متعدد کشتیوں کو جو تجارتی مال سے پر تھیں، لوٹ لیا تھا۔ سلطان محمود والی گجرات نے محمود بہمنی کے دربار میں سفیر بھیجے اور شکایت کی تاکہ اس نقصان کی تلافی ہو۔ دکن کی حکومت یوں بھی اس کا تدارک ضروری سمجھتی تھی، گجرات کی شکایت سے بہادر کی سرکوبی اور بھی ضروری ہو گئی چنانچہ محمود بہمنی نے بذات خود بہادر گیلانی کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ قاسم برید



اس کے ساتھ شریک تھا۔ یوسف عادل خاں، ملک احمد بھری، فتح اللہ عماد الملک وغیرہ نے مقدور پھر فوجوں سے بادشاہ کی مدد کی۔ بہمنی افواج قلعہ جام کھنڈی پہنچیں جو بہادر کے زیر تصرف تھا۔ قطب الملک دکنی کو جو تلنگانے کا گورنر تھا، اسے اس قلعے کی تسخیر کے لیے مقرر کیا گیا، لیکن یہ بہت جلد دشمن کے حملے کا شکار ہو گیا۔ قلعے پر سے جب گیلانیوں نے حملے شروع ہوئے تو یہ ان کی زد میں آ گیا، اور مر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطان قلی کو جس کا خطاب صرف خواص خساں تھا، قطب الملک کا خطاب دیا۔ اس کی جگہ متعین کیا گیا۔ اور یہ ایسا مبارک خطاب تھا جو دو سو سال تک سلطان قلی اور اس کے جانشینوں کا خاندانی لقب ہو گیا، اسی خطاب کی بدولت بعد کو یہ قطب شاہ ہو گئے۔ قلعہ جام کھنڈی کی تسخیر کے بعد منگلیر اور مرج پر قبضہ کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے پیشقدمی کی گئی اور کلہر پر تسلط کیا گیا۔ قلعہ پتالہ میں بہت سی بہمنی فوجیں کام آئیں۔ اس کی تسخیر میں نواب جہاں فخر الملک کے ساتھ سلطان قلی، قطب الملک بھی تھا۔ اس قلعے میں بہادر گیلانی کو زبردست شکست ہوئی، چونکہ نواب جہاں اور قطب الملک نے اس میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا، اس لیے ان کو خطابات دیے گئے اور نوشہرہ دہلی کا اٹھارہ لاکھ روپے نام لے کر ساتھ مخدوم کا لفظ اضافہ کیا گیا، اور بہمنی بادشاہ اس ہم تنہا فریغ ہو کر بیدر آیا تو محمود شاہ بکراتی کو تختے وغیرہ بھیجے اور چونکہ قطب الملک دکنی کے انتقال کی وجہ سے تلنگانے کی صوبہ داری خالی ہو گئی تھی اس لیے قطب الملک سلطان قلی کو ان خدمات کے صلے میں تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا، اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈے اور ورنگل کا اضافہ کیا گیا۔

۱۷۔ تاریخ قطب شاہی میں قلعہ مرج کی تسخیر بھی سلطان قلی کی طرف منسوب کی گئی ہے، چنانچہ اس تاریخ کا بیان ہے کہ اس قلعے پر ایک بہمنی سردار پونہ ناکٹ سلاطین تھا۔ سلطان قلی نے اس کا دودھ و مقابلہ کر کے اس کو زیر کیا، بادشاہ نے اس کا رگزار سی پر اظہار مسرت کر کے قلعے کا تمام مال غنیمت سلطان قلی کو عنایت کر دیا۔ یہ تمام فوجی کارگزاری سلطان کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی اور وہ تمام ممالک تلنگ کا صوبہ دار بن گیا (تاریخ قطب شاہی)۔ تاریخ قطب شاہی کے نفاذ فرشتے کا خیال یہ ہے کہ سلطان قلی کو اسی موقع پر قطب الملک کا خطاب عطا ہوا تھا (تاریخ فرشتہ ص ۲۷۱)۔

سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ خواہ کچھ ہی ہو اس کی متعاقب ترقیوں کا ذمہ دار دکن کا سیاسی انتشار تھا جس سے فائدہ اٹھا کر یہ اور اس کے معاصر امرا، اور سپہ سالار خود مختار سلطنتیں قائم کر رہے تھے۔ انہی حالات میں سلطان قلی نے بھی ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر لی سلطان محمود بہمنی کا عہد حکومت ایک سیاسی انتشار کا زمانہ تھا جو بہمنی سلطنت کے زوال کا باعث ہوا محمود شاہ بہمنی کے باپ محمد شاہ لشکری کے عہد سے بیدر میں غیر ملکیوں کا سامنا بندھ گیا تھا جن میں ترک، مغل، و ایرانی شامل تھے۔ یوں تو تمام سلاطین بہمنی علم و فن کے بڑے قدردان تھے اور جو علما باہر سے آتے تھے ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کے عہد سے حالت دوسری ہو گئی تھی علما کے علاوہ سیاسی لوگ بھی باہر سے آنے لگے اور ان کو مختلف خدمات اور اعزازات دیے جاتے تھے۔ فرشتے کے قول کے مطابق محمد شاہ کو ترک غلاموں کا بہت شوق تھا، اور اس کے شوق کی وجہ سے ترک و مغل کثیر تعداد میں ملک میں بھرنے لگے۔

اخلف حسن بصری محمود گاداں حسن علی سبزواری تو نمایاں شخصیتیں تھیں، لیکن ان کے علاوہ بے شمار ترک و ایرانی بیدر میں جمع ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی تمام سیاست ان کے ہاتھ آگئی، اور یہ لوگ اپنے اثر سے کام لیکر فوجی اور غیر فوجی خدمات اپنے ہاتھ میں رکھتے اور اپنے متعلقین کو دیا کرتے تھے، اور ان کے مقابلے میں دکن کے حقیقی فرزند دکن کے آباد اجداد سلطنت دکن کے معمار تھے، بے دست و پا ہو گئے تھے۔ دربار میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی محمود شاہ کے عہد میں دربار کا رنگ ایسا بدل گیا کہ اس میں صرف اجنبیوں کا جھگڑا ہوتا تھا، اور اس کے برخلاف اہل ملک کی کوئی رسائی نہ تھی یہ کشمکش اور غناہ جنگی کا سامان تھا۔ اہل ملک جن کے ساتھ حبشی بھی شامل تھے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے سرپٹ میدان میں آگئے اور کشمکش کا بازار گرم ہو گیا یہ کشمکش محمد شاہ کے عہد سے یا زیادہ صحت کے ساتھ کہا جاسکے تو علاء الدین ثانی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی خلف حسن بصری اور محمود گاداں اسی فرقہ دارانہ رقابت کے شکار ہوئے اور محمود شاہ کے عہد میں جب اس رقابت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اہل ملک نے ۸۹۶ھ ہجری میں خود بادشاہ کاغذ تیاری شروع کر دی قلعے کے تمام رکھوالوں کو اپنے ساتھ ہموار کر کے قلعے پر دھاوا بول دیا، اور حالات اس قدر تباہ ہو گئے تھے کہ بادشاہ کی جان کے لالے پڑ گئے۔ صرف ترک اور ایرانیوں کی مدد سے فساد فرو ہوا اور جب بادشاہ

جان بچگئی تو اس نے اہل ملک کو سخت مزاد دی یغلوں اور ترکوں کو شکم دیا کہ دھنیوں اور حبشیوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کو قتل کریں اور ان کا مال لوٹ لیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو تین روز تک شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا چند بزرگوں کی شفاعت سے ان کو معاف کیا گیا۔

اس واقعہ سے حکومت کو سبق لینا چاہیے تھا۔ ترک و ایرانی بادشاہ کی ضرورت دہکرتے تھے لیکن وہ ملک کے حقیقی ہمدرد نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے سلطنت کو خیر یا دکھ دیا، اس طریقے سے سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ کیونکہ اول تو دکنی اور حبشی اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ ان میں ابھرنے کی سکت نہ تھی۔ دوسرے انھوں نے اپنی بے قدی کس پر سی سے مایوس ہو کر سلطنت کی مدد چھوڑ دی۔ محمود شاہ نے باہر والوں پر بھروسہ کیا، اور ان لوگوں نے اس کو مجبور کر کے جگہ جگہ اپنی خود مختار سلطنتیں قائم کر لیں۔ فرشتے کے الفاظ میں قاسم برید نے محمود شاہ کو اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ اس کو بغیر اجازت پانی بھی میسر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مرکزی حکومت پر قاسم برید کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا، امیر برید قابض ہو گیا، اور شاہی خاندان کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا۔ سلطنت کے ارد گرد بیرونی صوبوں پر دوسرے امراء اور صوبہ دار قابض ہو گئے اور اس طریقے سے دسویں صدی بھری کے اٹل، پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ بیجا پور، احمد نگر اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہو گئی۔

سلطنت گولکنڈہ کی تاسیس بھی اسی سیاسی انتشار میں ہوئی تھی جو ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اگرچہ دسویں صدی بھری کے اٹل میں بہمنیوں کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو گئی کہ اس کے تمام صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن نویں صدی بھری کے اواخر تک ہی سلطنت کا سیاسی شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ چنانچہ ۱۶۸۹ء میں احمد نگر، بیجا پور اور برار کے بانیوں نے بالائے اتفاق سلطان محمود کا زام خطبے سے خارج کر کے اپنے نام داخل کر دیے اور پانچ نویت بجا آئے، اور یہ خود مختاری کا اعلان تھا۔ اسی طرح سلطان قلی قطب کو بھی تلنگانے میں جہاں وہ

۱۷۰۶ء تا ۱۷۱۲ء کے ساتھ پانچ نویت بجا آئے اور پھر خود مختاری کا اعلان بھاجا تا بہمنی سلطنت کے زمانے میں شاہی محلات میں

صوبہ دار تیار اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کے مواقع حاصل تھے احمد نگر بیجا پور، اور برار کے شمالی صوبوں کے مقابلے میں تلنگانے کا جنوب مشرقی صوبہ اپنے قدرتی اور جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر ایک جداگانہ سلطنت بننے کے قابل تھا۔ اور یہ علاقہ مرکزی حکومت سے اس قدر دور تھا کہ کسی گرفت میں نہیں آسکتا تھا لیکن سلطان قلی نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح ان حالات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطان قلی کی خود مختاری بہت بعد کو عمل میں آئی اور تو یہ کہ جس زمانے میں احمد نظام شاہ اور یوسف عادل شاہ نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا، سلطان قلی تلنگانے کا صوبہ دار ہی نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ بہادر گیلانی کے خاتمے کے بعد <sup>۱۱۹۶ھ</sup> ۱۱۹۶ء میں مالک تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا تھا اس وقت اس کی خود مختاری ناممکنات سے تھی۔ لیکن صوبہ دار ہونے کے بعد بھی اس نے فوراً اعلان خود مختاری نہیں کیا۔ تلنگانے میں اس کے صوبہ دار ہونے کے بعد اس نے کافی طاقت فراہم کر لی تھی گولکندے میں آنے کے بعد اس نے بیجا نگر سے مقابلہ کر کے اپنے ہاتھ پر خاطر خواہ مضبوط کر لیے تھے لیکن اس کے باوجود سلطان قلی کا جذبہ وفاداری اور حق پرستی اس کو اعلان خود مختاری کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ مرکزی حکومت اس قدر کمزور تھی کہ اس کو کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔ شمال کے تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے، اور سلطان قلی کو اس سے خاطر خواہ ترغیب ہوتی تھی، نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمال کے سلاطین احمد نگر و بیجا پور نے اس کو خود مختاری کے لیے بہت ابھارا لیکن سلطان قلی اپنے جذبہ وفاداری سے مجبور تھا اس کی وفاداری اس واقعہ سے زیادہ واضح ہوتی ہے کہ جب سلطان محمود گیلانی نے والی بیجا پور یوسف عادل خاں پر حملہ کر دیا تو سلطان قلی بادشاہ کے مطالبے پر فوراً چلا آیا، اور بادشاہ کی مدد کی حالانکہ اس حملے کا سبب یہ تھا کہ یوسف نے بیجا پور میں شیعہ مذہب کی ترویج کی تھی اور بادشاہ اس کی ترویج کو دکن کی پرانی روایت کے منافی سمجھتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ سلطان قلی خود شیعہ مذہب کا پیرو تھا، اور مذہباً اس کو

دن میں پانچ دفعہ نوبت پڑتی تھی، اور یہ شاہی امتیاز تھا۔

بادشاہ کی مدد نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے وفاداری اور فرض شناسی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اس کے علاوہ جب سلطان محمود پرید یوں کی خود غرضی کی وجہ سے اس قدر عرصہ روزگار تنگ ہو گیا کہ اس کی روزمرہ ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں تو سلطان قلی اس کو خفیہ طور پر گولکنڈہ سے پانچ ہزار ہون بھیجا کرتا تھا اور جب تک سلطان محمود زندہ رہا ہے، غالباً یہ ہون ہر مہینے برابر بھیجے گئے۔ بات یہ ہے کہ فرشتہ سلطان قلی کی علی خود مختاری سے یہ نتیجہ نکالتا ہے۔ تب سے وہ تلنگانے کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور یہاں بلا شرکت غیرت حکومت کرتا تھا۔ سلطان قلی کی علی خود مختاری میں تو کوئی شبہ نہیں، کیونکہ نویں صدی کے اواخر میں بہمنی سلطنت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اس کے صوبہ دار اس کے ہاتھ سے ٹک چکے تھے لیکن اس کی وفاداری کے اور واقعات کے ساتھ جو خود فرشتہ بیان کرتا ہے خود مختاری کا اعلان ایک بے بڑسی بات ہوگی۔ اگر اس کا اعلان خود مختاری صحیح بھی ہے تو اس کے ہم عصر سلاطین بیجاپور اور احمد نگر کے مقابلے میں بہت دیر میں یعنی تقریباً بیس بائیس سال کے بعد ہوا ہے، اور یہ خود اس کی وفا شناسی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لیکن گولکنڈہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی نے اعلان خود مختاری ہی اپنے مرنے والے سلطان محمود بہمنی کی زندگی میں نہیں، بلکہ اس کے انتقال کے بعد کیا تھا۔ تاریخ قطب شاہی کا مولف سلطان محمود بہمنی کا انتقال ۹۱۱ھ بھری میں بتاتا ہے اگر یہ سنہ صحیح ہے تو فرشتے کے بیان کے مطابق سلطان قلی کا اعلان خود مختاری سلطان محمود کے انتقال کے چھ سال بعد یعنی ۹۱۵ھ بھری میں ہوا ہوگا۔ لیکن تاریخ قنابیت میں سلطان محمود کا سنہ انتقال ۹۲۲ھ ہے جو عام طور پر مشہور ہے۔ اور تاریخ قطب شاہی کے مطابق یہی سنہ سلطان قلی کے اعلان خود مختاری کا سمجھنا چاہیے۔

۱۔ تاریخ فرشتہ ص ۳۷۳۔ فرشتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی نے ۹۱۵ھ میں خطبے سے سلطان محمود کا نام خارج کر کے اپنا نام داخل کر دیا۔ اور قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے پانچ فوجیت بجوائے۔ لیکن گولکنڈہ کی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

۲۔ تاریخ قطب شاہی ص ۵۔ سنہ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۲۱۔



چونکہ تاریخ قطب شاہی سے اخوذ معلوم ہوتی ہے اس لیے سنہ کے بارے میں اس کا اختلاف کرنا واقعات ثابت کرنے کے لیے زیادہ مستند ہے۔ تذکرۃ الملوک خانی نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ دوسرے اُمراء دکن خود مختار ہو گئے تھے لیکن سلطان قلی اپنی وفاداری پر قائم رہا۔ اس کے علاوہ سلطان قلی نے اپنے مفوضہ پرگنات پر جو اس کی صوبہ داری میں دیے گئے تھے قناعت کی، اور شاہی علاقوں پر کبھی دست درازی نہیں کی۔ حالانکہ دوسرے سلاطین دکن نے کئی شاہی علاقے ہضم کر لیے تھے اور خود سلطان قلی کو ترعیب دی تھی کہ قریب تر علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی مملکت کی توسیع کرے، اور اس معاملے میں مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن سلطان قلی اس حرکت کو سخت بے وفائی خیال کرتا تھا کہ اگر مملکت کی توسیع مقصود ہے تو یہ کام غیر مقبوضہ علاقوں میں جو ابھی تک سلطنت بہمنی کے تسلط میں نہیں آئے ہیں، ہونا چاہیے۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے تاریخ مرغوب القلوب سے خود سلطان قلی کے الفاظ نقل کیے ہیں جن سے اس کی وفاداری ثابت ہوتی ہے:-

”من خود اندیشہ می کردم کہ مملکت سلطان را بے رضائے او قابض و متصرف گشتن  
 بہنایت نکتہ جرمی است عافیت رائے صواب نمائے ما برآں قرار یافت کہ ایں ولایت کہ  
 تو داری سرحد مملکت ملنگانہ ولایت کفار است بہ ہمیں پرگنات کہ سلطان بہ رضا و رغبت  
 بہ تو دادہ تانخ شوی و شروع در تسخیر ولایت کفار نمائی کہ اگر بادشاہ حقیقی مل و جلالت  
 خواستہ باشد کہ ترا مملکت و سلطنت و ہر درغزا و جہاد کا فراں مظفر و منصور خواہد ساخت  
 بنا بریں اصلاچوں اُمراء و دیگر محل در مملکت مورو فی سلطان نکر دم و شروع در جہاد  
 کفار نمودہ بہ تسخیر مالک آہنا پرداختم“

نیز مسجد سفا کا کتبہ سلطان قلی کی وفا شعار کی کو پوری طور سے ثابت کرتا ہے۔ یہ مسجد ۹۲۲ھ میں یعنی جس سال محمود شاہ کا

انتقال ہوا تھا، تعمیر ہوئی تھی۔ غالباً یہ گولکنڈہ کی پہلی مسجد ہے۔ اس کے کتبے میں سلطان قلی نے اپنے نام کی جگہ سلطان محمد غوری کا نام درج کیا تھا چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

”بناء ہذا المسجد الجامع فی زمان السلطان الاعظم المتوکل علی اللہ البہمنی ابی الغازی محمود شاہ  
ابن محمد البہمنی“

اگرچہ ۹۰۱ھ سے جبکہ سلطان قلی تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا تھا، اس نے تلنگانے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا اس نے اوائل ہی سے گولکنڈہ کو اپنا مستقر قرار دیا تھا۔ قطب شاہی تاریخوں سے مترشح ہوتا ہے کہ صوبہ داری کے زمانے میں گولکنڈہ اس کا مستقر نہیں تھا، بلکہ اس کی قیام گاہ گولکنڈہ سے فاصلے پر کسی اور جگہ تھی جس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے وہ اس وقت پائے تخت قرار دیا گیا ہے جبکہ سلطان قلی نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔ کیونکہ تمام مومنین بالاتفاق واضح کرتے ہیں کہ سلطان قلی نے قلعے اور شہر کی تعمیر سے فارغ ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اعلان خود مختاری ۹۲۴ھ میں ہوا ہے۔ نتائج قطعی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قلعے اور شہر کی تعمیر اس وقت ہوئی ہے جبکہ وہ تلنگانے کی بعض فتوحات سے فارغ ہو چکا تھا اور اس کی فتوحات کے چرچے سنکر بے شمار لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے، اور ان کی سکونت کے لیے ایک شہر کی ضرورت داعی ہوئی۔ قلعے اور شہر کی تعمیر کا اصلی محرک دیبا گلی کی ہمسایہ سلطنت کے حلوں کا ڈر تھا، اور ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے دیبا گلی پر آسانی سے حملے ہو سکیں اور جب فوجیں جنوب سے واپس آئیں تو ان کو قریب ہی قیام و آرام کا موقع مل سکے! اس لیے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ گو یہ تلنگانے کا مرکز ثقل نہیں ہے، لیکن جزائی اعتبار سے یہ ایسا موقع تھا کہ اس کے ذریعے سے ایک طرف بریدی اور عادل شاہی مغربی طاقتوں کا مقابلہ ہو سکتا تھا، اور دوسری طرف جنوبی سلطنت دیبا گلی کی روک تھام ممکن تھی۔ گولکنڈہ اور اس کے قلعے کا وجود پہلے سے پایا جاتا ہے، اس کو قدیم زمانے میں مانگل کہتے تھے، ممکن ہے کہ یہ قدیم سلطنت چالوکیہ کا ایک صوبہ رہا ہو۔

۱۔ گولکنڈہ کے ایک کتبے میں جو نواب نیکام خاں کی قبر پر نصب کیا گیا ہے اس مقام کو ”منگلوارم“ لکھا گیا ہے۔

جب سلطنت چالوکیہ کا خاتمہ ہو گیا، اور اس کی جگہ دکن میں منتشر راجدھانیاں قائم ہوئیں تو گولکنڈہ یا مانگل میں بھی ایک راجدھانی قائم ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام تاریخوں میں یہاں کے ایک راجہ کا نام دیورائے بتایا جاتا ہے لیکن قریب قریب یہ ہے کہ گولکنڈہ سلطنت ورنگل کا مشرقی صوبہ ہو گا، اور دیورائے اصل میں ورنگل کا راجہ ہے جس کے بزرگوں نے گولکنڈہ کا قلعہ بنایا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی دیواریں مٹی کی تھیں۔ یہی سلطنت کی توسیع کے ساتھ جب ورنگل ملک قبضہ ہو گیا تو گولکنڈہ اس سلطنت میں ضم ہو گیا۔ محمد شاہ اول بہمنی کے عہد میں (۱۳۵۸ء تا ۱۳۷۷ء) ورنگل کے راجہ نے گولکنڈہ کا قلعہ بہمنی سلطنت کے سپرد کر دیا۔ اس زمانے سے یہ سلطنت بہمنی کا بہت اہم قلعہ سمجھا جاتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس قلعے کے ذریعے سے تمام مشرقی حدود کی حفاظت اور مشرق میں فوجی نقل و حرکت ہوتی تھی جس وقت سلطان محمود بہمنی نے سلطان قلی قطب کو تلنگانے کا صوبہ دار بنایا تو اس صوبہ داری کے ساتھ گولکنڈہ اس کی جاگیر میں دیا گیا تھا جس سال سلطان محمود بہمنی کا انتقال ہوا اسی سال ۹۲۷ھ میں سلطان قلی قطب نے گولکنڈہ کو محمد نگر سے موسوم کر کے اپنا پایہ تخت بنوا دیا، اور اس کو آباد و مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ گولکنڈہ کی پہاڑی پر قلعے کا ضروری استحکام پہلے سے موجود تھا اور پچھلے راجگان اس کو قلعے کے طور پر استعمال کرتے تھے، مگر سلطان قلی قطب نے اس کو اپنے اغراض و مقاصد کے مطابق کافی مضبوط کر لیا، اور قلعے سے باہر ایک مستحکم فصیل بنا کر شہر گولکنڈہ کی بنا ڈالی۔ اگر قلعے کی بنیاد قطب شاہی نہیں ہے تو شہر کا قطب شاہی ہونا یقینی ہے جو اس کے آثار قدیمہ سے ظاہر ہے۔ فصیل کے اندر ضروری عمارتیں بنائی گئیں، کچھ محل تعمیر ہوئے اور ایک جامع مسجد بنائی گئی جو اپنے حمام اور دیگر ضروریات سے مزین تھی۔ مسافروں کے لیے مسافر خانوں کا انتظام تھا۔ ان تعمیرات سے شہر کی رونق اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہاں باہر سے ہزاروں آدمی آکر بسنے لگے۔ چنانچہ قطب شاہی تاریخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند روز میں یہ شہر رشک بردار و غیرت افزائے سائے بلاد و معائنہ ہو گیا۔

**فتوحات** | تلنگانے کا بہمنی صوبہ جو سلطان قلی کے تفویض کیا گیا تھا وہ اپنے طول و عرض میں بہت مختص

مغرب میں اس کے حدود گولکنڈہ کے قرب و جوار سے شروع ہوتے تھے اور مشرق میں یہ ورنگل سے آگے نہیں تھے کیونکہ ورنگل سے آگے مشرق میں جواقطاع قطب شاہی سلطنت میں شامل ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جو خود سلطان قلی قطب شاہ نے فتح کیے تھے۔ فی نفسہ تلنگانہ جس کا قدیم نام آندھرا ہے جنوبی ہند کا ایک وسیع خطہ ہے جو اپنے طول و عرض، جغرافیائی خصوصیات اور قدیم تاریخ کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا اصلی پھیلاؤ شمال سے جنوب کی طرف ساحل کار و منڈل کے برابر چلا گیا ہے۔ اس کے شمال میں چاندا، اورا وڑیسیہ کا وہ حصہ شامل ہے جو ضلع سکاکول سے ملحق ہے۔ مغرب میں محمد آباد (بیدر) اور جنوب میں کرناٹک واقع ہیں۔ جس وقت سلطان قلی اس تلنگانے کا صوبہ دار ہوا ہے اس کے تمام مشرقی اقطاع ورنگل سے مچلی پٹم تک ہند و راجگان کے زیرِ تصرف تھے اور جنوبی حصہ تامر و بیجانگر کے زیرِ نگین تھا لیکن اقتضائے حال اس ملک کی ترقی کا خواہاں تھا، اور ضرورت اس بات کی تھی کہ یہاں مغرب سے مشرق تک منتشر راجدھانیوں کو توڑ کر ایک مجموعی حکومت قائم کی جائے۔ اس کے علاوہ گولکنڈہ کی روز افزوں سلطنت جس کی رہنمائی اب سلطان قلی قطب شاہ کے ہاتھ میں آگئی تھی اپنی محدود چار دیواری میں بند نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ اس کو اپنے قدرتی حدود تک پہنچنا ضروری تھا نیز سلطان قلی قطب شاہ ہندوستان کا بڑا سیاسی مدبر تھا۔ صوبہ داری کے دوران میں (تقریباً ۲۴ کا زمانہ ہے) اس نے تنجیر ملک کی بہت زیادہ کوشش نہیں کی بلکہ صرف مفوضہ علاقوں کا خوش اسلوبی سے انتظام کیا، اور اپنے صوبے میں ان قائم رکھا۔ اس زمانے میں غالباً بیجانگر کے مقابلے اور دربار مید کی سیاسی الجھنیں اس کو روکتی تھیں صوبہ داری کے زمانے میں اس کو سلطان بہمنی کی تائید میں یوسف عادل خاں پر حملہ کرنا پڑا، اور دستور دینار کی سرکوبی کے لیے بادشاہ کا ساتھ دینا ممکن ہے کہ یہ اسباب اس کو مشرق میں پیش قدمی کرنے سے روکتے ہوں لیکن ۱۵۱۸ء میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد جب وہ خود مختار ہو گیا تو اس نے قلعہ گولکنڈہ کی تعمیر کر کے اس کو مستحکم کر لیا۔ اور جب اس طرح اس کے

۱۔ دستور دینار بہمنی گولکنڈہ کا گورنر تھا محمود شاہ کے ہند میں اس نے مرکزی حکومت کے قیام کا ارادہ کیا تھا۔

X کل دہرے مضبوط ہو گئے تو مشرقی تلنگانے کے مختلف قلعوں پر وار کرنے شروع کر دیے جن قلعوں پر اس نے حملے کیے تھے ان میں سب سے پہلے راج کٹک کا نام آتا ہے، اس کے محاصرے میں سلطان قلی کے اکثر سیاسی عہدہ دار کام آئے، لیکن بالآخر یہ مسخر ہو گیا، اور یہاں کا والی ویکٹی ناک گرفتار ہو گیا، اور اس کے بعد دیورکنڈے کے مضبوط قلعے کی تسخیر ہو گئی، لیکن اس تسخیر سے ویجیانگر کی بلائے بے درماں سر پر آگئی۔ کیشن رائے نے جو ویجیانگر کا راجہ تھا سلطان قلی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے تلنگانے کے جنوب مشرقی حدود پر حملہ کر دیا، سلطان قلی کے لیے اس کی مزاحمت آسان نہ تھی لیکن سلطان قلی کی پختہ کاری سے قلب شاہی فوج کامیاب ہو گئی اور ویجیانگر کی فوج بھاگ گئی۔ اس سے فارغ ہو کر جنوبی قلعے پانگل پر حملہ کیا گیا جو دریائے کرشنا کے قریب واقع ہے۔ ویجیانگر کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اس پر قبضہ کرنا ضروری تھا، بڑے معرکے کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا۔ اور گھنپور جو پانگل اور کوئلکنڈے کے درمیان واقع ہے بہت توجہ کا محتاج تھا۔ پانگل سے گھنپور کی طرف فوجیں بڑھیں اور اس کو مسخر کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کوئلکنڈہ بھی فتح ہوا جو جنوب میں کرشنا اور تنگبھدرا کی وادیوں پہتا بورکنے کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ یہ دونوں قلعے قریب قریب واقع ہیں۔ ان فتوحات سے فارغ ہو کر سلطان قلی، گولکنڈہ واپس ہوا۔ لیکن چند سال کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کھم میٹ کا راجہ قلب شاہی حدود پر دست درازی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں سلطان قلی نے خود پیش قدمی کی۔ چونکہ کھم کی فوجی طاقت باقی تھی اس لیے قلب شاہی فوج سے بڑا معرکہ ہوا۔ بالآخر کھم میٹ کی منہزم طاقت شمالی تلنگانے کی طاقتوں سے متحد ہو گئی اور سلطان قلی کے مقابلے میں آمادہ پیکار ہو گئی۔ جو راجے لڑنے کے لیے متحد ہوئے تھے ان کے نام اکجارام۔ راجندر۔ سری چند بتائے جاتے ہیں۔ ان کی متحدہ فوج تقریباً تین لاکھ پیدل اور تین ہزار سواروں مشتمل تھی۔ مقابلہ آسان نہ تھا۔ سلطان قلی بڑھتا ہوا دریائے گولکنڈہ کے کنارے پہنچ گیا، اور اس زور سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایک بڑے علاقے پر قبضہ ہو گیا، بہت سا مال غنیمت ملا۔ اور شمالی طاقتوں سے صلح ہو گئی لیکن جب سلطان قلی گولکنڈہ واپس ہوا تو کیشن رائے نے قلب شاہی حدود میں دست درازی شروع کر دی اس کے ساتھ مقابلے ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کھم کٹہ اور کوٹبیر کے بڑے قلعے

مسخر ہو گئے۔ آخر میں تلگنڈہ کی لڑائی قابل ذکر اور دلچسپ ہے جو یہاں کے راجہ ہری چند سے ہوئی تھی۔ اس قلعے کا سخت محاصرہ ہوا، اور بڑی کوشش کے بعد یہ فتح ہوا اس طرح تقریباً تیس سال کے دوران میں سلطان قلی نے ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کیے اور سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی ٹیم تک پہنچا دیا، اور گولکنڈہ کو ایک بہت ہی با عظمت سلطنت کی صورت میں منتقل کر دیا اس کے متعلق خود اس کے الفاظ یہ ہیں :-

”اُمّال قریب شصت سال باشند کہ شب و روز با کافراں غزا نمودہ یہ توفیق و تائید  
ادبجائے از سرحد ورنگل تا بندر مچھلی ٹیم و راج بندری قریب شصت و ہفتاد قلعہ و حصار  
رنج و محکم مثل قلعہ کوئل کنڈہ۔ دیور کنڈہ و پانگل وغیرہ یہ ضرب شمشیر آیدار و تھون  
اولیائے دولت ابد پیوند در آوردم۔“

۹۵۰ھ تا ۹۵۳ھ آخر جمادی الاول میں دکن کے اس حلیل القدر حکمران کا انتقال ہوا۔ اس کی موت کا باعث اس کا بیٹا جمشید قلی تھا انتقال کے بعد یہ لنگر حوض فیض اثر میں سپرد خاک کیا گیا جہاں اس کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ ۹۵۰ھ تک سلطان قلی قطب شاہ نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی مینغلان کے ابتدائی چوبیس سال اس کی صوبہ داری کے ہیں اور باقی خود مختاری اور بادشاہی کے اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی اس میں شامل کریں جیسے کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں بیدر آیا تھا تو اس طریقے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال دکن کی سیاسی خدمت کی تھی جو خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے کیونکہ اس ابتدائی دور میں بھی اس نے تلنگانے کے سرکشوں کی سرکوبی کی تھی اور اسی زمانے سے یہ اس خطہ ملک کی سیاست سے وابستہ رہا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس پچاس یا ساٹھ سال کی مدت میں سلطان قلی قطب شاہ نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتے میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی

مارچ گولڈ

لکھنے کی بہت بڑی خدمت تھی کہ اس کی  
ات سے پہلے یہاں مختلف وحدتیں اور  
تھا، اور اس سے جو نقصان پہنچ رہا تھا وہ  
لم و فسق کے زیور سے سنوارے۔

---



سلطان جمشید قلی قطب شاہ



# تیسرا باب

## عہد انتشار

سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال جو تقریباً ساٹھ سالہ عہد حکومت کے بعد ننانوے سال کی عمر میں ہوا تھا کسی طرح بے وقت نہیں کہا جاسکتا۔ نیز گولکنڈے کی نوخیز سلطنت مستحکم ہو چکی تھی اور اس کے حدود مشرق میں مہلی ٹیم تک پہنچ گئے تھے لیکن یہ انتقال ایسے وقت میں ہوا ہے جبکہ سلطان کے متعدد بیٹے دعویٰ دار سلطنت تھے اور غارتگری کا پہلے سے سامان ہو چکا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ کے چھ بیٹے تھے، فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لیے نامزد تھا اور جس کی قابلیت کے ساتھ سلطنت اور واپی سلطنت کی تمام امیدیں وابستہ تھیں، باپ کی زندگی میں مرجکا تھا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے مجبوراً حیدر قلی کے دوسرے بھائی قطب الدین کو ولیعہد دی کے لیے نامزد کر دیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین میں کچھ منچلا پن اور سلطنت کا خاطر خواہ جذبہ نہیں تھا جو سلطنت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کے دوسرے بھائی حمید قلی عہد الکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے اور یہ تینوں باپ کی زندگی سے سلطنت کے مدعی اور اپنے بھائی قطب الدین کا خاتمہ کر کے سلطنت پر مسلط ہونا چاہتے تھے۔ چھٹا اور سب سے چھوٹا بیٹا ابراہیم قلی تھا جو سب سے زیادہ لائق تھا۔ اس کے بلند کردار اور قابلیت کی وجہ سے سلطان قلی نے اس کو سلطنت کے مختلف

---

لئے تاریخ قطب شاہی فرشتہ سلطان قلی کے صرف تین بیٹے بتاتا ہے حمید قلی حیدر قلی اور ابراہیم جو صحیح نہیں ہے۔

کاروبار سپرد کر رکھے تھے چنانچہ سلطان قلی کے انتقال کے وقت یہ دیورکنڈے میں تھا۔ عبدالکریم نے باپ کے خلاف اٹھلی بغاوت کردی اور ملک سے باہر جا کر گولکنڈے کے خلاف بڑا فساد برپا کر دیا یعنی بہت حد درجہ سلطنت میں اس کی ایک نہیں چلی تو بیجا پور جا کر باغیانہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تمام کوششیں بارور نہیں ہوئیں اور بالآخر بیجا پور کے علاقے میں مر گیا اور اس کے ہمیشہ قلی اور دولت قلی کی بھی بدتمیزی حکومت کو معلوم ہو گئی۔ غالباً دولت قلی سے ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوئی تھیں کہ لوگ اس کو دیوانہ ملک زادہ کہتے تھے اس منحدرش رویہ کی وجہ سے سلطان قلی قطب شاہ نے ان دونوں کو مختلف قلعوں میں قید کر دیا تھا تاکہ آپس میں میل جول ہونے نہ پائے، اور یہ قطب الدین پروار کر کے ملک میں فتنہ و فساد برپا نہ کریں۔ جمشید گولکنڈے کے قلعے میں اور دولت قلی بھونگیر کے قلعے میں مقید تھے چونکہ دولت قلی مرکزی حکومت سے بہت دور تھا اس لیے وہ بے بس تھا، پتا پتہ وہ کسی سازش میں حصہ نہیں لے سکا اور بھونگیر کے قلعے میں عمر بھر قید رہا اور قید ہی میں مرا لیکن جمشید قلی کا خود قلعے گولکنڈہ میں مقید ہونا اس کے لیے بہت مقید ثابت ہوا اس نے قید میں سے سازش کا جال پھیلا دیا اس وقت اس کو اپنے بھائی قطب الدین سے زیادہ ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قطب الدین جیسے کمزور آدمی کو راستے سے ہٹانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ اس کے باپ کی طرف سے تھی جو قطب الدین کی طرف مائل تھا۔ جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر سلطان قلی طبعی موت سے مرے تو قطب الدین کے لیے راستہ صاف ہو جائیگا ممکن ہے کہ زندگی میں وہ قطب الدین کا اپنا جانشین بنا دے اس لیے سب سے پہلے جمشید نے خود باپ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کو اس کام کے لیے مقرر کیا، اس شخص نے موقع پا کر جبکہ سلطان قلی مسجد صفائی میں نماز پڑھ رہے تھے حملہ کر کے قتل کر دیا۔ اس وقت یہ مسجد صفائی یا جامع مسجد جو خود سلطان قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی ہے زیر تعمیر تھی۔ یعنی اس کے بعض حصے تعمیر کیے جا رہے تھے کہا جاتا ہے کہ سلطان اس وقت معماروں کو فروری ہدایات دیکر نماز میں مشغول

ہونے تھے کہ محمد و ہمدانی کے محلے کا شکا ہو گئے۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے تمام گل و پتے۔ سے اپنے ہاتھ میں کر لیے۔ چونکہ قطب الدین ایک خاموش آدمی تھا اور اس کے پیستہ حوصلوں کی وجہ سے اس کے کوئی ہمدرد بھی نہ تھے اس لیے اس موقع پر قطب الدین اور اس کے جیسے ہمدردوں کی طرف سے کوئی جھنجھٹ نہ ہوئی۔ جمشید کے آدمیوں نے فوراً اس کے گھر پر دھاوا بول دیا اور اس کے گھر میں گھس کر اس بے گناہ اور بد قسمت و بیہودہ سلطنت کو اندھا کر دیا۔<sup>۱۷۳</sup>

۱۷۳۴ء میں جمشید قطب شاہ جس کا اصل نام یار قلی جمشید خاں تھا گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا اور <sup>۱۷۳۴ء</sup> ۱۷۳۴ء کے ساتھ ساتھ اس نے حکومت کی۔ گولکنڈہ کی دو سو سال کی زرین تاریخ میں یہ سوائے سالہ عہد حکومت کچھ ایسا کریہ منظر پیش کرتا ہے گویا اس پوری تاریخ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ تخت نشین ہونے کے بعد جمشید نے رعایا و برابرا کو خوش کرنے کی کوشش کی، مختلف انتظامات سے سرفراز کیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھایا، دیگر سلاطین و کن کی طرف سے قنزیت و تہنیت وصول ہوئی، مگر اس کے باوجود راعی و رعایا میں وہ خوشگوار تعلقات نہیں پیدا ہو سکے جو اس کے پیشرو کے عہد حکومت میں تھے۔ اول تو جمشید کے ہاتھ دو آدمیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے، ایک طرف تو وہ اپنے

۱۷۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۷۸۔ تاریخ فرشتہ مقالہ سوم ص ۱۶۸۔

۱۸۔ فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے صرف سلطنت کی حرص و آرزو اس فعل قبیح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جمشید فرزند اکبر تھا، اور اس طرح اس کو اپنے کسی دوسرے بھائی سے کوئی عدشہ نہ تھا۔ باپ کو قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی عمر غیر ضروری طور پر طویل ہو رہی تھی، اور یہ حکومت کی آرزو میں بڑھا ہو گیا تھا۔ اس لیے قدرتی طریقہ کار کے مقابلے جو بہت شست ہوتے ہیں آسان اور سریع ذرائع سے کام لیکر باپ کا اپنے وقت سے پہلے خاتمہ کر دیا، اور اپنے حسب منشا تخت حاصل کر لیا۔ لیکن اس بیان کی گولکنڈہ کی تاریخوں سے تصدیق نہیں ہوتی۔

باپ کے خون کا ذمہ دار تھا تو دوسری طرف اپنے بھائی قطب الدین کو اندھا کر کے اس کو بے دست و پا کرنے کی قبیح ذمہ داری اس کے سر تھی۔ پدرکشی ایسا قبیح فعل ہے کہ قدیم و جدید کوئی تمدن اس کو گوارا نہیں کر سکا بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسے پدرکش ہر طرح ملعون رہے، اور عوام میں کبھی ان کی ہردلعزیزی نہیں ہو سکی جمشید کے دامن پر محمود بھائی کا تیسرا خون بھی تھا۔ یہ ایک تیسرا شخص ہے جس نے انعام و اکرام کی جڑی لالچ میں سلطان قلی قطب شاہ کو قتل کیا تھا لیکن اس کی آرزو پوری نہ ہوئی، اور یہ بھی جمشید کی تلوار کے گھاٹ اترایب یہ سلطان کو قتل کرنے جمشید کے پاس پہنچا تو کہا جاتا ہے کہ اس واقعے کو چھپانے کے لیے اس نے اس کو تلوار سے قتل کر کے ایک گڑھے میں دفن کر دیا۔ تاکہ یہ راز سر بستہ فاش نہ ہو اس طرح یہ قاتل بھی اس کی حرص و آرزو کا شکار ہوا۔ یہ قبیح افعال جو بہت جلد طشت از بام ہو گئے، جمشید کو ملک میں کبھی ہردلعزیزی نہیں کر سکے ملک میں ہر جگہ ان واقعات کے چرچے تھے۔ بوڑھے اور بچے اس کو طعن و تشنیع سے یاد کرتے تھے اگرچہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی ہمیشہ مسرت و شادمانی کا پیام لاتی ہے اور افراد مملکت انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی کی رسم بجائے مسرت کے ملک میں غم و غصہ بڑھاتی رہی۔ لوگ سلطان مرحوم کی مطلوبانہ موت اور قطب الدین کی بے بسی پر آنسو بہانے لگے۔ امرا و عہدہ دار دربار میں شریک تو ہوئے لیکن وہ دل سے خوش نہیں ہوئے اور بادل ناخواستہ بیعت کی اس کے علاوہ جمشید کی تلخ طبیعت نے بھی اس فضا کو اور کمزور بنا دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جمشید باپ کی زندگی میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا جب مرنے کے وقت سلطان قلی کی عمر ننانوے سال کی تھی تو جمشید ساٹھ سال سے کم نہ ہوگا، اور یہ ساٹھ سال اس کے کچھ اچھی طرح نہیں گزرے تھے ابتدائی بچپن کا حال تو نہیں معلوم ہو سکتا، لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب اس کے بڑے جند بابت کا پتا چلا شروع سے ہی اس کو قید و بند میں رکھنے کی کوشش کی گئی چنانچہ سلطان قلی کے مرتے تک یہ قید میں تھا اور زندگی کے بڑے دن کاٹے تھے ظاہر ہے کہ قید و بند کی روحانی اور جسمانی تکلیفیں انسان کی طبیعت پر برا اثر کرتی ہیں جس شخص کی اٹھان اور پرورش بہت تنگ و تاریک فضا میں ہو، وہ کبھی فراموش دل اور بلند خیال نہیں ہو سکتا چونکہ جمشید کی زندگی کا بڑا حصہ قید و بند کا میوں میں گزرا تھا، اس لیے اس کا

تنگ دل اور ترش مزاج ہونا ضروری تھا، ایک ساٹھ سالہ آدمی تخت نشین ہونے کے بعد اپنی ساٹھ سالہ مزاجیوں کو جو اس طویل زمانے سے طبیعت میں مرکوز ہوئی ہوں، دُور نہیں کر سکتا۔ واقعات سے معام ہوتا ہے کہ جمشید نے بہت تند مزاج اور ترش روئی پائی تھی اور ہر چیز کو کوتاہ نظری سے دیکھتا تھا، اور معمولی باتوں کے لیے اُمر اور عائد پر اس بُری طرح بگڑتا تھا کہ تمام درباری نہ صرف اس سے بیزار ہو گئے تھے، بلکہ دربار چھوڑ کر بھاگ گئے اور اکثر لوگ ایسے تھے جو اس کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنے کی سوچنے لگے اور ہر طرف سازش کا سامان ہونے لگا۔

”ملک کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ ایک بے مینپی ہی محسوس ہوتی تھی، اور سلطنت کے ذمہ دار عہدہ دار جمشید کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈے سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بید پہنچ گیا تھا، برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈے کی دیواروں تک پہنچ گیا، اگرچہ یہ علاقہ برہان نظام شاہ واپی احمد نگر کی تائید سے رفع ہو گیا، اور ابراہیم ناکام ہو کر بھاگ چلا گیا، لیکن ملک برید اس حملے کے بعد سے گولکنڈے کی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے کافی طور پر واقف ہو گیا اور اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ گولکنڈے کی سلطنت کے مخالف جمعوں پر کئی حملے کر دیے اور سلطنت کو خوب ستایا۔ دولت قلی کی طرف سے علیحدہ طورہ لگا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ مرکزی حکومت سے بہت دُور تھا، لیکن بعض ہمدرد اس کو قید سے چھڑا کر تخت نشین کرنا چاہتے تھے۔ یہ تمام حالات گولکنڈہ کی فضا کو اس قدر تلخ اور گدردہ کیے ہوئے تھے کہ سلطنت کو بہت کم اطمینان نصیب ہو سکا۔ عموماً سلطان قلی قلب شاہ کے عین بعد ہی اس تاریک دور کا آنا ایک تین فرقہ گردیتا تھا، لوگ محسوس کرتے تھے کہ سلطنت گزشتہ دور کی خوشحالی اور طمانیت سے محروم ہو گئی، چونکہ جمشید کے قبیح اثرات اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہے تھے، اس لیے یہ بے اطمینانی اور غائب جی جمشید کے مرنے کے بعد بھی جاری رہی۔ اور

۱۔ فرشتہ کہتا ہے کہ جمشید بات بات پر لوگوں کو قتل کرتا تھا۔ اس بیان میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت تک اس کا سلسلہ چلا جب تک کہ اس کا بھائی ابراہیم قطب شاہ بیجا نگر سے واپس آئے۔ گوکٹنڈہ پر  
جلوہ افزہ ہوا۔

گوکٹنڈہ کی اس ناگوار سیاسی فضا کی وجہ سے بجائے گھر میں بیٹے چھپی اور رہتے  
ہمیشہ قطب شاہ کے عہد کی لڑائیاں | ہر وقت حملوں کا ڈر لگا رہتا تھا، اس عہد میں سلطنت کی کوئی توسیع نہ ہوئی۔  
جو حدود سلطنت سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئے تھے اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا، اگرچہ سلطنت کی  
فوجی طاقت وہی تھی جو سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں پائی جاتی تھی، اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ  
ہمیشہ قطب شاہ بھی ایک اچھا سپاہی تھا، لیکن پہلے عہد کا ساولوہ نہ تھا، ہمیشہ کی اخلاقی حالت فوج کی تنظیم اور  
کارکردگی پر بری طرح اثر انداز تھی۔ فوجوں میں جو کچھ طاقت تھی، وہ یا تو خانہ جنگی کی نذر ہوتی یا دکن کے مسلمانوں کی  
باہمی رقابتوں کا جواب دیتی رہی، اس لیے سلطنت کی توسیع کہاں ممکن تھی!

ہمہی سلطنت کے زوال کے بعد جب دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو شروع سے ہی ان میں  
رقابت کا سامان پیدا ہو گیا، اور خانہ جنگیاں ہونے لگیں جو ان حالات کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہمیشہ کا عہد تو بس انہیں  
لڑائیوں سے پر ہے اور اس کا سلسلہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد سے شروع ہو چکا تھا۔ ہمیشہ قطب شاہ کے عہد میں  
سب سے پہلی لڑائی اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم کی وجہ سے ہوئی تھی، یہ اپنے باپ کے آخری زمانے میں دیو گنڈے میں  
تھا، ہمیشہ نے اس کا بھی خاتمہ کرنا چاہا، کیونکہ یہ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ لائق تھا، اور ہمیشہ کو اپنے اس بھائی سے  
بہت محلوہ تھا، لیکن ابراہیم دیو گنڈے سے بھاگا، اور دہلی بیدر کی مدد سے گوکٹنڈے پر حملہ کر دیا جو ہمیشہ کے لیے بہت  
پریشان کن تھا، مگر احمد نگر کی امداد سے ہمیشہ کامیاب ہو گیا۔ یہ برہان کی اس بروقت امداد سے اس قدر خوش ہوا کہ  
انہماک مومنیت کے لیے احمد نگر جا کر اس سے ملاقات کی احمد نگر میں ہمیشہ کی بڑے سڑک و احتشام کے ساتھ آؤ چھگن  
لیگی۔ پتھر و آفتاب گیری اور شاہ کا خطاب پیش کیا گیا تھا، اس نے دعویٰ تو قبول کیا، لیکن شاہی اعزازات  
لے نہیں کیے، اور اس کے جواب میں حسب ذیل اشعار کہے تھے۔

مرا نیست با چتر شاہی نیاز  
خطابے نہ خواہم بہ عمر دراز  
کہ شاہان ملک دکن بالتمام  
گرفتند از آن چتر شاہی بنا  
کہ از روئے مردی و مردانگی  
ہماں روز شمشیر و فرزانگی  
و بودند گوئے از سپہر و درنگ  
زمید! ان مردی بہ چوگان جنگ  
چو من ضربت شجاعت بہ شاہ  
نمایم بگیرم خطاب و کلاہ  
من آنگہ کنم چتر شاہی قبول  
کہ گیرم ز دشمن بہ عون رسول

چونکہ اس زمانے میں سرحدی نزاع، اور خصوصاً شولا پور کی وجہ سے بیجا پور اور احمد نگر کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے، اس لیے برہان نظام شاہ کے لیے جمشید قلعہ شاہ کی دوستی اور اتحاد خاص معنی رکھتا تھا۔ غالباً ہی وجہ تھی کہ شاہ طاہر نے احمد نگر کو برید کے مقابلے میں گولکنڈے کی مدد کے لیے ابھارا تھا۔ اور جب جمشید، برہان سے ملنے کے لیے احمد نگر گیا تو وہاں اس کی حد سے زیادہ آؤ بھگت کنگی اور اس کے جذبہ خودداری کی داد دی گئی اور یہ تمام ذرائع حصول اتحاد کے لیے استعمال کیے گئے اور اتفاق سے اسی زمانے میں جبکہ جمشید احمد نگر میں مہمان تھا شولا پور پر حملہ کرنے کا مسئلہ گرم تھا اور فوجی تیاریاں ہو رہی تھیں جمشید کی آمد بہت غنیمت سمجھی گئی چنانچہ برہان نظام شاہ نے ایک طرف جمشید قلعہ شاہ کو اپنے ساتھ لیا، اور دوسری طرف اپنے ہمسایہ رئیس عماد الملک کو شریک کار کر کے غالباً ۱۵۴۷ء میں شولا پور پر دھاوا بول دیا۔ ابراہیم عادل شاہ اول اس سیاسی اتحاد سے بالکل بے خبر تھا اس کو توقع نہ تھی کہ دکن کی تین سلطنتوں کی متحدہ فوجیں اچانک شولا پور پر چڑھ دوڑیں گی۔ چونکہ ابراہیم عادل شاہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے دشمنوں کی توجہ کو پراگندہ کرنے کے لیے فوراً احمد نگر کے مقبوضہ قلعہ پر بیٹھہ پر حملہ آور ہو گیا، اور دونوں حریف فوجیں پر بیٹھہ پر برسر پیکار ہو گئیں ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں بھی تھیں۔ بیجا پور کی فوجوں نے اس قدر ڈٹ کے مقابلہ کیا کہ معرکہ بہت سخت ہو گیا اور طویل کھینچ رہا تھا اس موقع پر جمشید اور اس کی فوجوں نے بڑا کام کیا، اس نے آگے بڑھ کر دشمن کی سپاہ پر کئی دایہ کیے



اور حریت کی فوجیں تتر بتر کر دیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابراہیم اور برید میدان پھوڑ کر بھاگ گئے، چونکہ برید بید کی طرف بھاگا تھا، جمشید نے اس کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا، اور بہت سا مال غنیمت لیکر گولکنڈہ واپس ہوا۔ جمشید کی یہ امداد، اور اس کا دلیرانہ حملہ احمد نگر کے لیے باعث مسنونیت تھا، اس لیے احمد نگر کی سلطنت نے گولکنڈے کی رفاقت کبھی نہیں چھوڑی۔

اس شکست کے بعد علی برید خاموش نہیں رہا، اور احمد نگر سے زیادہ گولکنڈے سے انتقام لینے کی کوشش کی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس ہزیمت میں جمشید کا زیادہ حصہ تھا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جمشید نے بیدر کی دیواروں تک برید کا سخت تعاقب کیا تھا، اس لیے برید نے اس سے انتقام لینے کے لیے غالباً ۹۵۲ھ میں گولکنڈے پر حملہ کر دیا۔ لیکن گولکنڈے میں قوت مدافعت کافی تھی، جمشید نے اس موقع پر ایک خاص تدبیر سے کام لیا۔ گولکنڈے میں تو اس کی ہلکی سی مدافعت کی، یعنی قلعے کو دوسرے سپہ سالاروں کے سپرد کر کے خود دوسرے راستوں سے بیدر پہنچ گیا، اور وہاں حملہ کر بیٹھا جب برید کو یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً بیدر کو بچانے کے لیے بھاگا۔ پٹنہ اور کلپتور کے درمیان جمشید اور برید کی فوجوں کا سامنا ہوا۔ لڑائی بہت شدید ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ عین لڑائی میں جمشید ہاتھی سونچے اتر گیا، اور اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جانے سے کچھ دیر کے لیے فوج میں بدحواسی پھیل گئی لیکن بالآخر گولکنڈے کی فوجیں دشمن پر غالب رہیں اور دونوں فوجیں اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو گئیں۔

ان متعدد ہزیمتوں کے باوجود برید نچنت نہیں بیٹھا، بلکہ اس کا جذبہ انتقام ہر روز تیز ہوتا گیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح گولکنڈے کی قوت توڑے، چونکہ ابراہیم عادل شاہ والی بیجا پور سے اس کا اتحاد تھا اس لیے بیجا پوری فوج کی مدد سے غالباً ۹۵۳ھ میں قلعہ میدک پر قبضہ کر لیا، اور وہاں چالیس ہاتھی اور سات ہزار ہون مال غنیمت حاصل کیے۔ جمشید نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی پہلے تو بیدر پر حملہ کرنا چاہا،



لیکن آخر کو، کولاس پانچکر بریدی سلطنت کے مختلف حصوں پر چھاپے مارنے شروع کیے تاکہ بڑید پریشان ہو کر میدان ک  
چھوڑ دے۔ بڑید آٹھ ہزار فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے آیا۔ ناراین کھیر کے قریب یہ دونوں فوجیں ملیں اور بڑے  
گھمسان کا رن پڑا۔ جمشید نے بڑے کے حملے کیے تو بریدی فوج کے بہت سے پہلو منتشر ہو گئے۔ چنانچہ بہت دنوں  
کے لیے میدان میں خاموشی چھا گئی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ عین الملک کا بیٹا جو بڑید کے بڑے پہ سالاروں میں سے تھا  
بڑید کو چھوڑ کر گولکنڈے کی فوجوں سے مل گیا۔ اس دوران میں گولکنڈے کے بڑے مشہور جنرل جگدیو راؤ نے ہوتا یخوں میں  
اعظم جگدیو راؤ لکھا جاتا ہے جمشید کو یہ رائے دی تھی کہ کولاس کے قرب و حوا میں قدرتی پہاڑ پر ایک نیا قلعہ تعمیر  
کر کے اپنے قدم مضبوط کر لے چونکہ یہ بہت اچھی تجویز تھی اس لیے یہاں پر بادشاہ کے حکم سے جگدیو راؤ نے نئے قلعے کی تعمیر  
کر لی تھی جب ناراین کھیر کی جنگ شروع ہو رہی تھی اس وقت یہ نیا قلعہ تیار ہو چکا تھا، اور جب یہ جنگ ذرا  
تھم گئی تو جمشید اس قلعے کے معاینے کے لیے کولاس گیا، اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بڑید نے اچانک حملہ  
کر دیا۔ گولکنڈے کے جنرل جن میں عین الملک کا بیٹا بھی تھا کھانے پینے میں مصروف ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ  
گولکنڈے کی فوجوں کو بڑی طرح شکست ہوئی اور عین الملک کا بیٹا مارا گیا، اور منہزم فوج کولاس تک بھاگ آئی جمشید نے  
فوراً متفرق فوجوں کو گنجا کر کے بڑید پر پیش قدمی کی، لیکن بڑید اس مقابلے کے لیے تیار نہ تھا، وہ بیدر بھاگ گیا۔  
جمشید نے ناراین کھیر حسن آباد وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ قلعہ کولاس کو فوجوں اور اسلحہ سے سخت کر دیا، اور یہ تمام ولایات  
جگدیو راؤ کے تفویض کر کے گولکنڈہ واپس ہوا۔

اگرچہ بڑید کو ان ٹرائیوں میں شکست ہوتی رہی، لیکن اس کا بار بار حملہ کرنا پریشانی کا باعث تھا  
اور سلطنت کو ہمیشہ باخبر رہنا پڑتا تھا۔ گولکنڈہ آئیکے بعد جمشید نے صورت حال پر غور کر کے بڑید کے انتقال کا  
تدبیریں سوچیں اور برہان نظام شاہ کو اس معاملے کی طرف توجہ دلائی کہ کسی طرح بڑید کا خاتمہ کرنا ضروری ہے  
ورنہ اس کی ریشہ و دواہیوں اور بار بار کے حملوں سے دکن کا سیاسی مطلع ہمیشہ غبار آلود رہے گا، اور کسی  
سلطنت کو اطمینان حاصل نہ ہو گا۔ برہان نے اس رائے سے اتفاق کیا، اور تجویز یہ ہوئی کہ چوہدری سے

حملہ کر کے برید کے تمام اقطاع مسخر کر لینے چاہئیں چنانچہ اسی ۹۵۳ھ میں برہان نے قلعہ اوسہ اور ادگیر پر حملہ کر ہی دیا، اور ادھر سے جمشید قطب شاہ اپنی فوجوں کے ساتھ کولاس پہنچ گیا۔ پہلے اوسہ جا کر برہان نظام شاہ سے ملاقات کی جو دونوں سلاطین کے لیے مسرت کا باعث تھی اور اس کے بعد برہان کی رائے سے قلعہ میدک پر جو ابھی تک برید کے قبضے میں تھا حملہ کر دیا۔ قلعے کے محاصرے میں بہت دیر لگی اور بڑی خونریزی کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا۔ اس قلعے کی تسخیر سے جمشید کو بہت سامان غنیمت حاصل ہوا۔ دوسری طرف برہان کے حلیف عماد شاہ نے اوسہ اور ادگیر فتح کر لیے۔ جب اس طرح بڑید کو سخت پریشانی ہوئی تو وہ بیجاپور سے مدد کا طالب ہوا چونکہ احمد نگر کی رقابت میں بیجاپور کی سلطنت برید کے اتحاد کو ضروری سمجھتی تھی اس لیے ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ایک جنرل اخلاص خاں کے ماتحت پانچ ہزار کی ایک منسوب فوج برید کی امداد کے لیے روانہ کی۔ برید اس فوج کے ساتھ قلعہ کولاس پر حملہ آور ہو گیا۔ جمشید قطب شاہ کے عہد کا یہ بہت بڑا معرکہ تھا۔ جمشید نے اس کے مقابلے کے لیے اپنی فوج کی باضابطہ صف آرائی کی اور خود قلب لشکر میں کھڑا ہوا، اور مہینہ دمیہ پر شفقت خاں۔ عین الملک اور بگد پوراؤ کو متعین کیا گیا۔ دشمن کی طرف سے بڑید اور اس کے معاون جنرل اخلاص خاں نے خاطر خواہ زور دکھایا لیکن گولکنڈہ کی فوجوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ بگد پوراؤ، اور عین الملک کی کارگزاری قابل تعریف تھی۔ بڑید کو بڑی ہزیمت ہوئی اور وہ بیدربھاگ گیا۔ جمشید بہت کچھ مال غنیمت حاصل کر کے گولکنڈہ واپس ہو گیا۔ اگرچہ کولاس کی اس لڑائی میں برید کو خاطر خواہ شکست دی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود جمشید اور برہان کے حقیقی مقاصد پورے نہیں ہوئے۔ برید کی طرف سے آئندہ سیاسی انتشار کا ڈر لگا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کی بروقت امداد سے برید کو تقویت حاصل ہو گئی، ورنہ ۹۵۲ھ کی لڑائیوں میں جوہم اور

دیکھ آئے ہیں، برید کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا، اس لیے گولکنڈہ واپس آئیے بعد جمشید قطب شاہ نے پطرس معاملے پر غور کیا، اور اس وقت اس کو برید کے علاوہ ایک اور دشمن کی یکسوئی ضروری معلوم ہوئی، اور وہ بیجا پور کی سلطنت تھی جو برید کی تائید کرتی تھی، اور جب تک اس کی یکسوئی نہ ہوتی، برید کا استیصال نامکن تھا چنانچہ اس معاملے میں برہان نظام شاہ سے مشورہ کیا گیا کہ کسی طرح بیجا پور کو برید کی مدد سے باز رکھنا چاہیے نظام شاہ سے کہا گیا کہ بیجا پور سے اس معاملے میں عطف و کتابت کرے اس زمانے میں احمد نگر اور بیجا پور کے تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ نہ تھے اس لیے برہان نظام شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کو فوراً اس مضمون کا خط لکھا کہ برید کے شروع و فساد سے ہمیشہ دکن کا مطلع غبار آلود رہتا ہے اس سے نہ صرف بیگناہ خلق اللہ کا ناحق خون ہوتا ہے بلکہ سلاطین دکن کو بھی اطمینان نہیں ہوتا، لہذا برید کا خاتمہ کرنا سب کے لیے مناسب ہے ابراہیم نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور بجائے برید کے احمد نگر، اور گولکنڈے کی تائید پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ تجویز یہ ہوئی کہ نظام شاہ قندھار پر حملہ کرے جو برید کا بڑا قلعہ تھا مسخر کرے اور ابراہیم سے یہ کہا گیا کہ بجائے خاموش بیٹھنے کے بیجا نگر کی ہندو سلطنت پر حملہ کر کے ممکنہ فتوحات حاصل کرے، چنانچہ ۹۵۴ھ میں پھر سلاطین دکن نے چوہدریوں سے فوج کشیاں شروع کر دیں برہان نے فوراً پیش قدمی کر کے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ برید پریشان ہو کر امداد کے لیے بیجا پور بھاگا۔ چونکہ اس وقت اس کے شروع و فساد کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا، اس لیے ابراہیم نے مدد کرنے کی بجائے اس کو بیجا پور میں گرفتار کر لیا، اور خود بیجا نگر کی طرف پیش قدمی کی اور یہاں اس نے بہت سے قلعے فتح کر لیے۔

لیکن اس اثنا میں احمد نگر اور بیجا پور کی دیرینہ رقابت پھر عود کر آئی۔ برہان کو یہ ڈر ہوا کہ بیجا نگر کی فتوحات سے بیجا پوری طاقت غیر معمولی طور پر بڑھ جائیگی اور احمد نگر کے لیے خطرناک ہوگی اس بُری ہمتی ہوئی طاقت کا فوری سد باب کرنے کے لیے برہان نے شولا پور پر حملہ کر دیا۔ بیجا پور کو چھوڑ کر ابراہیم شولا پور کو

بچانے کے لیے بھاگ آیا، اور یہ دونوں ہمیشہ قطب شاہ کو امداد کے لیے بلانے لگے اور برید علیحدہ ہمیشہ سے انہماک کر رہا تھا کہ خدا کے لیے اس کو قید سے چھڑایا جائے ہمیشہ کے لیے یہ صورت حال بہت نازک تھی چونکہ احمد نگر سے اس کے دیرینہ تعلقات تھے اس کے مقابلے میں وہ بیجا پور کی مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن بڑید کی بجابت سے متاثر ہو کر اس کو رہا کرنے کی کوشش کی اور اس غرض کے لیے ذرا فریب سے کام لیا۔ بیجا پور کے ایچی کو مدد کی ترغیب دلائی کہ میں اس شرط پر مدد کر سکتا ہوں کہ برید کو رہا کر دیا جائے اس لالچ میں ابراہیم نے برید کو رہا کر دیا جب برید رہا ہو گیا تو امداد کا سوال پیدا ہوا۔ تمام عمائد سلطنت نے یہ رائے دی کہ اس وقت کسی کی مدد نہ کرنی چاہیے بلکہ برید کو ساتھ لیکر گولکنڈے کی طرف کوچ کر دینا چاہیے چنانچہ ہمیشہ نے اس وقت کسی کی مدد نہیں کی بلکہ گولکنڈے کی طرف مراجعت کر دی چونکہ بیکر راستے میں پڑتا تھا اس لیے کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ برید نے اٹھارہ مہینے میں ہمیشہ کی بڑی آؤ بھگت کی، ہندو رانے پیش کیے جن میں قیمتی جواہرات بھی تھے ہمیشہ نے یہ جواہرات ملازمین میں تقسیم کر دیے اور خود گولکنڈہ واپس ہو گیا۔ سلاطین دکن کی باہمی رقابت سے برید کا خاتمہ ہو سکا نہ بیجا پور میں فتوحات حاصل ہوئیں۔ دوسری طرف شولا پور میں جنگ کی آگ بھڑکتی رہی۔

۱۷۔ اس واقعے کے متعلق فرشتے نے نہایت مبانی سے کام لیا ہے اس کا بیان ہے کہ اس موقع پر ہمیشہ نے احمد نگر کی امداد کے لیے بیجا پوری علاقوں پر حملہ کر دیا تھا، اور کوکن کے علاقے میں ایک قلعہ بنایا تھا۔ ابراہیم نے برہان اور دابی و جیاتنگر راج سے صلح کر کے ہمیشہ کا مقابلہ کیا، اور اس کو شکست دیدی بیجا پور کے شہو جیلا سرد خاں لاری نے اس کا گولکنڈے کی دیواروں تک پیچھا کیا، چنانچہ فرشتے کے بیان کے مطابق خود ہمیشہ اس لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا، اور اس کا ہونٹ اس برسی طرح کٹ گیا کہ وہ کھانے پینے سے معذور ہو گیا تھا، اور دوسروں کے سامنے کھانا نہیں کھاتا تھا۔ لیکن گولکنڈے کی تاریخوں سے ان واقعات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بیجا پور اور اسد خاں لاری کی مدد سرائی میں یہ فرشتے کا مبالغہ معلوم ہوتا ہے (تاریخ فرشتہ ص ۱۶۹)۔

بیدرت واپس آنیکے بعد جمشید کے دو تین سال آرام میں گزرے اور یہ اس کے اطمینان کا زمانہ تھا۔ چار پانچ سال کی متواتر جنگ و جدل کے بعد اس زمانے میں اس کو عیش و آرام نصیب ہوا تھا، لیکن یہ بہت دنوں تک جاری نہیں رہا۔ دو سال کے بعد جمشید بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا جو اس کے لیے ہلک ثابت ہوا۔ فرشتہ قویہ مرض، وق بتاتا ہے، لیکن تاریخ قلب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے مدد سے بالآخر ۹۵۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ صرف سات سال اس نے حکومت کی، سلطان قلی قطب شاہ کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا اس کی قبر پر جو گنبد ہے وہ اپنی تعمیر کاری میں انوکھی شان رکھتی ہے۔

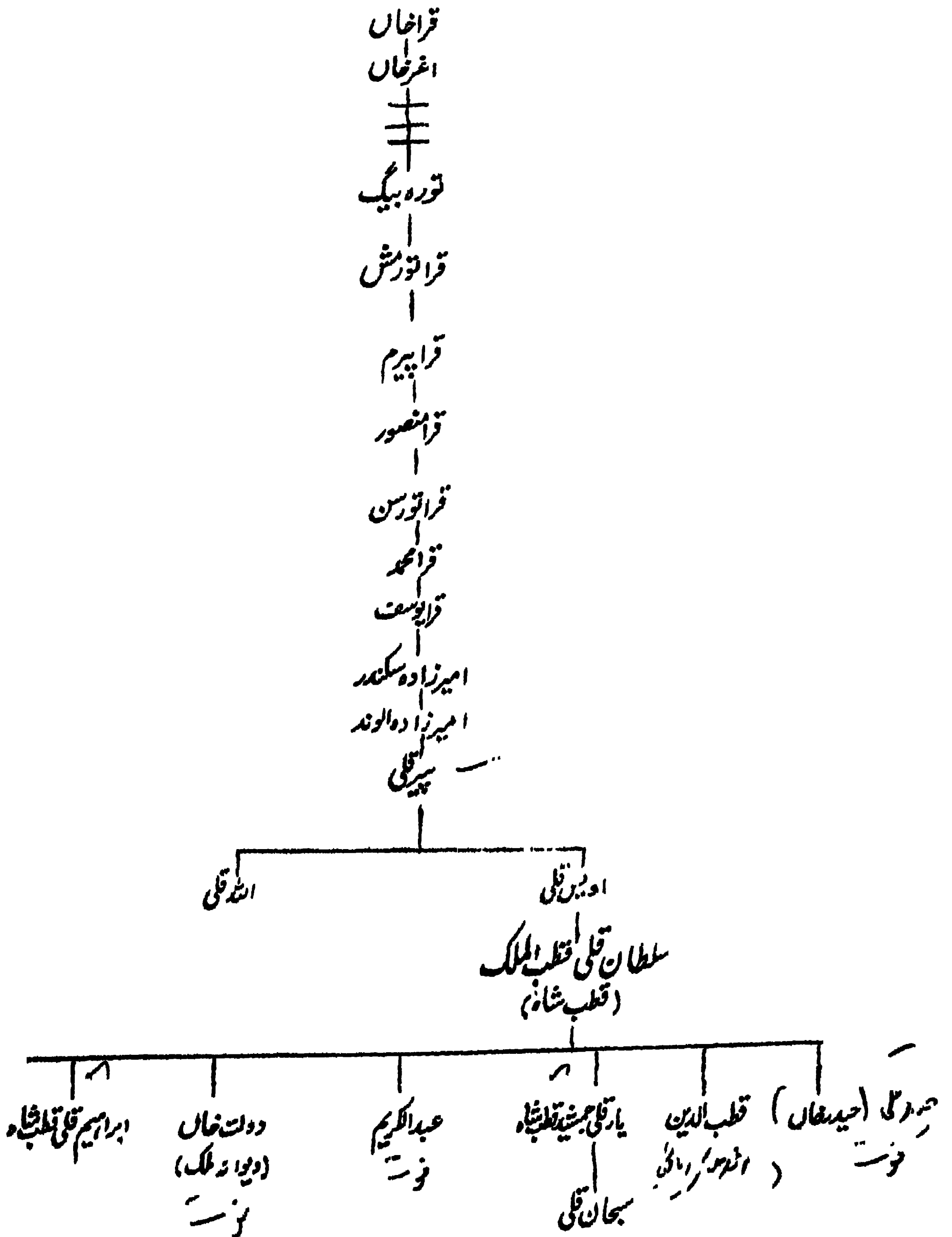
چونکہ حصول تخت و تاج کے لیے جمشید سے بہت قبیح افعال سرزد ہوئے تھے اور اس کی طبیعت بھی کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ آخر عمر میں گولکنڈے کی سیاسی فضا بہت تلخ ہو گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے گرد و پیش میں اس کے اچھے اوصاف بھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن اس کی بُرائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے پائے جاتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں فوجی تنظیم اس کی نہایت اچھی تھی، اور وہ خود بھی اس قدر جری سپاہی تھا کہ فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا، اس نے اکثر لڑائیوں میں خود پیشقدمی کی اور آگے بڑھ بڑھ کے وار کیے اور دشمن کے دل توڑ دیے چنانچہ اس دلیری اور جرات کا نتیجہ تھا کہ سوائے ناراین لٹیر کی جنگ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہوا، گولکنڈے کی فوجوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور دکن کے سلاطین ہمیشہ اس کی امداد کے طالب رہے، اس چیز کو جمشید اپنے لیے بڑا طغرایے امتیاز سمجھتا تھا جب برہان نے اس کو خطاب اور شاہی اعزازات دینے چاہے تو اس نے انکار کر دیا، اور کہا کہ۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھ میں شجاعت اور سپاہیانہ جوہر ہیں، وہی

میرے لیے طغرایے امتیاز ہیں!“

اس سے نہ صرف اس کی شجاعت، بلکہ انتہائی خودداری ثابت ہوتی ہے۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید قطب شاہ میں علمی قابلیت بھی تھی، وہ ایک اچھا شاعر تھا، بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ اشعار بھی کہے تھے۔



نوٹ: یہ شجرہ کلام الملوک مولفہ میر سعادت علی صاحب رضوی سے لیا گیا ہے۔ ۱۲

# حصہ دوم

## سلطنت کا استحکام

# پوتھاباب

## ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے

ابوالمنظر ابراہیم قطب شاہ جو ۱۵۵۵ء میں تخت نشین ہوا تھا گو لکنڈے کی سلطنت کا حقیقی معمار ہے۔ اس کو گو لکنڈے کی تعمیر اور توسیع کا واقعی ذمہ دار سمجھنا چاہیے لیکن یہ ان حکمرانوں میں سے ہے جن کی حصول سلطنت تو کچا خود اپنی بقا کے لیے زندگی کے سخت تلام سے گزرنا پڑا تھا اس کی ابتدائی زندگی کشاکش زسیت کا ایک دھچپ مرقع ہے۔ جب گو لکنڈے کے بانی سبانی سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں کی خود غرضی کی وجہ سے گو لکنڈے کے در و دیوار پر تاریکی چھا گئی سیاست کے تار و پود جگہ جگہ سے بکھر چکے۔ راعی و رعایا کے خوشگوار تعلقات باقی نہ تھے۔ لایق لوگ یا تو پاہ زنجیر تھے، یا ملک چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور محانتگیوں کا بازار گرم تھا۔ یہ جمشید قطب شاہ کے عہد کا جملہ حاصل ہے۔ ابراہیم قطب شاہ انہیں فحسوسناک حالات کا شکار تھا، اس کو پہلے اپنی جان بچانے کے لیے سلطنت کے حدود سے دور بھاگنا اور ایک غیر ملک میں پناہ لینا پڑی۔ جلاوطنی کی تمام مشکلات برداشت کر کے اور مختلف مزارعیتوں کا مقابلہ کر کے اس کا گو لکنڈے کے تخت پر اجلاس کرنا ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کو تخت نہ ملتا تو قطب شاہی خاندان کا جمشید قطب شاہ کے بعد ہی خاتمہ ہو جاتا اور گو لکنڈے کی دو سو سالہ عظمت کبھی نہ پیدا ہوتی۔

ابراہیم قطب شاہ سلطان قلی کا چھٹا اور سب سے چھوٹا بیٹا تھا اس کی پاکیزہ زندگی بچپن سے اس کو ممتاز رکھتی تھی اپنے دوسرے بھائیوں کے خلاف اس ہونہار شہزادے نے شروع ہی سے کچھ ایسی سنجیدگی اور باپ کے ساتھ



وفا شعار و ظاہر کی کہ سلطان قلی قطب شاہ اس سے بہت خوش تھا۔ اسی تاریخ فضا میں جبکہ اس کے بڑے بھائی سلطنت کے خواب دیکھتے تھے، اور باپ کے غلات بغاوت کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے، ابراہیم کی سنجیدگی اور شرافت اس کی آئندہ عظمت کا پیام دیتی تھی معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاکیزہ رجحانات کو دیکھ کر سلطان قلی قطب شاہ نے نہ صرف اس کی تعلیم و تربیت میں کافی دلچسپی لی بلکہ عملی تجربوں کے لیے سلطنت کے بعض انتظامی کام بھی اس کے تفویض کر رکھے تھے۔ چنانچہ یہ سلطان قلی قطب شاہ کے آخری زمانے میں دیورکنڈے میں متعین تھا، تاکہ وہاں اس کا ہم کرے چھوٹے پشترقی اہل خانہ سلطان قلی کے عہد میں فتح ہوئے تھے یہاں غالباً خاطر خواہ اس نہیں تھا اور کچھ تعزیری انتظامات کی ضرورت تھی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ابراہیم دیورکنڈے میں کب مامور کیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ کا یہ بیان کہ باپ کے انتقال کے وقت ابراہیم سن چھوڑ کر نہیں پہنچا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ دیورکنڈے کے انتظامات کی تفویض جو اس تاریخ سے معلوم ہوتی ہے وہ اس چھوٹی عمر میں ممکن نہیں ہے۔ نہ صرف نظم و نسق بلکہ اس انتظامی قابلیت سے جو اس نے یہاں ظاہر کی تھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی کے انتقال کے وقت، بلکہ اس سے پہلے جبکہ یہ دیورکنڈے میں متعین کیا گیا تھا، اس کی عمر کافی ہوگی۔ ابراہیم کے اصل سیاسی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ اس کو اپنے باپ کے انتقال کے بعد حدود سلطنت چھوڑنے پڑے اور ایک غیر ملک میں پناہ لینی پڑی تھی۔ بیجا نگر سے غیر ملک میں جو ایک ہندو سلطنت تھی، اپنی جگہ پیدا کرنا اور وہاں سے سلطنت کے حصول کی کامیاب تدبیر اختیار کرنا، ابراہیم کی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے۔ اس کے پاکیزہ اخلاق اور سیاسی عظمت کا اثر یہ تھا کہ کئی آدمی اس کے ساتھ ہر قسم کا ارشاد کرنے اور بیجا نگر کی ہولناک بادیہ نوردی میں اس کے ساتھ ہر قسم کی مصیبت جھیلنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ جمشید کے انتقال کے بعد جب گولکنڈے کی بساط اٹلی نو دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں جو اس وقت زندہ تھے، گولکنڈے کی سلطنت میں ابراہیم کے ساتھ عام ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اور عجیب بات ہے کہ جب ابراہیم کے قطب شاہی کاروان نے گولکنڈے کی طرف پیش قدمی کی تو لوگ جوتی جوتی اس کے گرد

جمع ہونے لگے اور سلطنت کا سیاسی مطلع خود بخود صاف ہو گیا ان دشمنوں کے باوجود ابراہیم قلب شاہ کا بلا کھٹکے قلب شاہی تخت پر تلوس کرنا بہت بڑا واقعہ تھا جس میں قدرتی حالات کے ساتھ خود ابراہیم کی ذاتی قابلیت اور تدبیر کو بڑا دخل ہے جو اس کے دوسرے بھائیوں میں مفقود تھے

اگرچہ جمشید اپنے باغیانہ رویے کی بنا پر باپ کی زندگی میں قید تھا، لیکن یہ اس کی جسمانی قید تھا اور اس کا منسدانہ دماغ اپنے کام میں مصروف تھا۔ قید و بند میں بھی اس نے اپنے تمام تھکنڈے استعمال کیے اس کے نزدیک سول سلطنت کا سب سے زیادہ مربع اور آسان طریقہ کار یہ تھا کہ باپ کا طبعی موت سے پہلے خاتمہ کر دے کیونکہ اس کو یہ معلوم تھا کہ سلطان قلی کچھ دنوں اور زندہ رہے تو اس کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتا اس دوران میں قلب الدین کو اپنے ہاتھ پیر میں جو مارنے کا کافی موقع مل جاتا، اور اغلب تھا کہ سلطان قلی اپنی کبرنی کا لحاظ کر کے قلب الدین کو خود اپنی زندگی میں تخت نشین کر دے اس لیے بد نما اور قبیح افعال سے کام لیکر جمشید قلب شاہ ۱۱۵۹ھ میں سلطنت کے تخت پر بیٹھ گیا گو اس طریقے سے وہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن بہت سی مزاہتیں اور باقی تھیں ایک طرف تمام رعایا و برائیاں کو ہمار کرنا تھا جو اس کے شنیع افعال سے کبھی خوش نہیں ہوئے۔ دوسرے سلطنت کے اور دعویدار باقی تھے جن کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری تھا ان دعویداروں میں دولت قلی اور ابراہیم تھے ان کے متعلق ڈریہ تھا کہ اگر یہ اپنی حالت پر چھوڑ دیے جائیں تو ممکن ہے کہ اہل ملک جو جمشید سے ناخوش تھے، دولت قلی اور ابراہیم کا ساتھ دیں اور ان کو بادشاہ بنانے کی کوشش کریں۔ دولت قلی تو بھونگیر میں قید تھا، اس کی قید سخت کر دی گئی لیکن ابراہیم کا مقابلہ بہت مشکل تھا، اور اس سے ڈرنیکی کافی وجہ تھی۔ اول تو ابراہیم مقید نہ تھا، دوسرے اس کی قابلیت کا سکہ میٹھا ہوا تھا۔ جہاں دوسرے بھائی اپنے باغیانہ رویے کی وجہ سے مقید و ملعون تھے، ابراہیم نہ صرف آزاد تھا بلکہ امور سلطنت کے انصاف کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ ایسے سلطنت کے دعویدار کو راستے سے ہٹانا، اور اس سے اطمینان حاصل کرنا جمشید کے بس کی بات نہ تھی، اس کے پاس اس وقت صرف یہ چارہ کار تھا کہ مختلف طریقوں سے ابراہیم کو گو لکندہ طلب کرے، چنانچہ ہی کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جمشید کا بلاوا ابراہیم کے لیے بہت معنی خیز تھا جب قطب الدین کو جو جائز وارث تھا، اندھا کر کے بے دخل دیا گیا تو ابراہیم کو جمشید سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ ابراہیم کو جمشید سے ڈرنیکی کافی وجہ تھی، اس کی سلامتی اس بات میں تھی کہ وہ دیورکنڈے سے بھاگ کر کسی اور جگہ جان بچائے۔ اس بارے میں اس نے ان ہمدردوں سے رائے لی جو اس کے ساتھ تھے، اور ہر ایشاء کے لیے تیار تھے جمید خاں حبشی سید جی سلحدار۔ دلاور خاں۔ کاماجی بھون، وہ ہمدرد تھے جنہوں نے ابراہیم کا آخری وقت تک ساتھ دیا، اور ہر مصیبت جھیل کر اس کو بالآخر تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اسی وقتوں کے نام اور کائناتوں کی وضاحت کیے بغیر ابراہیم قطب شاہ کی تاریخ پوری نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے اس کو بیدار جلدی صلاح دی تاکہ والی بیدار سے ملکر اپنی بقا کی تدبیر سوچے۔ ابراہیم پہلے بیدار گیا، اور برید سے امداد لی تھی برید نے ابراہیم کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا تھا۔ علی برید کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی تو نہ تھی، لیکن بریدیوں کی خاص سیاست ایسے موقعے کی متلاشی رہتی تھی چونکہ وہ خود طاقتور نہ تھے، اس لیے اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو آپس میں لڑا کر اپنا بچاؤ کرتے تھے۔ اس دعویدار سلطنت کے بیدار آنے سے برید کو گولکنڈے پر حملہ کرنا موقع مل گیا۔ اگر برید اور ابراہیم کا متحدہ حملہ گولکنڈے پر کامیاب ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ ابراہیم کا بادشاہ ہونا برید کے لیے زیادہ مفید ہوتا، اور گولکنڈے میں برید کے بہت اثرات پیدا ہو جاتے چنانچہ تمام منصوبوں کی پیش رفت میں برید اپنی فوجوں کے ساتھ ساتھ میں گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے آگیا۔

اس وقت ابراہیم کو دوسرے ہمسایہ سلاطین کی بہ نسبت کچھ برید ہی سے توقع تھی۔ جمید خاں اور سید جی وغیرہ نے جو رائے دی تھی، وہ بے محل نہ تھی، اور کامیابی کی توقع غالباً اسی وجہ سے تھی کہ جمشید اپنے شہنشاہی بہت بدنام تھا چنانچہ جب بریدی افواج گولکنڈے کی طرف بڑھیں تو قلعے کی دیواروں تک کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور ابراہیم دبرید نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ محاصرے کے دوران میں فریقین میں برابر کے مورے ہوئے اور فریقین کا

کافی نقصان ہوا لیکن اس کے باوجود جمشید کی کامیابی بڑے خطرے میں تھی کیونکہ جو فوجیں اس کے تحت کام کرتی تھیں وہ اس سے خوش نہ تھیں مگر خوش قسمتی سے برہان نظام شاہ والی احمد نگر نے اس موقع پر گولکنڈے کی امداد بہت ضروری سمجھی۔ شاہ طاہر نے برہان کو یہ مشورہ دیا کہ اگر علی برید گولکنڈے پر قابض ہو جائے تو ممکن ہے کہ تمام دکن پراس کا سنگہ چلے۔ احمد نگر کی ایک بڑی فوج گولکنڈے کی طرف بڑھ آئی، اس کا محرک کچھ شیعہ مذہب کی حمایت اور کچھ برید کی مخالفت تھی اور برید کی توجہ کو منحرف کرنے کے لیے اس فوج نے یہ کام کیا کہ قلعہ کو ہیر کا محاصرہ کر لیا۔ احمد نگر کی یہ نقل و حرکت برید کے لیے پریشان کن تھی خود بید معروض خطر میں تھا، اس لیے برید نے مجبوراً گولکنڈے کا محاصرہ اٹھا لیا، اور کو ہیر کو بچانے کے لیے بھاگا۔ اس طرح سے گولکنڈہ بال بال بچ گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ برید نے بھاگتے ہوئے ابراہیم کے گھوڑے، ہاتھی اور دیگر سامان حرب سمیٹ لیا، اور مغرب کی راہ لی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ اپنے مطلب کے لیے گولکنڈہ آیا تھا۔

جب ابراہیم کی کوششیں گولکنڈے کی ہمسایہ اسلامی طاقتوں کے اتحاد سے بارور نہ ہو سکیں بلکہ برید کے طرز عمل سے اس کا پانسہ اٹھا پڑا تو اس کے سامنے بالآخر دیجیانگر کے سوا کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی۔ برید سے اب کوئی توقع نہ تھی۔ احمد نگر کا یہ حال تھا کہ شاہ طاہر کے اثر سے جمشید کی مدد پر تیار تھا، اور دیجا پور بہت دور تھا اس سے پہلے ایک دوسرے بھائی عبدالکریم نے یہاں لا مائل کوشش کر لی تھی ان حالات میں ابراہیم کی دور میں نظر دوریائے تنگ بعد راکے نیچے پڑی۔ اگرچہ سلطنت بہمنی اور سلطنت دیجیانگر دونوں ایک ہی زمانے میں قائم ہوئی تھیں، لیکن آخر اند کر سلطنت میں کچھ ایسی استقامت تھی کہ گو سلطنت بہمنی کا بہت جلد شیرازہ بکھر گیا لیکن یہ جنوبی سلطنت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم تھی اس زمانے میں اس سلطنت کا مشہور حکمران رام راج جس کو دکن کے مورخ راء اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں اپنے زمانے کا بڑا اقبال مند راجہ تھا اگر قطب شاہی مورخوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ رام راج کسی زمانے میں سلطنت گولکنڈے کا

جاگیردار اور سلطان قلی کا ملازم تھا تو ابراہیم کے لیے اس سے بہتر پناہ گاہ نہ تھی۔ رام راج ابراہیم سے ضرور واقف ہو گا، اور اسی وجہ سے اس کے ہمدردوں نے اس کو ویجیا نگر کی طرف بھاگنے کی صلاح دی ہوگی۔

ابراہیم کا ویجیا نگر بھاگنا اچھا منصوبہ ضرور تھا لیکن پائے تخت تک اس کی رسائی آسان نہ تھی۔ دشمن چاروں طرف گھات میں لگے ہوئے تھے جمشید کی فوجیں تعاقب کر رہی تھیں۔ جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر شہزادہ ابراہیم ہاتھ سے نکل جائے تو یہ ہمیشہ کے لیے سنگ راہ ہو گا، اور اس کو کبھی با من زندگی نصیب نہ ہوگی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ ابراہیم فوجی تعاقب سے تو بچ گیا، لیکن جنوبی فاصلے طے کر کے دریائے تنگبھدرا عبور کرنے لگا تو اس کو دوسرے دشمنوں سے سابقہ پڑا جمشید نے ابراہیم کا راستہ روکنے کے لیے ان رہزنوں سے کام لیا جو جنگل اور دریاؤں کی وادیوں کو اپنا ما من بنائے ہوئے تھے۔ دریائے تنگبھدرا کی وادی میں ان دنوں نارائن ماما پنڈت نامی رہزنوں کا ایک سردار رہتا تھا، اور یہ دونوں سلطنتوں کی درمیانی حدود میں خود مختار حیثیت رکھتا تھا اس موقع پر یہ جمشید قطب شاہ کا معاون ثابت ہوا، اس نے ابراہیم کے تمام راستے بند کر دیے اور جمشید کو ان مفردین کی اطلاع کر دی جمشید کے لیے یہ اچھا موقع تھا، اس نے حبیب خاں کے بھائی تغرش خاں کے ہمراہ پانچ ہزار ہون اور شاہی خلعت وغیرہ ماما پنڈت کے پاس بھیج دیے، نیز ایک ہاتھی اور دو سو سوار روانہ کیے۔ اس شاہی حوصلہ افزائی سے ماما پنڈت کی طاقت بہت بڑھ گئی اور گولکنڈے کے پناہ گزینوں کے لیے صورت حال بہت نازک ہو گئی تھی۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ حمید خاں اور سید محمد نے اس مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پا کر رام راج کو اپنے آئینی خبر کر دی اس اطلاع پر رام راج فوراً امداد کے لیے کھڑا ہو گیا، اور پنڈت کو لکھا کہ شہزادہ ابراہیم کو چھوڑ دیا جائے، ورنہ سرتن سے جدا کر دیا جائیگا۔ اس فرمان سے پنڈت نے ابراہیم کو چھوڑ دیا۔ یہ پناہ گزین دریا عبور کر کے ویجیا نگر پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی غیر معمولی آؤ بھگت کی،

اور اگر تاریخ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو پہلے رام راج نے شہزادہ ابراہیم کے استقبال کے لیے اکابر سلطنت کو جن میں اس کے عزیز و اقارب شامل تھے آگے بھیجا، اور یہ لوگ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو نہایت احترام کے ساتھ شہر لائے اور جب ابراہیم شہر میں پہنچا تو رام راج نے اس کی غیر معمولی عزت کی اور اپنے برابر میں تخت پر بٹھلایا، اور اتنی مدارات کی جو ولی نعمت زادے کے ساتھ کرنی چاہیے تھی۔

ابراہیم کو اپنے بھائی جمشید کے انتقال تک و بجا انگریز سات سال رہنا پڑا تھا یہ سات سال کی جلاوطنی ابراہیم کی زندگی کا ایک دچسپ مرقع ہے ممکن ہے کہ اس کے ذریعے سے رام راج برید کی طرح گولکنڈے کی مخالفت کا ضروری سامان جمع کرنا چاہتا ہو، اور اسی وجہ سے اس نے ابراہیم کے ساتھ غیر معمولی مدارات کی ہوئیں اس میں خود ابراہیم کی قابلیت اور سلیقے کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں، و بجا انگریز جلاوطنی ابراہیم کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی یہاں اس کی نہ صرف جان بچ گئی بلکہ حصول سلطنت کی بہت سی راہیں پیدا ہو گئیں ایک ایسے شخص کے لیے جو دکن کی ایک بڑی سلطنت کا ناخدا ہونے والا تھا و بجا انگریز کی سی بڑی سلطنت اور اس کا سیاسی ماحول بہت کچھ مطالعے کے قابل تھا۔ و بجا انگریز کے رکھ رکھاؤ اور اس کا تمدن جو عبدالرزاق ایرانی کے سیاحت نامے سے واضح ہوتا ہے اپنے میں بڑی کشش رکھتا تھا۔ اور فرشتے کے قول کے مطابق خود بہمنی سلاطین بھی اپنے زمانے میں اس سلطنت کو دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ چنانچہ مجاہد شاہ بہمنی اپنے حملے کے دوران میں و بجا انگریز کو بچشم خود دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ ابراہیم قلعہ شاہ نے یہاں سیاست اور تمدن کے بے شمار سبق سیکھے ہوں جو اس کے درخشاں عہد حکومت سے ظاہر ہوتے ہیں گولکنڈے کی سیاست جس مسئلے سے تیار کی گئی تھی اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ لنگانے اور کرناٹک کے بہت کچھ عناصر شامل تھے۔ اور اسی وجہ سے یہ سلطنت لنگانے کی جزائی اور قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ ایسی پیوست ہو گئی تھی کہ اہل لنگانہ اس کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے۔

شہزادہ ابراہیم کو بیجا نگر میں بہت سے واقعات پیش آئے، منجملہ ان کے عین الملک کنگانی کا واقعہ ہے۔ یہ شخص بیجا پور کے بڑے امرا میں سے تھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر حواس کی روگردانی کا باعث ہوئے، ویجا نگر کا ملازم ہو گیا۔ چونکہ یہ ایک دلیر سپاہی تھا، اور اس کے ساتھ چار ہزار سوارہ فوج بھی تھی اس لیے رام راج اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کو اپنا بھائی کہتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز عین الملک، رائے اعظم سے ملکر دربار سے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں شہزادہ ابراہیم کے ساتھ مڈ بھیڑ ہو گئی، حمید خاں اور سیدی شہزادے کے ساتھ تھے، راستہ بہت تنگ تھا دونوں طاقتیں وقت واحد میں ایک ہی راستے سے گزرتا چاہتی تھیں، قرون وسطی کا جذبہ شجاعت اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک فریق دوسرے کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دے، اور چپ چاپ راستہ دیدے۔ عین الملک کے ساتھ اس کا پورا دستہ فوج تھا۔ حمید خاں اور سیدی نے کہا کہ دکن کے رواج کے مطابق دشمن کا مقابلہ کر کے راستہ پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ کمزوری سمجھی جائیگی! چنانچہ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم کے مٹھی بھر آدمیوں نے لڑ لڑا کر راستہ کھال لیا اور رام راج کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی دلاوری کی بڑی داد دی، لیکن عین الملک انتقام کے لیے اسی جگہ کھڑا رہا تاکہ جب ابراہیم دربار سے لوٹے تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔ جب رام راج کو معلوم ہوا تو اس نے عین الملک کے نام احکام بھیجے کہ وہاں سے چلا جائے، اور جب وہ اس کے بعد بھی نہیں گیا تو ہتھکڑیاں لگا کر بھیجے گئے اور دھمکی دی گئی کہ ویجا نگر سے کھال دیا جائیگا۔ اس دھمکی کے بعد وہ وہاں سے ٹلا۔

۱۔ تاریخ قلعہ شاہی ص ۱۱۱۔

۲۔ فرشتہ، عین الملک کا نام ”عبر خاں“ بتاتا ہے، ممکن ہے عین الملک کا نام ”عبر خاں“ ہو۔ لیکن اس کا مزید بیان یہ ہے کہ اسباب مخالفت صرف راستے تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ رام راج نے ”عبر خاں“ کی جاگیر کے اکثر حصے ابراہیم کی ضروریات کے لیے دے رکھے تھے۔ اس وجہ سے ”عبر خاں“ ابراہیم کا مخالفت ہو گیا تھا، جب راستے میں مڈ بھیڑ ہو گئی تو سخت کلامی کے ساتھ لڑائی ٹھن گئی اور اس لڑائی میں ابراہیم نے ”عبر خاں“ کو اپنے خنجر کے وار سے قتل کر دیا اور



ادھر جہانگیر میں جمشید کا انتقال ہوتا ہی گولکنڈے میں ایک سیاسی افراط فری مچ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کمزور ملتان میں جو جمشید کے عہد میں اجزائے مملکت کو کسی قدر مربوط کیے ہوئے تھیں، اس کے مرتے ہی منتشر ہو گئیں اور گولکنڈے کی سلطنت چند روز کی مہمان معلوم ہونے لگی، گو ان حالات میں شاہی محل نے بڑا حصہ لیا۔ مرحوم بادشاہ کی بیوی بلقیس زماں اور خدیجہ دوران نے بعض عائد سلطنت سے مشورہ کر کے جمشید کے بیٹے کو تخت نشین کر نیکی کوشش کی جن لوگوں نے بلقیس زماں کے ساتھ اتفاق کیا تھا وہ فرشتے کے الفاظ میں مصطفیٰ خاں اردستانی، صلابت خاں ترک اور دیگر عمائد تھے جمشید کا بیٹا سبحان قلی جو اس وقت سلطنت کے لیے نامزد کیا گیا، اس قدر چھوٹا تھا کہ گولکنڈے کے اکثر مدبر اس کے لیے تیار نہ تھے اس لڑکے کی عمر سات سال تھی۔ فرشتے کا بیان ہے کہ وہ صرف دو سال کا شیرخوار بچہ تھا، گو یہ عمر صحیح نہیں ہے، لیکن سات سال کی عمر میں بھی وہ حکومت کے قابل نہ تھا، اس لیے جب سبحان قلی تخت نشین کیا گیا تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بلقیس زماں نے سیف خاں عین الملک کو احمد نگر سے بلا کر وکالت اور پیشوائی کی خدمت جلیلہ تفویض کرنے کی کوشش کی۔ غالباً سیف خاں گولکنڈے کا پرانا متوسل تھا، ممکن ہے کہ شاہی خاندان سے اس کا تعلق ہو، اور جمشید قلب شاہ کے طرز عمل سے بیزار ہو کر احمد نگر کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔ اس وقت یہ کوشش

اس کے بھائی جو انتقام کے لیے آئے تو ان کا بھی یہی حشر ہوا نیز فرشتے نے ایک دچھپ بات یہ لکھی ہے کہ اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کا علم جس کو دکن میں "بیرق" کہتے ہیں، حاصل کر لیا، اور اس کو اپنا نشان فتح سمجھ کر گولکنڈہ لے گیا، اور اسی کو اپنی سلطنت کا پرچم بنایا (تاریخ فرشتہ روضہ چہارم ص ۱۷۰) لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیم کی اولوالعزم زندگی اس چھوٹی سی جھڑپ اور کامیابی کو کہاں تک اپنا سرمایہ حیات سمجھتی تھی! گولکنڈے کی تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔



کیلگی کہ سبحان قلی کے سن رشد کو پہنچے تک عین الملک کی مدد سے حالات بدستور قائم رکھے جائیں اور امور سلطنت خوش اسلوبی سے انجام پائیں۔

ان حالات میں اگر سبحان قلی اچھی عمر کا ہوتا تو غالباً جمشیدی دور حسب حال رہتا، لیکن اس کی کمسنی کی وجہ سے ارباب سیاست کا ایک بڑا طبقہ اس حکومت کا مخالف ہو گیا۔ جگدیوراؤ جگپت راؤ بھری خاں جملہ الملک اس زمانے کے بڑے عمائد تھے اور ان میں جگدیوراؤ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ سبحان قلی کا دشمن نہیں تھا، بلکہ اس کی کمسنی سے ڈر کر دوسرے ورثا کو تخت دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں جگدیوراؤ کی رسم تخت نشینی ادا ہو رہی تھی اور سیف خاں عین الملک ابھی احمد نگر سے نہیں آیا تھا۔ یہ عمائد سلطنت اپنے منصوبے کی پخت و پز کرنے لگے، اور کوشش کی کہ سیف خاں کے آنے سے پہلے اپنے منصوبے کی تکمیل کر لیں۔ جگدیوراؤ نے اپنے ساتھیوں کو دولت قلی کے لیے آمادہ کر لیا۔ یہ منصوبہ اس طرح اچھا تھا کہ دولت قلی کی عمر اس وقت کافی تھی، اور سبحان قلی کے مقابلے میں یہ زیادہ لائق تھا، اور اس کا ٹھکانا سلطنت سے قریب تھا، یعنی بھونگیر کے قلعے میں قید تھا۔ لیکن ابراہیم کے مقابلے میں اسے کوئی اہمیت نہ تھی، ابراہیم زیادہ لائق تھا، بچپن سے اس کو ذمہ دارانہ کام تفویض کیے گئے تھے، اور دولت قلی اپنی بد اعمالی کی بنا پر سلطان قلی قطب شاہ کے جہد سے قید تھا، اور جمشید کے عہد میں تو اس کی قید اور بھی سخت کر دی گئی تھی، اور ملک میں اس کے کوئی ہمدرد بھی نہ تھے۔ اس بنا پر جگدیوراؤ اور اس کے شرکار کا بجائے دولت قلی کے شہزادہ ابراہیم کو اپنا مرکز خیالی بناتے تو بہتر ہوتا، اور کئی خانہ جنگیوں کا سبب ہو جاتا جو ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت ہونے والی تھیں۔ کیونکہ سبحان قلی اور اس کے ہمدرد سیف خاں عین الملک کی طاقت کے مقابلے میں دولت قلی کو بھونگیر کے قلعے سے باہر نکال کر تخت نشین کرنا آسان نہ تھا، اس کوشش میں خانہ جنگی کا سامان ہو گیا، اور سیف خاں کے آنے سے پہلے

جگدیوراؤ، اپنی طاقت کے ساتھ بھونگیر پہنچ گیا۔ اس نے قلعے کی فوج اور نائکو اڑیوں کو اپنے ساتھ ہموار کر لیا، اور قلعہ دار کو اپنا ہم خیال بنا کر دولت قلی کو قید سے باہر نکالا، اور بھونگیر میں اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر مضبوط کرنے کے لیے بھونگیر کے آس پاس کئی قلعے فتح کر لیے اور اپنا قدم جمالیاب جگدیوراؤ کو عین الملک کا سخت مقابلہ کرنا تھا، لیکن اس دوران میں سیف خاں عین الملک گولکنڈہ پہنچ گیا کچھ تو سبحان قلی، اور اس کی ماں بلقیس زماں کی تائید، اور کچھ اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لیے عین الملک کا فرض تھا کہ جگدیوراؤ، اور اس کے امیدوار دولت قلی کو مغلوب کرے، چنانچہ اس کام کے لیے گولکنڈے کی بڑی فوج ترتیب دی گئی اور سیف خاں کی سرکردگی میں اس کی نقل و حرکت شروع ہوئی۔ اگرچہ جگدیوراؤ اس وقت کئی قلعوں پر قابض تھا لیکن گولکنڈے کی شاہی فوج کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی اس نقل و حرکت سے گھبرا کر جگدیوراؤ نے قریب کی عماد شاہی سلطنت سے مدد مانگی ظاہر ہے کہ دکن کی باہمی رقابت ہمیشہ ایسی امداد کے لیے تیار رہتی تھی، چنانچہ عماد شاہی سلطنت کا مشہور سپہ سالار تغال خاں جگدیوراؤ کی امداد کے لیے آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف خاں نے اس فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ بھونگیر نہ پہنچ سکے، اور جگدیوراؤ کی طاقت نہ بڑھے۔ سیف خاں کی یہ تدبیر کامیاب ہو گئی، عماد شاہی فوج شمال سے بھونگیر کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی کہ سیف خاں نے گولکنڈے سے بڑھ کر موضع شکریم پر اس کا راستہ روکا، اور اس موقع پر جو گھمسان کا معرکہ ہوا ہے وہ تاریخ کے الفاظ میں:—

۳۵

”دیر پہنچ زماں سلاطین و بادشاہ عظیم الشان بہ آن مشاہدہ کارزار نشان ندادہ اند“

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت لڑائی تھی اور اس میں بے شمار سپاہی کام آئے تھے عین الملک کامیاب ہو گیا

۱۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔

۲۔ موضع شکریم کریم نگر سے جانب جنوب سات میل کے فاصلے پر واقع ہے، اس کے ارد گرد پہاڑیاں ہیں۔

۳۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔

اس کے بعد قلعہ بھونگیر میں جگدیوراؤ کی منفرد طاقت کا مقابلہ کرنا اس کے لیے بہت  
 نے بھونگیر کی طرف راہ فرار اختیار کی تو عین الملک نے اس کا تعاقب کیا۔ بھونگیر کے  
 محاصرہ شروع کر دیا۔ تنہا خاں کی منہزم فوج قلعے کے اندر محصور ہو گئی تھی چونکہ بھونگیر کا  
 عین کو قلعے پر سے وار کر نیا اچھا موقع ملتا ہے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جگدیوراؤ کے  
 دست نقصان پہنچنے لگا، اور اس قدر نقصان پہنچا کہ عین الملک نے صلح کر لینی کوشش کی  
 دیا، حالانکہ جگدیوراؤ کے لیے یہ اچھا موقع تھا اس انکار سے عین الملک نے مواہرہ  
 ۱۷ تاریخ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اگر صلح ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے  
 صوبہ بن کی رسد گھٹنے لگی اور یہ اپنی رسد سے اس قدر تنگ ہوئے کہ بالآخر  
 کے دروازے کھول دیے اور عین الملک سے ان طلب کی لبیکین دولت قلی کی  
 قید کر دیا گیا، اور جگدیوراؤ کو پابہ زنجیر کر کے گولکنڈے کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔



سلطان ابراہیم علی قلیب شاہ

# پانچواں باب

## ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی

عین الملک کی کامیابی سے جس کا گذشتہ باب میں ذکر ہوا ہے، ایک خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا، لیکن آئندہ حالات نے سیاسی فضا کو اور پیچیدہ بنایا۔ یہ پیچیدگی ابراہیم کے لیے فائدے سے غالی نہ تھی۔ جب عین الملک جھونگیر کے معرکے سے واپس ہوا تو اپنی اس کامیابی اور اپنے غیر معمولی اقتدار کے باعث بہت مغرور ہو گیا، اور گولکنڈہ کے عمائد اور خاندانی امرا کے ساتھ جابرانہ برتاؤ کرنے لگا۔ اس سے تمام امرا و عمائد سلطنت مکر رہنے لگے اور سب کی نظر ابراہیم قطب شاہ پر پڑنے لگی۔ عین الملک کے جابرانہ سلوک سے متنفذ ہو کر اہل گولکنڈہ نے محل پر حملہ کر کے دولت خانہ لوٹ لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک نئے انقلاب کے متقاضی تھے جن تو قعات سے مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں، سبحان قلی کی بادشاہی کے لیے تیار ہوئے وہ اب پادشہ ہو کر رہ گئے چنانچہ ان سنجیدہ شخصیتوں کے سامنے جو ملک کے حقیقی ہی خواہ تھے بوائے شاہزادہ ابراہیم کے اور کوئی مرجع امید باقی نہیں تھا۔ حکومت کے ممکنہ تجربے ہو چکے تھے سلطنت کے تمام امیدواروں کو انا لیا گیا جو لائق شخصیتیں

---

۱۔ فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے اہل گولکنڈہ کی شورش پر زور دیتا ہے جو سبحان قلی کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی (تاریخ فرشتہ روضہ چہارم ص ۱۷۰)۔

۲۔ تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے مطلق سلطنت کو بالائے طاق کر کے اختیارات خود حاصل کر لیے تھے (تذکرۃ الملوک غانی ص ۱۷۰)۔

امورِ سلطنت کی اہل سمجھی گئی تھیں وہ غدار ثابت ہوئیں۔ اس لیے ان تمام تجربوں کے بعد یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت سلطنت گولکنڈہ کے لیے شہزادہ ابراہیم ہی تنہا ناخداۓ سیاست ہو سکتا ہے چنانچہ مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں نے فوراً ابراہیم کو گولکنڈہ آئیگی دعوت دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اس وقت ابراہیم نہ آئے تو گولکنڈہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر منتشر ہو جائیگا۔ مصطفیٰ خاں کی اس جنبش پر دیگر عمائد بھی چپکے چپکے اتفاق کرنے لگے اور ابراہیم کو اپنے ارادے سے واقف کرادیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ابراہیم کی خدمت میں کئی عراض پہنچ گئیں کہ گولکنڈہ سبحان قلی کی بادشاہی سے راضی نہیں ہے اور سیف خاں عین الملک نے امر کو تنگ کر رکھا ہے، عین الملک اور جلدیو راؤ کی باہمی کشش سے ملک کو علحدہ نقصان پہنچ رہا ہے، اس لیے ملک کی نجات آپ کے ہاتھ میں ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو جنبش مرکزی حکومت میں ہو رہی تھی وہ بہت جلد ملک کے دوسرے گوشوں میں بھی محسوس ہونے لگی۔ ابھی ابراہیم بیجا نگر سے نکلا نہیں تھا کہ کوئل کنڈے کے باشندوں نے اس موقع پر ابراہیم کی مدد کرنا اپنا فرض عین سمجھا۔ کوئل کنڈے کی انڈیرہ آبادی میں سلطنت کی یہودی کا یہ احساس اور مردم شناسی حیرت سے خالی نہیں ہے کہ ان لوگوں نے سلطنت گولکنڈہ کے مستقبل کا لحاظ کر کے دوسرے دعویداران سلطنت کو نظر انداز کر دیا اور شہزادہ ابراہیم کو

۱۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳۔

۲۔ کوئل کنڈے کے قلعے میں حال میں جو کتبہ دریافت ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کوئل کنڈہ نے اپنے طور پر ابراہیم کو مدد دینے کی تیاری کی تھی۔ کتبے میں دو نام آتے ہیں ایک پیر و میاں دوسرے سید علی میاں جو اس پاکیزہ منصوبے کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں نے کوئل کنڈے کے تمام سپاہی اور عہدہ داروں سے ابراہیم کی تائید کا سخت وعدہ لیا، اور قسم لی کہ وہ ابراہیم کے معاملے میں سبحان قلی اور دولت قلی کی تائید نہ کریں گے۔ جب اس طرح تیاری ہو گئی تو انھوں نے ابراہیم کو اپنے پاس بلایا تھا (رپورٹ آئٹار قدیمہ ۱۳۳۸ء)۔ کوئل کنڈہ محبوب نگر سے چودہ میل کے فاصلے پر جانب جنوب مغرب واقع ہے۔

ترجیح دی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کو مرکزی حکومت کی سازش سے ضرور فائدہ پہنچا لیکن کوئل کنڈے کی امداد کو بھی جو بروقت حاصل ہوئی تھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ابراہیم کی تمام تر پیشقدمی جو پانگل سے شروع ہوئی تھی، اہل کوئل کنڈہ کی امداد پر منحصر تھی ابراہیم نے اسی جگہ اپنی طاقت بڑھائی اور اس کو اتنا اطمینان ہو گیا کہ اس نے بلا کھٹکے مرکزی حکومت کا رخ کیا، اور تخت پر قبضہ کر لیا۔

جب گولکنڈے سے مختلف عرایض ابراہیم کے پاس پہنچیں تو اس نے اپنے ہمدردوں سید جی خان اعظم، اور حمید خاں کے مشورے سے گولکنڈے کی طرف کوچ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ قدرت نے ابراہیم کے لیے خاص حالات پیدا کر دیے جو اس کے حصول سلطنت کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے، ورنہ ہمیشہ قطب شاہ کی اس قدر جلد موت واقع نہ ہوتی اور ابراہیم قطب شاہ کو گولکنڈے کی سلطنت حاصل کر نیکا موقع نہ ملتا تھا ہر جگہ جب ابراہیم و بیجا نگر کی طرف بھاگا تھا تو اس کے ذہن میں حصول سلطنت کی کوئی امید نہ ہوگی اور نہ ان حالات کا وہم و گمان ہو گا۔ ان تمام سازشوں کے باوجود جو اس کی تائید میں پختہ ہو گئی تھیں کئی مشکلات باقی تھیں اور گولکنڈہ پہنچ کر تخت سلطنت پر قدم رکھنے تک مختلف زحمتوں کا سامنا کرنا تھا، اور یہ مشکلات اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ضرور ڈراتی ہونگی۔ رام راج کی مخالفت تو تاریخ سے معلوم ہوتی ہے جو درحقیقت ہمدردی پر مبنی تھی آئندہ خطرات کی پیش بندی کر کے جو حصول سلطنت کے راستے میں حائل تھے، رام راج ابراہیم کی پیشقدمی نامناسب سمجھتا تھا۔ لیکن ابراہیم کی اولوالعزمی ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی اور اس کے ساتھی حمید خاں اور سید جی جنھوں نے اپنی تمام عمر ابراہیم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی، ہر خطرے کے لیے آمادہ تھے۔ انھوں نے نہایت جرات کے ساتھ شہزادے کو نفل و حرکت کے لیے کھڑا کر دیا۔ اس طریقے سے یہ جلا وطن گولکنڈے کے سفر کے لیے آمادہ ہو گئے تو رام راج نے اپنے دبیرینہ روابط اور فاشکاری کے لحاظ سے شہزادہ ابراہیم کی مدد کی اور اپنے بھائی نکنار اسے کی سرکردگی میں اس نے دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل کی ایک بڑی فوج پیش کی اور شہزادے کے ساتھ جانی کا حکم دیا۔ لیکن حمید خاں اور سید جی کی حمیت نے اس امداد کو گولہا

نہیں کیا۔ یہ لوگ رام راج کی امداد کے بغیر آمادہ سفر ہو گئے۔

ابراہیم قلعہ شاہ اور اس کے ساتھی ویجیانگر سے کوچ کر کے سب سے پہلے پانگل پہنچے جو اس زمانے میں سلطنت ویجیانگر کے حدود میں داخل تھا، تلنگانہ کی سرحد پر ہونکی وجہ سے یہ ایسا مقام تھا جہاں سے گولکنڈے کے سیاسی ماحول کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا تھا۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ یہاں ہر حرکت کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چند روز قیام کر کے دور سے تمام سیاسی فضا کا مطالعہ کیا، اور یہ دریافت کیا کہ ملک میں ان کا کہاں تک خیر مقدم ہو سکتا ہے اور پانگل سے اس نے تمام تلنگانہ میں اپنے آئین کی خبر پہنچا دی۔

بیا کہ راہت منصور بادشاہ رسید      نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید

جمال بخت ز روئے ظفر نقاب انداخت      کمال عدل بہ فریاد و ادخواہ رسید

جب لاسکی پیاموں کی طرح اس کی آمد آمد کی خبریں دور دور پہنچنے لگیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام تلنگانہ کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق جوق بادشاہ کی دید کے لیے آنے لگے کہ گویا اس کے خیر مقدم کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ابراہیم کے ارد گرد تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل جمع ہو گئے اور اس پر طرہ یہ کہ اسی جگہ اس کو کوئل گنڈہ کی غیبی امداد کی خوشخبری پہنچائی گئی۔ یہاں گولکنڈے سے مصطفیٰ خاں اور

۱۔ تاریخ قلعہ شاہی ص ۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵۔ تاریخ قلعہ شاہی ص ۱۳۵۔

۲۔ فرشتے کا بیان یہ ہے کہ جب ابراہیم کی جماعت تلنگانہ کی سرحد پہنچی ہے تو سب سے پہلے مصطفیٰ خاں اس سے آکر ملا، اور ابراہیم نے اس کی قابلیت اور اعلیٰ خدمات کا اعتراف کر کے اس کو میر جملہ کی خلعت عطا کی، اور مصطفیٰ خاں کا کچھ ایسا اثر تھا کہ لوگ ابراہیم کی بادشاہی کے لیے راضی ہو گئے اور اس نے ہندو تاجروں سے دو لاکھ روپے قرض لیکر ضروری مصارف کا انتظام کیا تھا (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۰)۔ ممکن ہے کہ مصطفیٰ خاں کی ملاقات پانگل میں



اس کے بعد سلاطین خاں بھی تین ہزار فوج کے ساتھ ابراہیم کی امداد کے لیے آگئے اور ان کے پیچھے کئی امرا پہنچ گئے اور اس طرح ابراہیم کے پاس سات ہزار فوج جمع ہو گئی۔

پانگل کے بعد ابراہیم قطب شاہ کا دوسرا مقام کوئل کنڈہ تھا جہاں یہ قطب شاہی کاروان صد ہا امیر و بہیم کے ساتھ نازل ہوا اگرچہ اس وقت کوئل کنڈے کی حیثیت ایک معمولی موضع سے زیادہ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو ابراہیم قطب شاہ کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ قوان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانے میں کوئل کنڈے کا قلعہ فوجی مستقر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں سے مملکت کے جنوبی حصوں پر گرفت رکھی جاتی تھی تاکہ سلطنت و بیجا نگر کی ہر پیش قدمی کا بروقت سد باب ہو سکے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت یہ کوئل کنڈہ اپنے تمام اعضاء سیاسی کے ساتھ ابراہیم کی مدد کے لیے تیار ہو گیا، اور سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم کی تمام کامیابی کچھ اسی تائید کی وجہ سے تھی، ورنہ اس کی پیش قدمی کوئل کنڈے تک کچھ آسان نہ تھی۔ اس قلعے کے گتے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی آمد سے یہاں پر ایک سنسنی پھیل گئی، اور اس کی امداد کے لیے ایک زبردست اتحاد ہو گیا، تمام سپاہی اور نانکواڑی جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اس سیاسی خدمت کے لیے تیار ہو گئے اور یہ اپنا فرض سمجھنے لگے کہ ابراہیم گولکنڈے کے تخت پر بٹھادیں۔ یہ ایسا خوشگوار ماحول تھا کہ اس قطب شاہی جماعت کو یہاں آنیکے بعد یہ محسوس ہوا کہ ان کی منزل مقصود یہی ہے۔

---

ہوئی ہو، اور اسی جگہ اس کو خلعت عطا ہوئی ہو۔ لیکن یہ کہنا کہ اہل گنگنجانہ محض مصطفیٰ خاں کے اثر سے ابراہیم کی بادشاہی کے لیے تیار ہوئے تھے صحیح نہیں ہے، گو مصطفیٰ خاں کی سیاسی اور مالی امداد سے جو بروقت ہوئی تھی، اور ممکن ہے کہ کوئل کنڈے کے اہم اتفاق میں بھی اس کا ہاتھ ہو، لیکن اس بات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس تمام سیاسی ہل چل میں خود ابراہیم کی زبردست شخصیت بھی کام کر رہی تھی اور دوسرے دعویداران سلطنت کے مقابلے میں اپنا لوہا منوار ہی تھی۔

کیونکہ یہ ایسی اچھی پناہ گاہ تھی کہ اگر ابراہیم کو اپنی پیشقدمی میں گولکنڈہ کی دیواروں کے پاس شکست بھی ہو جاتی تو وہ یہاں واپس آکر دم لے سکتا اور پھر قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ اس لیے ابراہیم یہاں بہت دنوں تک ٹھہرا رہا، اور ممکنہ طاقت فراہم کی غالباً یہاں وہ دو مہینے رہا، اس دوران میں اس کو باہر سے بھی بہت کچھ مواد فراہم ہوتا رہا۔ چار ہزار جنگجو سوار جو امراتہ و خوانین پر مشتمل تھے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے، ان میں اکثر گولکنڈہ کے اکابر تھے جو ابراہیم کے لیے دوڑے آئے تھے۔

ابراہیم قطب شاہ کی روز افزوں طاقت، مرکزی حکومت کو بہت خوف دلارہی تھی اور اس کا اثر اس قدر چھا رہا تھا کہ ہر طبقہ اپنے مستقبل کی سوچ رہا تھا جو لوگ اس وقت سبحان قلی اور عین الملک کے رسمی ہوا خواہ تھے وہ نئے تاجدار کے لیے بیتاب ہو گئے، اس لیے عین الملک کے لیے مدافعت کا سامان کرنا ضروری ہو گیا۔ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے بھری خاں جگپت راؤ حاجی خاں سرنوبت اور اخلاص خاں حبشی متعین کیے گئے، اور عین الملک کے ساتھ پیشقدمی کی غرض سے خداوند خاں حبشی، علم خاں، بھڑخاں، مقبول خاں اور تاج خاں رکھے گئے، اس طریقے سے یہ مدافعتی فوج گھنپور پہنچ گئی لیکن عین الملک کے کوچ کرتے ہی یہ معلوم ہوا کہ خود گولکنڈہ میں سازش ہو گئی۔ اکثر نائکواڑی ابراہیم کی امداد کے لیے تیار ہو گئے، یہاں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ابراہیم کی خدمت میں ایک متفقہ درخواست اس مضمون کی روانہ کی کہ اگر آپ جگدیوراؤ کو قید سے رہا کرتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کے لیے آمادہ ہیں اور آئندہ امید میں جگدیوراؤ کو قید سے رہا کر دیا اور جو لوگ ابراہیم کے مخالف تھے وہ اکثر قتل کر دیے گئے چنانچہ بھری خاں، اخلاص خاں اور حاجی کے سرنیزوں پر چڑھا کر شہر میں گھمائے گئے۔ خود سبحان قلی کو قید کر دیا گیا، اور شاہی خزانہ اپنے قیفے میں لے لیا گیا۔ اس ضروری انتظام کے بعد ان لوگوں نے ابراہیم کو گولکنڈہ آئیںکی دعوت دی۔ اس طریقے سے ابراہیم کے لیے گولکنڈہ تک تمام

راستے صاف ہو گئے اب عین الملک کے لیے کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی، کیونکہ ان دوز بردست طاقتوں کا مقابلہ اس کے قابو سے باہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان حالات سے مجبور ہو کر اس نے ابراہیم سے معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن ابراہیم سمجھتا تھا کہ عین الملک اس کا کبھی دوست نہیں ہو گا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:۔

”استدعائے عین الملک از صمیم قلب نہ بود“

چنانچہ ابراہیم نے اس کو آئینگی اجازت نہیں دی بلکہ اس کو لکھا کہ میں خود آ رہا ہوں وہاں ملاقات ہو جائیگی اس سے عین الملک بہت گھبرایا اور بھاگنے کے سوائے اس کے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم قطب شاہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔ پانچ ہزار سوار اور چند سرداروں کے ساتھ جو اس کے ہمراہ تھے کو اس کے راستے سے سلطنت گولکنڈہ کی سرحد سے باہر چلا گیا۔ غلبہ یہ ہے کہ وہ سلطنت برار میں سکونت پذیر ہوا۔ اگرچہ عین الملک کے جانے سے نقصان ضرور تھا، اس کے اغوا سے گولکنڈہ کے بعض دیرینہ آدمی اس کے ساتھ چلے گئے اور بہت سا قطب شاہی سامان اس کے ساتھ فائب ہو گیا، لیکن اس کے فرار ہونے سے ابراہیم کی رہی سہی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے راستے میں عین الملک کی تنہا مزاحمت باقی رہ گئی تھی جو گولکنڈہ کے راستے میں کسی جگہ خونریزی کا باعث ہوتی لیکن اب مطلع بالکل

---

۱۔ تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے کوئل کنڈے کا محاصرہ کر لیا تھا، لیکن جب گولکنڈہ کی سازش کی اطلاع ملی تو پانچ ہزار قطب شاہی سواروں کے ساتھ کولاس کے راستے سے ملک کے باہر بھاگ گیا (تذکرۃ الملوک خانی ص ۱۳۹)۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، لیکن تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ اس نے گھنپور سے ابراہیم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ ”بندہ کو آستان بوسی کی اجازت دیجائے“ (تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۷)۔

۲۔ تاریخ قطب شاہی ص ۷۶۔

صاف تھا جگدیو راؤ کی ایک آدم بغاوت جو ابراہیم کے تخت نشین ہونے کے بعد ہوئی، وہ آسانی سے فرو ہو گئی۔ جب امین خاں دبیر نے کوئل کنڈہ آکر مین الملک کے بھاگنے کا ذکر کیا، اور گولکنڈے کے تمام حالات بیان کیے تو ابراہیم نے کوچ شروع کر دیا۔<sup>۱</sup>

قطب شاہی خاندان کے حقیقی وارث تخت کا سات سال کی جلا وطنی کے بعد گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے آنا۔ تلنگانے کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا جس کا اندازہ آج چار سو سال کے بعد نہیں کیا جاسکتا! اس نوجوان بادشاہ کی آمد سے جو اپنے تمام شاہی اوصاف کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین تھا تلنگانے کے جسدِ مردہ میں جان آگئی۔ تمام اہل گولکنڈہ اس وقت سے شیم براہ تھے جبکہ پانگل میں اس کا نزول اجلال ہوا تھا، ان چند مخالفوں کو چھوڑ کر جو یا تو قید تھے یا شہر بدر ہو چکے تھے، گولکنڈے کا پچھ پچھ انتہائی شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسرت کی جولہریں کئی مہینوں سے پانگل کی سرحد سے تمام تلنگانے کے طول و عرض میں منتشر ہو رہی تھیں، آج ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں۔ شاعر قصید ہائے مبارکباد لکھ رہے تھے، گوئیے مسرت کے گیت گارہے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ جب ابراہیم قطب شاہ کا جلوس گولکنڈے کے قریب پہنچا تو عام لوگوں کے علاوہ تمام اکابر سلطنت استقبال کے لیے قلعے کے باہر موجود تھے جگدیو راؤ اور دوسرے ناگوار یوں نے قلعے کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعے میں تشریف لانے کی درخواست کی چنانچہ ۱۲ رجب ۹۹۹ھ کو دو شنبہ کے دن رسم تخت نشینی ادا کی گئی جو گولکنڈے کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا کیونکہ آج سات سال کا تاریک دور اور خانہ جنگیاں ختم ہو گئی تھیں۔ یہ وہ تاریخ تھی جو سلطنت گولکنڈے کو آئندہ غیر معمولی ترقیوں کا پیام دے رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کی اصل تعمیر ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئی جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جا کر مکمل ہوئی اگر ابراہیم قطب شاہ کو

تاریخ گوگلڈہ

لکہ حالات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا  
ثبوت دیا تھا مناصب جلیلیہ سے

# پہچٹا باب

## سلاطین دکن کی باہمی کشمکش

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے گوکنڈے کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کو دور استحکام سمجھنا چاہیے۔ تاسیس کے بعد ہر سلطنت کو انتظامی اور دفاعی بندوبست کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ مستقل بنیادوں پر کھڑی ہو، اور حکومت کے فرائض خاطر خواہ انجام دے اس کی بقا ہی استحکام میں ہے۔ گھر کے اندر اچھا نظم و نسق قائم کیا جائے تاکہ ملک میں امن و امان نصیب ہو، اور اہل ملک کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے ضروری مواقع ہاتھ آئیں۔ دوسری طرف بیرونی خطروں سے ملک کی حفاظت ہو سکے۔ ابراہیم قطب شاہ سلطنت گوکنڈے کا معمار ہے اس میں سیاست کی خدا داد قابلیت تھی نیز یورپیا نگر کی جلا وطنی سے اس کی نظریں ایسی وسیع ہو گئی تھیں کہ وہ اب سیاست کے تمام ہتھکنڈے جانتا تھا۔ اس کو ابھی طرح معلوم تھا کہ ملک میں کہاں استحکام کی ضرورت ہے، اور ہمسایہ سلطنتوں کے مقابلے میں کیا مدافعتی مسلک اختیار کرنا چاہیے تاکہ گوکنڈے کی سلطنت محفوظ رہے، اور اس کو آگے بڑھنے کا موقع ملے اس کو شروع ہی سے اس بات کا بھی تجربہ تھا کہ سلطنت کو نظم و نسق کے زیور سے کس طرح سنوارنا چاہیے مصطفیٰ خاں اردستانی کو جس نے ابراہیم کے ساتھ پوری وفاداری کی تھی، بہت ترقی دی گئی۔ بادشاہ نے اپنی بہن سے مصطفیٰ خاں کی شادی کر دی جو بہت بڑی عزت تھی اور تمام امور سلطنت اس کے سپرد کر دیے اس کو ہر جگہ خان اعظم رکن السلطنت لکھا جاتا ہے، غالباً خان اعظم اس کا خطاب تھا، اور اس وقت تو یہ سلطنت کا میر جملہ بنایا گیا، اور بعد کو ترقی کر کے پیشوا ہو گیا اس تمام عہد میں مصطفیٰ خاں کی سیاست چھائی ہوئی تھی اور ہر معاملے میں اس کے مشورے شریک حال تھے۔

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد دکن کا سیاسی مطلع بیدار آلود ہو گیا، اور دکن کی سلطنتوں میں  
 بین المملکتی لڑائیاں اس قدر زور و شور سے شروع ہوئیں کہ ان کی روک تھام بہت مشکل ہو گئی قطب شاہی سلطنت ان سیاسی  
 الجھنوں سے کنارہ کش نہیں رہ سکتی تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے پیشروؤں نے سیاست دکن سے متعلق کوئی ایسا خارجی مسلک  
 اختیار نہیں کیا تھا جو سیاسی دوراندیشی کے ساتھ مستقبل کی صحیح رہنمائی کر سکتا۔ اگرچہ جمشید قطب شاہ نے احمد نگر سے رشتہ اتحاد  
 جوڑنے کی کوشش کی تھی اور برہان نے برید کے مقابلے میں گولکنڈے کی مدد بھی کی لیکن اس کو مستقل مسلک نہیں کہا جاسکتا۔  
 غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیم سے پہلے دکن کے بین المملکتی تعلقات اس قدر پیچیدہ نہیں تھے اور نہ گولکنڈے کو ان الجھنوں میں  
 پڑنے کی کوئی ضرورت تھی لیکن ابراہیم کے عہد میں دکن کے بین المملکتی تعلقات بہت پیچیدہ ہو گئے۔ بیجا پور کے تخت پر  
 ابراہیم عادل شاہ اول ٹکھن تھا، اور احمد نگر میں برہان کا بیٹا حسین نظام شاہ اول ابھی ابھی تخت نشین ہوا تھا۔  
 چونکہ سلطنتیں پاس پاس واقع ہوئی تھیں اور یہ ایک دوسرے کی رقیب تھیں اس لیے ایک کا دوسرے پر اثر پڑنا  
 لازمی تھا۔ بعض سلطنتوں کے درمیان آئے دن سرحدی نزاعیں ہوتی تھیں جو ہر سلطنت کے لیے مہلک تھیں چنانچہ  
 ضلع شولا پور و کلیان کے لیے احمد نگر اور بیجا پور میں بارہا لڑائیاں ہوئیں اور فریقین نے اپنی امداد کے لیے دوسری  
 سلطنتوں کو بھی دعوت دی، اور اس میں بیجا پور کی ہمیشہ زیادتی تھی۔ وچیا نگر کی ہندو سلطنت نے بیجا پور کی  
 تائید میں احمد نگر کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ان حالات میں گولکنڈے کو اپنا ایک خارجی مسلک شخص کرنا ضروری تھا۔  
 ابراہیم قطب شاہ نے وسیع نظریاتی تھی، مصطفیٰ خاں کے سیاسی مشوروں سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلے تو بیجا پور کے مقابلے میں  
 احمد نگر کی تائید کرنی چاہیے کیونکہ آخر الذکر سلطنت بیجا پور کی بہ نسبت بہت کمزور تھی اور اس کو بیجا پور سے بہت  
 نقصان پہنچ رہا تھا، اور وچیا نگر کی وجہ سے تو اس کو اس قدر نقصان پہنچا کہ برسوں تک اس کی تلافی نہ ہو سکتی تھی۔  
 اس طریقے سے دکن کا توازن معرض خطر میں تھا۔ اگر احمد نگر کی سلطنت بالکل مغلوب ہو جاتی تو بیجا پور کا پلہ بھاری  
 ہو جاتا، اسی صورت آئندہ گولکنڈے کے لیے بھی خطرے سے خالی نہ ہوتی۔ اس طرح یہ گولکنڈے کا فرض تھا کہ  
 بیجا پور کی مخالفت اور احمد نگر کی کمزور سلطنت کی مدد کرے۔ مصطفیٰ خاں کی دوراندیشی کی بدولت ملک کا یہ مستقل مسلک

قرار دیا گیا، اور اس کی پابندی کی گئی۔

اس اتحاد کے لیے خود گولکنڈے کی طرف سے پیشقدمی کی گئی۔ مصطفیٰ خاں کو احمد نگر بھیجا گیا، اور باہمی اتحاد کی تجویز پیش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلک احمد نگر کے لیے بھی بہت مفید مطلب تھا، چنانچہ اس کا بڑا بیڑہ مقدم کیا گیا۔ چونکہ اتحاد کے لیے بالمشافہ گفتگو بہت اچھی ہوتی ہے اس لیے ۱۶۹۵ء میں ابراہیم قطب شاہ اور حسین نظام شاہ والی احمد نگر گلبرگہ کے باہر ملے اور اتحاد قائم کیا گیا۔ اس ملاقات میں یہ طے ہوا کہ متحدہ ملتان کر کے گلبرگہ اور بیدر عادل شاہی سلطنت سے حاصل کیے جائیں۔ دوسرے جنوب کی سلطنت دیچیانگر کا خاتمہ بھی قطب شاہی مسلک کا ایک بڑا ضمیمہ تھا۔ اس سلطنت کا دائمی خطرہ نہ صرف دکن کی ہر سلطنت کے لیے موہاں روح تھا بلکہ دوسری خرابی یہ تھی کہ دکن کے مسلمان سلاطین اپنے آپس کی رقابت میں دیچیانگر کو اپنا شریک کار بناتے تھے، چنانچہ دیچیانگر کی شرکت سے بعض غیر اسلامی سلطنتوں کو غیر معمولی نقصان پہنچ گیا۔ غالباً ابراہیم قطب شاہ اور مصطفیٰ خاں کی دورانہ پیش سیاست نے پہلے سے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جنوب کی ہندو سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے تو اچھا ہے۔

حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے اتحاد سے احمد نگر کو بہت تقویت ہو گئی اور اس کی بدولت گلبرگہ کا محاصرہ احمد نگر نے اپنے بڑے منصوبے رو بہ راہ کر لینے کی فوراً کوشش شروع کر دی۔ غالباً اسی غرض کے لیے دونوں نے اپنی ملاقات کا موقع محل بھی گلبرگہ تجویز کیا تھا تاکہ اگر یہ چیز طے ہو جائے تو فوراً گلبرگہ کا محاصرہ شروع کر دیا جائے۔ بالمشافہ گفتگو کے بعد دونوں فوجوں نے گلبرگہ کا محاصرہ شروع کر دیا عادل شاہی فوجوں سے جو اس وقت گلبرگہ میں تھیں جنگ شروع ہو گئی چونکہ محاصرہ کرنے والی فوجیں زیادہ تھیں اس لیے عادل شاہی فوجوں پر سختی گزرنے لگی اور شہر کے محصورین بہت پریشان ہوئے اور گلبرگہ سے ہونے میں کوئی بات نہیں تھی اس اڑے وقت میں ابراہیم عادل شاہ نے رام راج والی دیچیانگر کو اپنی امداد کے لیے طلب کیا، اور دیچیانگر سے ایک بڑی ہندو فوج بیجا پور کی امداد کے لیے پہنچ گئی، اور معلوم نہیں کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوتا لیکن رام راج نے ابراہیم قطب شاہ کو اس جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ عادل شاہی تاریخوں میں



اس کا ذکر نہیں ہے، تاہم صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم نے اس وقت رام راج سے مخالفت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اول تو رام راج اور ابراہیم کے پرانے تعلقات تھے، دوسرے بڑی بات یہ تھی کہ گولکنڈے کے جنوبی اور مشرقی حدود دیچیانگر سے ملنے تھے، اور ڈرتھا کہ دیچیانگر کی ہندو فوجیں ابراہیم قطب شاہ کی مخالفت میں جنوب اور مشرق سے گولکنڈے پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ گولکنڈے کے عمائد نے بھی بادشاہ کو یہی رائے دی کہ کنارہ کشی کرنی چاہیے۔ اور رام راج نے بھی یہی لکھا تھا۔ اور یہ ڈر خلافت قیاس نہیں تھا، کیونکہ اسی اثنا میں یہ معلوم ہوا کہ رام راج کا بھائی ملیم راج نے چند عادل شاہی افسروں کے ساتھ گولکنڈے کے حدود میں دست درازی شروع کر دی ہے، یعنی پانگل کے قریب پہنچ کر لوٹ مار کر رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم ابھی ہمہ جہتی مدافعت کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ عادل شاہی فوج کے مقابلے کے لیے اڑ جاتا تو نہ صرف گلبرگے کے مقام پر گھمسان کارن پڑتا، بلکہ اس کی سلطنت کے جنوبی اور مشرقی حصے اس کے ہاتھ سے نکل جاتے۔ اس لیے ابراہیم قطب شاہ نے ایسے موقع پر مددگی سے کام لیکر دونوں پہلو بچانا ضروری سمجھا۔ لیکن اس نے احمد نگر کے اتحاد کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور اخلاقی ذمہ داری ہمیشہ محسوس کی۔ دریائے کرشنا، اوجھیا کے سنگم پر ابراہیم عادل شاہ اور رام راج سے ملاقات کی اور مصالحتی گفتگو سے کام لیکر عادل شاہی اور دیچیانگر کی فوجوں کو رخصت کر دیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ ان حملہ آوروں کو جو احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے اپنی تقریر سے اس طرح متاثر کیا کہ وہ دونوں اپنی سلطنتوں کو واپس ہو گئے۔ اس متحکدے سے ابراہیم نے ایک طرف احمد نگر کو بچا لیا اور دوسری طرف

- 
- ۱۔ ابراہیم زبیری نے بسا تین السلاطین میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ ۲۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۲۔
- ۳۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۴۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ گلبرگے کے محاصرے کے دوران میں جو احمد نگر اور گولکنڈے کی فوجوں نے کیا تھا، مصورین مغلوب ہو رہے تھے تو ابراہیم اپنا تک محاصرہ اٹھا کر گولکنڈہ واپس ہو گیا، تاکہ گلبرگے کے قبضے جسے حسین نظام شاہ کی طاقت نہ بڑھ جائے (تاریخ فرشتہ ص ۱۶۰-۱۶۱) یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

بیجا پور اور دیچیا نگر سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھے، اور ایک موقع پر جبکہ دیچیا نگر میں رام راج کے بھائیوں نے بغاوت کی تو، دیرینہ تعلقات کی بنا پر گولکنڈے کی فوجوں سے رام راج کی مدد بھی کر دی تاکہ اس کی طرف سے دیچیا نگر کو کوئی بدگمانی نہ ہو۔

لیکن ابراہیم عادل شاہ اول کے انتقال سے جو ۹۶۵ھ میں ہوا، سیاسی بساط پھر الٹ گئی۔ اس کا احمد نگر پر حملے جانشین علی عادل شاہ اول ہن کلاہت بڑا سورا تھا، تخت نشین ہوتے ہی اس نے احمد نگر سے پھر پرانی پرغاش شروع کر دی۔ مثولا پور، اور کلیان کا مطالبہ کر دیا، اور دھمکی دی کہ اگر یہ واپس نہ کیے جائیں گے تو احمد نگر پر حملہ ہو گا۔ دیچیا نگر سے دیرینہ اتحاد کو تازہ کر کے پہلے سے حملے کی تیاری کر لی تھی یہ خود دیچیا نگر گیا تھا، اور رام راج کے خاندان سے ایسے گہرے تعلقات پیدا کر لیے کہ جو پہلے نہیں تھے مدام راج کی بیوی علی عادل شاہ کو اپنا بیٹا اور رام راج کی بیٹیاں اس کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ راجہ کے حرم میں اس کی بے تکلف آمد و رفت ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلقات بیجا پور کے لیے بہت خوشگوار تھے، لیکن یہ احمد نگر اور دکن کے توازن قوت کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ دونوں طاقتوں کا احمد نگر پر متحدہ حملہ ہو گیا۔ رام راج نے ابراہیم کو بھی دعوت دی کہ معاہدے کے بہ موجب اس لڑائی میں شریک ہو۔ مصطفیٰ خاں کی رائے سے ابراہیم بھی شریک ہو گیا۔ حملہ آورا احمد نگر پر اس زور سے آئے کہ ان کی ممانعت مشکل ہو گئی۔ احمد نگر کے مشہور جنرل نقال خاں نے انتہائی کوشش کی لیکن مقابلہ بڑا سخت تھا۔ نہ صرف نقال خاں بھاگا بلکہ خود حسین نظام شاہ نے اپنی ماں آمنہ بی بی کو چھوڑ کر احمد نگر سے بھاگ گیا اور دولت آباد میں پناہ لی۔ حملہ آوروں نے احمد نگر کو دل کھول کر لوٹا۔ تمام محلات، باغات اور مزرعے جلا کر خاک کر دیے۔ عمارتیں مہندم ہوئیں اور جلاد گئیں۔ دیچیا نگر کے ہندو سپاہیوں نے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی مسجدوں کو سمار کیا اور قرآن شریف کی توہین کی۔ بیجا پور سے حسین نظام شاہ کو مجبوراً کلیان دے کر صلح کرنی پڑی اور حملہ آور یہ وقت تک احمد نگر سے واپس ہوئے۔

یا تاریخ قطب شاہی کی روایت سمجھ بھی جائے تو ابراہیم قطب شاہ کے بیچ بچاؤ کرنے سے حملہ آور واپس ہوئے قطب شاہی مورخ کہتا ہے کہ ان حملہ آوروں کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ بھی شریک تھا لیکن اس میں احمد نگر کی دشمنی مقصود نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ بظاہر بیجا پور اور دیچیانگر سے بھی اپنے تعلقات قائم رکھے اور احمد نگر کو بھی بچائے۔ مصطفیٰ خاں نے یہی رائے دی تھی ورنہ دیچیانگر دشمن ہو جاتا۔ چنانچہ ایک طرف حسین نظام شاہ اور اس کی ماں بی بی آمنہ کو اطمینان دلایا اور دوسری طرف خفیہ طور پر اہل قلعہ کو رستہ پہنچائی لیکن جب حملہ آوروں نے بڑی اُدھم مچائی تو ابراہیم نے مختلف ترغیبوں سے کام لیکر ان کو احمد نگر سے واپس ہونے کے لیے مجبور کر دیا، اور اپنی سلطنت میں تہ کوئٹہ پٹی یعنی مصطفیٰ نگر اور راج کو دیئے کا وعدہ بھی کیا۔<sup>۱۵</sup>

معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا۔ احمد نگر کے جذبہ انتقام نے پھر وہی مکرر فضا پیدا کر دی جو ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ بیچھلی ہزیمت سے حسین نظام شاہ اس قدر متاثر تھا کہ اس نے بہت جلد انتقام کا سامان کر لیا۔ انتقام لینے کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ بیجا پور کی طرح یہ بھی کسی مملکت سے اتحاد پیدا کرتا، اور اپنی طاقت بڑھاتا۔ اس کے لیے صرف گولکنڈے کی سلطنت ہی ایسی تھی جس سے اتحاد ہو سکتا تھا، یا پُرانا اتحاد زیادہ مضبوط کیا جاسکتا تھا۔ اور اتحاد ازدواجی تعلقات کی بدولت زیادہ مضبوط اور خوشگوار ہوتا ہے۔ اس موقع پر یہی ہوا۔ بیجا پور اور گولکنڈے کی تاریخ پر اعتماد کیا جائے تو خود حسین نظام شاہ نے سلطنت گولکنڈہ سے رشتہ داری پیدا کرنے کی خواہش کی تھی چنانچہ قاسم بیگ حکیم۔ شاہ جعفر جو شاہ طاہر کا بھائی تھا، اور مولانا عنایت اللہ کو گولکنڈہ بھیجا گیا، اور شادی کی سلسلہ معنابی کی گئی۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ احمد نگر سے واپس ہوتے ہوئے ابراہیم قطب شاہ نے خود خواہش

۱۵۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۲۔ لیکن فرشتے کا بیان یہ ہے کہ علی عادل شاہ محاصرے کے دوران میں جبکہ حملہ آور احمد نگر پر قابض ہونے والے تھے ابراہیم قطب شاہ احمد نگر کے قلعے سے فرار ہو گیا، اور گولکنڈہ پہنچ گیا۔ اس کے بجائے سے علی عادل شاہ اور رام راج کو خطرہ محسوس ہوا، اور یہ دونوں محاصرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔  
۱۶۔ بساتین السلاطین ص ۸۶۔

ظاہر کی تھی کہ حسین نظام شاہ کی بیٹی بی بی جمال سے اس کی شادی ہو جائے۔ درخواست خواہ کسی طرف سے ہو۔ بالآخر شادی کی قرارداد ہو گئی اور یہ طے ہوا کہ دونوں بادشاہ قلعہ کلیان کے پاس ملیں اور اسی جگہ شادی ہو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شادی کے بعد قلعہ کلیان پر جو اس وقت عادل شاہی عملداری میں تھا دھاوا کیا جائے۔ ۱۵۶۳ء میں دونوں سلاطین اپنے خدم و حشم کے ساتھ قلعہ کلیان کے پاس پہنچ گئے اور نہایت مسرت کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کی شادی بی بی جمال سے کی گئی اور کئی روز تک جشن رہا شادی کے بعد متحدہ فوجیں قلعہ کلیان پر چڑھ دوڑیں۔ علی عادل شاہ نے مدافعت کے لیے رام راج کو دعوت دی۔ والی ہزار اور والی بیدرامیر برید بھی اس اتحاد میں شریک ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رام راج دو لاکھ پچاس ہزار سوار کے ساتھ مقابلے کے لیے آیا تھا، لیکن اس کو جنگ میں حصہ لیتے ہوئے پس و پیش ہوا، اور غالباً یہ پس و پیش ابراہیم قطب شاہ کی وجہ سے ہو گا، کیونکہ ابراہیم کے ساتھ دیوچیانگر کے پُرائے تعلقات تھے اور ابراہیم نے اس کی اڑے وقت مدد بھی کی تھی۔ لیکن عادل شاہ نے طریقہ عمل کی وجہ سے اس کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا اور ظاہر ہے کہ اس متحدہ مدافعت کی وجہ سے کلیان کے محاصرین پریشان ہو گئے اور دوسری وقت یہ تھی کہ ابراہیم قطب شاہ کو پریشان کرنے کے لیے تلنگھانے پر حملہ ہو گیا۔ رام راج کا بھائی وینکٹ پی اور جگد یو راؤ، عین الملک کنعانی، میاں بدو، چندہ خاں جوگولکنڈے کے باغی تھے پندرہ ہزار سوار کے ساتھ تلنگھانے پر حملہ آور ہو گئے۔ اس عین موقع پر ابراہیم کو اپنی سلطنت کا بچانا ضروری ہو گیا۔ اسی وجہ سے حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ دونوں کلیان کے محاصرے سے پیچھے ہٹ گئے اور اپنے گھر چلے گئے تاکہ پہلے اپنی سلطنتوں کی حفاظت کریں۔ علی عادل شاہ کو پوری کامیابی ہوئی بال غنیمت کے علاوہ جس میں ہاتھی اور گھوڑے تھے اس کو نظام شاہی سلطنت کے علم و نشان، داماد و ماہی مراتب اور

تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۸۔ ۱۵۹ ص ۵۶۔

۱۵۹۔ زبیری کہتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ، عادل شاہی حملے سے ڈر کر بھاگا۔ غالباً یہ صحیح نہیں ہے۔ بہت سے سلاطین اس پر

سبز علم جو نظام شاہی خاندان کا مخصوص علم تھا حاصل ہوئے۔

چونکہ دایمی ایسے راستے سے تھی جہاں دشمنوں کی فوجیں تھیں، اس لیے احمد نگر کا مشہور جنرل مرتضیٰ خاں، تین ہزار سوار کے ساتھ ابراہیم کے ہمراہ ہو گیا لیکن عادل شاہی اور ویجیا نگر کی فوجوں نے اس کا تعاقب ضرور کیا۔ ابراہیم نے اپنے پیچھے منتخب جنرلوں کو جو شیعہ خاں حسن خاں، عزیز خاں، دولت خاں، شیخ محمد اور میاں بھائی بتائے جاتے ہیں، دشمن کے مقابلے کے لیے مقرر کر دیا، اور بڑی لڑائی ہوئی بعض قطب شاہی افسر عرب خاں اور شیخ محمد دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ اسی دار و گیر میں ابراہیم گولکنڈہ پہنچ تو گیا لیکن رام راج اور علی عادل شاہ تارپلی تک جو گولکنڈے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے تعاقب کرتے ہوئے آئے جگد پوراؤ اور عین الملک کنغانی کو تلنگانے میں ناخست و تاراج کے لیے آمادہ کیا۔ اس کے علاوہ رام راج نے مرتضیٰ نگر کے راجہ سری تپا کو پچاس ہزار سوار کے ساتھ مصطفیٰ نگر بھیج دیا، تاکہ وہاں ٹوٹ مار کرے نتیجہ یہ ہوا کہ دار السلطنت کے ارد گرد بھی ٹوٹ مار ہونے لگی۔ چونکہ جگد پوراؤ کے تلنگانے میں پڑنے کے تعلقات تھے ان سے کام لیکر اور رام راج کی عنایتوں کا لالچ دلا کر اس نے کوئل کٹہ گھنپورہ اور پانگل کے نائکو اڑیوں کو اپنے ساتھ فراہم کر لیا، چنانچہ اندر کٹہ کے نائکو اڑی کیسر راؤ نے حکومت سے علانیہ انحراف کر دیا۔ سدی تپا، مصطفیٰ نگر سے اور مشتاب خاں راج مستدری سے دیور آئے اور یہاں کے علاقوں کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے گولکنڈے کو سخت پریشانی ہوئی اور یہ اس کے لیے انتہائی تشویش کا زمانہ تھا۔ ابراہیم نے اپنی پوری قوت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی یہ دیکھ کر اس کا دل بھڑایا کہ اس کے باپ نے اپنے زور بازو سے تلنگانے کے ایک بڑے حصے کو سخر کر کے قطب شاہی سلطنت قائم کی تھی جو ان نازک حالات میں دشمنوں کے ہاتھ میں جا رہی تھی وہ خود مقابلے کے لیے اٹھا، اس کے ساتھ سلاسل میں کچھ خوشگوار واقعات بھی پیدا ہو گئے۔ رام راج کی کامیابیوں سے جو تلنگانے میں ہو رہی تھیں، علی بریدا اور علی عادل شاہ دونوں کو پریشانی ہوئی کہ دکن میں اس کا پلہ

بھاری ہو جائے گا، اور یہ پورے دکن کے لیے خطرناک ہے۔ اس تشویش سے یہ دونوں رام راج سے علیحدہ ہو گئے اور اس کو صلح کے لیے مجبور کیا گیا۔ اس کے متعلق ابراہیم کو اطلاع دی گئی صلح کی گفتگو کے لیے گولکنڈہ سے مصطفیٰ خاں کو بھیجا گیا۔ مصطفیٰ خاں نے ایک طرف جگد یورڈ کو شرم دلائی اور دوسری طرف علی عادل شاہ سے مل کر دکن کے معاملات پر گفتگو کی۔ علی عادل شاہ نے اس کو باریاب کیا، اور اس سید صافی ضمیر کی تقریر دل پذیر سے معاملات سلجھ گئے۔ رام راج کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ پانگل اور گھنپورہ جو قدیم زمانے سے دیچیا نگر کی عکداری میں تھے اس کو دیے جائیں گے، وہ صرف انھیں مقبوضات پر قناعت کرے اور دوسرے علاقوں پر دست درازی سے باز آجائے۔ اس تصفیے کے بعد علی عادل شاہ، علی برید اور رام راج اپنے اپنے گھر چلے گئے، اور مصطفیٰ خاں کامیابی کے ساتھ گولکنڈہ واپس آیا۔

اس سفارت سے واپس آنے کے بعد مصطفیٰ خاں نے ابراہیم کو مشورہ دیا کہ قلعہ گولکنڈہ کو مستحکم کرنا ضروری ہے، کیونکہ قلعے میں مدافعت کا پورا انتظام نہیں تھا۔ قلعے کی جو تاسیس سلطان قلی کے عہد میں ہوئی تھی وہ کافی نہ تھی۔ ان نازک حالات نے جو ابھی گولکنڈہ سے پر گزرے، ثابت کر دیا کہ قلعے کے لیے کس قدر انتظام کی ضرورت ہے۔ بہر حال بڑے اہتمام سے قلعے کی تعمیر شروع ہوئی، مضبوط فصیل اور برج بنائے گئے، گولکنڈہ کا مشہور بالا حصار تیار ہوا۔ یہ فی فصیل کے اندر محل۔ رہائش کے مکان اور بازاروں کا انتظام ہوا۔ اس تعمیر کے لیے منتخب کھمبیر اور مہمار مقرر کیے گئے تھے۔ پہلے خود قلعے کی تعمیر جو آبادی کے بیچ میں پہاڑی پر واقع ہے، مد نظر تھی یہ پائے تکمیل کو پہنچی، دوسرے آبادی اور شہر کی حفاظت کے لیے ارد گرد فصیل کھینچی گئی تاکہ اگر باہر سے حملہ ہو تو غیر سپاہی آبادی کو ضرر نہ پہنچے۔ یہی قلعہ جو اس وقت ابراہیم کے عہد میں تعمیر ہوا تھا وہ آئندہ ایک صدی تک سلطنت گولکنڈہ کی

۱۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۳۔ اس تاریخ میں مصطفیٰ خاں کے تدبیر کی بڑی تعریف ہے کہ اس نے اپنے ہر موقع

مستحکم کرنا اور تقذیر ہوں سے معاملات کی یکسوئی کی اور گولکنڈہ کو بچا لیا۔

کے جن باغیوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا، ان کی خاطر خواہ سرکوبی کی گئی۔ ندرکنڈے کے  
 بی تھا، خود مصطفیٰ خاں نے سرکوبی کی جس کے صلے میں مصطفیٰ خاں کو جو بے تک پیر حملہ تھا  
 بیارہ دارالسلطنت میں ایک بڑے ناٹکواڑی نے جس کا نام ساروراؤ ناٹکواڑی بتایا جاتا ہے  
 کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں شورش کر کے قلعہ رام راز سے حوالے کر دے  
 سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مصطفیٰ خاں نے بروقت اس کی خبر لی۔ نیک باغیوں کی  
 ان کا قلع قمع نہیں ہو سکتا تھا، انھوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ مصطفیٰ خاں کو  
 تو ہم بادشاہ کی اطاعت کر لیتے ہیں۔ مصطفیٰ خاں ملک کی خاطر نہایت وفا داری کے ساتھ  
 لیے تیار ہو گیا۔ لیکن بادشاہ نے ان کی ایک نہ سنی اور برابر سرکوبی کی۔ جمندری اور  
 ان نے سر اٹھایا تھا، رفعت خاں لاری کو ملک نائب کا خطاب دیا۔ بڑھیا گیا اور  
 ملک شیرن تاج خاں۔ عزیز الملک بھیجے گئے تھے۔ ان سپہ سالاروں نے دسم کی تمام  
 فیوں کی سرکوبی کی اور ان اقطاع پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سلطنت لکندہ اپنے  
 ہو گئی۔

# ساتواں باب

## جنگ تالیکوٹ

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے آئندہ سات سال تک سلاطین دکن کی باہمی رقابت اور دیچیانگری سے دکن میں جو فسادات گزرے وہ رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اگرچہ احمد نگر اور بیجا پور کی رقابت نے فضا ہمیشہ کد رکھی اور اس سے دکن کے سیاسی اطمینان اور رفتار تمدن کو بہت نقصان پہنچا، لیکن اس نے تاریک پہلو یہ تھا کہ بیجا پور کی خود غرضی نے دیچیانگری کی ہندو سلطنت کو اپنے ساتھ شریک کر لیا اس سے نہ صرف یہ کہ خود بخود سطح مرفع دکن کا راستہ مل گیا، اور اس کو شمالی دکن کی سیاست میں حصہ لینے اور اپنا قدم جانے کے ہاتھ آ گئے، بلکہ اس سے یہ نقصان پہنچا کہ دیچیانگری کی ہندو فوجوں نے مسلمانوں کے خلاف بڑی طرح دل کا بخار احمد نگر میں قبہ اور مسجد میں سماں ہوئیں، قرآن شریف کی توہین کی گئی جو مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھا، اگرچہ ابراہیم اور علی عادل شاہ نے اپنی تائید کے لیے رام راج کو دعوت دی تھی، لیکن تاریخ کہتی ہے کہ ان کا ہرگز یہ نہ تھا کہ اس سے اسلام کی توہین ہو، بلکہ انھوں نے حملے سے پہلے اس کی ہدایت کر دی تھی جس کی پابندی ہوئی۔ اس کے علاوہ توازن قوت بھی خطرے میں پڑ رہا تھا۔ رام راج کی دست درازیاں جس طرح رہ رہی تھیں اسی طرح گولکنڈے کی سلطنت پر ہوئیں، بلکہ ابراہیم نے جو احمد نگر کا ساتھ دیا تو رام راج نے



گولکنڈے کو بہت نقصان پہنچا یا جو گولکنڈے کی حکومت کے لیے نہایت تشویشناک تھا۔ اگر بروقت پہنچاؤ نہیں ہوتا اور صلیفے خاں کی سیاسی علمبرداری، حالات کی یکسوئی نہ کرتی تو گولکنڈے کی سلطنت کے لیے بہت برے دن آجاتے اور یہ نوخیز سلطنت قبل از وقت ہندو سلطنت کا شکار ہو جاتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تلنگانے کے احقاق سے ویدیا نگر کی ایک ناقابل مزاحمت طاقت ہو جاتی۔ گو پہلے پہل عادل شاہی اور عماد شاہی حکومتیں موقعے کی یہ نزاکت محسوس کرنے سے قاصر تھیں، لیکن جب تلنگھانے میں رام راج کا غلبہ ہونے لگا تو شمال کی اسلامی سلطنتیں خوفزدہ ہوئیں اور اس خطرے کو رفع کرنا اور گولکنڈے کو بچانا ضروری سمجھا۔

نیز ان کامیابیوں سے جو رام راج کو احمد نگر اور گولکنڈے کے حدود میں حاصل ہوئی تھیں، اس قدر حوصلہ افزا ثابت ہوئیں کہ وہ غالباً تمام دکن کی علمبرداری کا خواب دیکھنے لگا، اور اس کو یہ خیال ہو گیا کہ تقریباً تمام دکن پر قبضہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ دکن کے مورخ کہتے ہیں کہ ویسے بھی ویدیا نگر کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ اگر زہیری کا بیان صحیح سمجھا جائے تو ویدیا نگر کی اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس کی ساٹھ سو ستر ہزار گامیں، بے شمار قلعے، اور الماس و زمرہ کی کئی کانیں تھیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سی قیمتی اشیاء اس میں پیدا ہوتی تھیں۔ اس سلطنت کی آمدنی کوئی بیس کروڑ ہون یا اسٹی لاکھ روپیہ تھی اور اس کی فوج تین چار لاکھ سوار، اور نو، دس لاکھ پیدل پر مشتمل تھی۔ خود یہ چیزیں احمد نگر اور گولکنڈے کو ڈرانے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر رام راج تلنگانے پر بھی قابض ہو جاتا تو اس کی طاقت غیر معمولی ہو جاتی اور اس کے لیے تلنگانے پر پیش قدمی کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس کی بعض حرکتوں سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حوصلے روز بروز بڑھ رہے ہیں اور شمالی دکن کے سلاطین اس کی نظر میں بے حقیقت ہیں۔ چنانچہ پانچ اسلامی سلطنتوں کے سفیروں کے ساتھ جو ویدیا نگر میں جتے تھے، براہ سلوک ہوتا تھا، دربار میں ان کو جگہ نہیں ملتی تھی۔

یہ صورت حال اسلامی سلاطین دکن کے لیے از حد تشویشناک تھی گو علی عادل شاہ اب تک اپنے ذاتی اغراض کے لیے رام راج کا دم بھرتا تھا، لیکن ہندو فوجوں کی دل آزاریوں اور رام راج کی دست درازیوں سے اس کو بھی شمس لگی چنناچہ زبیری کہتا ہے کہ علی عادل شاہ انہیں بے باکی و ناپاکی خاطر شمس پیر آدہ گروٹی کمال بہم رسانیدہ از غصہ و حمیت اسلامی بر خود می پیچید۔ صلاح دینی و دنیوی بہر در فحش نہی دید<sup>۱</sup> اپنے تمام سلطنت سے جن کے نام کشور خاں۔ شاہ ابوتراب بتائے جاتے ہیں مشورہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ویجیا نگر کا خاتمہ کر دیا جائے اور چونکہ یہ کام تنہا اس سے نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے تمام سلاطین دکن کو باہم متحد کرنا ضروری سمجھا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے کی پہلی افتاد گولکنڈے کے دربار میں پڑی تھی، لیونکہ رام راج سے احمد نگر اور گولکنڈے کو زیادہ نقصانات پہنچے تھے اور اگر حالات موافق نہیں ہوتے تو ان سلطنتوں کا ہمیشہ کے لیے شیرازہ بکھر جاتا۔ خاص طور پر گولکنڈے کو جو ویجیا نگر سے ملحق تھا دائمی خطرہ تھا۔ چنناچہ گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ رام راج کی دست درازیوں سے غائف ہو کر ابراہیم قلب شاہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ویجیا نگر کا خاتمہ کرنے کی کوئی تجویز کرنی چاہیے اور اس کو رو براہ کرنے کے لیے اس نے حسین نظام شاہ کو اپنے منصوبے سے واقف کر دیا۔ اور یہ قرین قیاس بھی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ علی عادل شاہ نے سب سے پہلے اس منصوبے کی سوچ بچار کی اور دوسرے سلاطین کو اس کی دعوت دی تو اس میں پیرزور حصہ لینے والا بالآخر ابراہیم قلب شاہ ہی تھا کیونکہ جب علی عادل شاہ نے ابراہیم کے پاس اتحاد کے لیے کشور خاں کے ذریعے پیغام بھیجا تو اس نے فوراً لبیک کہا، خود واسطہ بن کر احمد نگر اور بیجا پور میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی یہی مصلفے خاں پہلے بیجا پور اور اس کے بعد احمد نگر میں حسین نظام شاہ سے ملاقات کی اور خوش بیانی سے کام لے کر اتحاد کا راستہ صاف کر دیا۔ چونکہ احمد نگر اور بیجا پور میں دیرینہ رقابت تھی اس لیے اتحاد کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے قیمن نظام شاہ کی

نامور بیٹی چاند بی بی کو علی عادل شاہ سے اور اس کی بہن بی بی ہدیہ سلطان کی حسین کے بیٹے مر تقی سے شادی قرار دی گئی، اور چونکہ شولا پور کے لیے دونوں میں ہمیشہ نزاع رہتی تھی، اس لیے یہ طے ہوا کہ فیصلہ چاند بی بی کے جہیز میں بیجا پور کو دیا جائے اس شادی کی قرارداد کے لیے مصطفیٰ خاں کے ساتھ احمد نگر سے قاسم بیگ حکیم تبریزی اور ملا غیاث الدین قاسمی بیجا پور گئے تھے اور ان کے توسط سے یہ مبارک قرارداد طے ہوئی تھی شادیوں کی رسم بڑی دھوم سے انجام دی گئی احمد نگر اور بیجا پور میں کئی روز تک جشن ہوئے اور مسرت کا اظہار ہوا۔

جب اس اتحاد کی تکمیل ہو گئی تو ویجیا نگر سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی علی عادل شاہ نے رام راج سے پرگنہ اوتنگور، و، پاکری، اور قلعہ رائجور، اور مدگل واپس طلب کیے، اور اس مطالبے کے لیے ایک ایچی روانہ کیا۔ رام راج تو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھا ہی، اس نے ایچی کو حدود ویجیا نگر سے بری طرح نکال دیا۔ اس ایچی کے واپس آنے ہی مسلمان سلاطین نے ویجیا نگر کی طرف کوچ کر دیا۔ والی سدر علی برید بھی اس اتحاد میں شریک تھا۔ برہان عماد الملک والی برار اس سے کنارہ کش رہا، کیونکہ اس کو حسین نظام شاہ سے خصومت تھی۔ قرارداد کے مطابق ۱۷۹۲ء میں چاروں سلاطین بیجا پور میں ملے اور یہاں سے کوچ کر کے دریائے کرشنا کے کنارے تالیکوٹ پہنچے چونکہ یہ موضع سلطنت بیجا پور میں داخل تھا، اس لیے علی عادل شاہ نے یہاں اپنی طرف سے سب مہمانوں کی دعوت کی اور اس کے بعد کوچ کا انتظام کیا گیا۔ اس اثنا میں رام راج کو اطلاع ہو گئی تھی کہ ایک متحدہ فوج حملہ کرنے کے لیے آرہی ہے، لیکن اس بات کی بھی اطلاع تھی کہ اگر حملہ آوروں کے شرائط پورے ہو جائیں، یعنی عادل شاہی اور قلب شاہی مقبوضات جو اس نے زبردستی حاصل کیے تھے، واپس کر دیے جائیں اور اس کے بعد وہ کوئی دست درازی نہ کرے تو حملہ آوروں واپس ہو جائیں گے، اور اس کے لیے یہ اسلامی سلاطین بالکل راضی تھے لیکن رام راج اپنی دفاعی قوت کے گھمنڈ میں لڑائی کے لیے اتر آیا۔

پیچھے ہٹتے ہزار سوار، اور ٹولا کھ پیادوں کے ساتھ آمادہ پیکار ہو گیا۔ اپنے چھوٹے بھائی ایلیم راج کو بیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی اور ایک لاکھ پیدل فوج کے ساتھ پہلے روانہ کیا تاکہ حملہ آوروں کو دریا سے اترنے نہ دے اور

اس کے پیچھے اپنے منجھلے بھائی وینکٹا دہری کو بھیجا جب یہ دونوں فوجیں دریائے کرشنا کے کنارے پہنچ گئیں اور عبور کا راستہ مسدود کر دیا تو رام راج خود بڑی فوج کے ساتھ بگڑی ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ اسلامی فوج کے لیے دریا کا عبور کرنا بہت مشکل ہو گیا، جو راستے عبور کے تھے سب مسدود تھے۔ حملہ آور دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے دریا کے کنارے بہت آگے نکل گئے اور ہندو فوجیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے ان کے ساتھ پہنچ گئیں اور بہت دور نکل گئیں تاکہ اسلامی فوجیں دوسری جگہ سے راستہ حاصل نہ کر لیں۔ لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ جب مسلمان فوجوں نے دیکھا کہ ہندو فوجیں اپنی جگہ سے بہت دور نکل گئی ہیں تو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئیں اور پانچ روز کی مسافت ایک دن میں طے کر گئیں اور ہندو فوج کے آنے سے بہت پہلے اسی پایاب جگہ سے ایسا اچانک دریا عبور کر لیا کہ ہندو فوجوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ تمام اسلامی فوجیں دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے جمع ہو گئیں، اور دس میل آگے بڑھ کر رام راج کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس اچانک پیش قدمی اور عبور سے ہندو فوجیں بہت گھبرائیں اور ان کے لیے مقابلہ مشکل ہو گیا۔

۲۰ جمادی الثانی ۱۷۹۷ء کو یہ لڑائی ہوئی اسلامی فوجوں کی صفیں اس طرح آراستہ ہوئی تھیں کہ دکن کے دستور کے مطابق، قلب لشکر میں حسین نظام شاہ اور مہینہ پر علی عادل شاہ، میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی برید کھڑے ہو گئے، اور ہاتھی، توپ، مناسب جگہ قائم کیے گئے۔ دوسری طرف خود رام راج کی فوجوں کی تنظیم یہ تھی کہ قلب لشکر میں تو وہ خود پینتیس ہزار سوار، اور پانچ لاکھ پیادے پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور مہینہ پر ابراہیم راج کو بیس ہزار سوار، دو لاکھ پیدل پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ۔ میسرے پر وینکٹا دہری کو پچیس ہزار سوار، دو لاکھ پیادے، پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ کھڑا کر دیا اور حکم دیا تھا کہ اگر نظام شاہ گرفتار ہو تو اس کا سر میرے سامنے لایا جائے، اور علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ گرفتار ہوں تو ان کو زندہ پابہ زنجیر لایا جائے، تاکہ انہیں عمر بھر قید میں رکھا جائے گا تقریباً دو پہر کو لڑائی شروع ہوئی۔ رام راج نے یہ غلطی کی تھی کہ کھڑے رہے۔ سوار ہونے کے بجائے سنگنا سن میں بیٹھ گیا۔ لڑائی کا پہلا رنگ اسلامی فوجوں کے غلاف بڑھتا تھا

ہندو فوجوں نے تقریباً پانچ ہزار یاں۔ بندوق۔ توپ اور ضرب زن سر کرنے شروع کر دیے، اور ان کی فوج جو راج بیدر پر مشتمل تھی اپنی تلواروں کو سوت کر دشمن پر جا پڑی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی فوج کے قدم ٹکڑانے لگے۔ لیکن حسین نظام شاہ نے جو قلب لشکر میں تھا، کایا پلٹ کر دی، اس نے فوج کے سامنے دوسو بڑی توپیں اور دوسو درمیانی توپیں، اور دوسو زنبورک، جو بندوق سے بڑی ہوتی ہیں، اس سلیقے سے قائم کر دی تھیں کہ دشمن کے لیے مقابلہ ناممکن تھا۔ چلبی رومی خاں، جو توپ چلانے میں استاد تھا، ان کے سر کرنے کے لیے مقرر تھا۔ اس کے علاوہ دہ ہزار ٹرکی تیرانداز بھی کام کر رہے تھے ان لوگوں نے سپاہ گری کے قاعدے کے مطابق تیروں سے حملہ کر کے ہندو فوج کو توپ خانے کے رو بہ رو ہٹا دیا، اور جب رومی خاں نے توپیں سر کیں تو ہندو فوج کا بیڑا بکھیت ہو گیا۔ رام راج بہت گھبرایا، اور اپنے مرصع شامیانے اور گدی پر بیٹھ کر سپر بھر بھر کے اپنے سپاہیوں اور سرداروں کو روپیے تقسیم کیے اور جارحانہ کوشش کے لیے جرات دلائی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندو فوجوں نے پھر زور سے حملہ کیا، اور اسلامی فوجیں متزلزل ہو گئیں لیکن اس مرتبہ بھی نظام شاہ کی ثابت قدمی سے بات رہ گئی۔ رومی خاں نے گولوں کی جگہ تانبے کے ٹکڑے بھر کے چھوڑے، اور اس حملے سے پانچ، چھ ہزار ہندو فوج مر گئی، اور خود حسین نظام شاہ، کشور خاں لاری کے ساتھ رام راج پر حملہ آور ہوا، اور اس کی تمام صفیں منتشر کر دیں۔ اور ایک نظام شاہی ہاتھی نے ایسا حملہ کیا کہ رام راج کے بھویوں نے سنگاسن زمین پر چپک دی اور بھاگ گئے۔ اور رام راج گرفتار ہو گیا، اور رومی خاں اس کو نظام شاہ کے پاس لایا، اور بادشاہ کے سامنے اس کا نام سرتن سے جدا کیا گیا اس واقعے سے ہندو فوج فرار ہونے لگی اور انا گندی تک ان کا تعاقب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ہندو فوج تہ تیغ ہوئی تھی میرہ پرا براہیم قلب شاہ نے وینکا دسی کو، اور سیمہ پری علی عادل شاہ ایتیم راج کو شکست دی، اور اس کی فوجوں کو تہ تیغ کیا۔

فاتحین دہلی روز تک تو محاذ جنگ میں رہے، اور اس کے بعد خود و بھیا نگر میں قیام کیا، اور یہاں

چھ مہینے رہے اور بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ راجپوتوں پر حملہ کر لیا، اور تا کر ی کو جو رام راج نے زبردستی لیے تھے۔

دوبارہ حاصل کر لیا، اور بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا۔ اگرچہ اس تھوڑی سی مدت میں ویجیانگر کے تمام علاقوں پر قبضہ کرنا، ناممکن تھا، اور بعض علاقے رام راج کے بھائی ونکنادری، اور ایلیم راج کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے، تاہم یہ بہت بڑی فتح تھی اور اس کی خبر ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ گئی۔ اس سلطنت کے خاتمے سے شمالی دکن کی تمام سلطنتوں کو ہمیشہ کے لیے اطمینان ہو گیا، بلکہ ماوی فایدے بھی ہوئے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور نے آہستہ آہستہ حملہ کر کے اپنی سلطنتیں بہت وسیع کر لیں۔ چنانچہ آخری زمانے میں سلطنتیں کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئیں۔ ابراہیم قطب شاہ نے خود کرناٹک پر حملے کیے تھے اور اس قبضے سے ان کی دولت و اقبال میں بہت اضافہ ہوا۔

اس فتح ویجیانگر سے گولکنڈہ کو پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے مشرقی علاقے جو رام راج کے زیرِ پلے اثر سے متلاطم تھے آسانی سے ہاتھ آ گئے۔ ویجیانگر کی طاقت کے مٹ جانے سے مشرقی تلنگانہ کے نائکوں کو مغلوب کرنا مشکل نہیں تھا چنانچہ فتح ویجیانگر کے ایک سال بعد ابراہیم قطب شاہ نے ملک نائب عین الملک۔ صلابت خاں بلک شیر کو راج مندری کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔ سخت معرکوں کے بعد ۹۷۹ھ میں راج مندری فتح ہو گیا، اور جن نائکوں نے یہاں اپنا قدم جمایا تھا، وہ یا تو ویجیانگر کی طرف بھاگ گئے یا قاسم کوٹھ میں پناہ لی جب ابراہیم قطب شاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے قاسم کوٹھ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کا راستہ بہت دشوار گزار اور قلعہ بہت مضبوط تھا، لیکن قطب شاہی فوجوں نے اس کا بہت جلد خاتمہ کر دیا۔ ۹۸۴ھ میں عماد الدین شیرازی حیدر الملک نے کوند بیر فتح کر لیا، اور تقریباً اسی زمانے میں امیر زنبیل اور دوسرے سپہ سالاروں نے گولکنڈہ کے علاقے جو، کاکن۔ نا کاوی اور کلکور کے نام سے موسوم تھے مسخر کر لیے۔ یہ مشرقی کوکن کے حصے سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں مغتوح ہوئے تھے لیکن سہجان قسلی کی کم سنی کی وجہ سے عادل شاہی فوجوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان فتوحات سے گولکنڈہ کی سلطنت نہ صرف بیرونی خطرات سے مطمئن ہو گئی، بلکہ چاروں طرف اپنے قدرتی حدود تک پہنچ گئی یعنی جنوب میں شمالی کرناٹک، مشرق میں

ساریج کو لکھو

درتی حدود کے ساتھ قطب شاہوں کے  
آہنگی سے اس کو آئندہ تمدنی اور  
نے پورا فائدہ اٹھایا ہے

# انحصارِ باب

## سلطنت کی تعمیر

ابراہیم قطب شاہ نے، قطب شاہی سلطنت کی ہر طریقے سے تعمیر کی۔ دکن کے بنی ملک کی تعلقات میں ایک مستقل مسلک قرار دینا جو سلطنت کی بقا کا پوری طور پر ضامن ہو، ابراہیم کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ ہم آؤ پر دیکھ آئے۔ اس نے کس طریقے سے سلطنت کی کشتی سیاست دکن کے سخت منجدھار سے صحیح سالم نکال لی، ورنہ گولکنڈے کی سلطنت بجا پورا اور ویجیا نگر کے خطرناک سیلاب میں ایسی بہہ جاتی کہ اس کا پتا نہیں چلتا۔ ابراہیم کی رمزی سے اس سلطنت کی نہ صرف ہستی قائم رہی بلکہ وہ اپنے قدرتی حدود تک پہنچ گئی جس میں اس کی زندگی کا راز مضمر تھا۔ سلطنت اس وقت منبہ ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے پورے جغرافیے پر حاوی ہو۔ یہی سلطنتیں دیر پا نہیں ہو سکتیں۔ ابراہیم نے اپنی کوششوں سے تلنگانے کے تمام طول و عرض اپنی سلطنت میں کر لیے اور اس کے واسطے اپنی آخری عمر تک لڑتا رہا۔ ان لڑائیوں سے پہلے اس نے مرکزی استحکام کا پورا بست کر لیا تھا، تاکہ باہر سے حملے ہوں تو ان کی خاطر خواہ مدافعت ہو سکے۔ خانِ اعظم مصطفیٰ خاں کے مشورے سے بلکنڈے کا ایسا دفاعی انتظام کیا گیا کہ آج سے آئندہ سو سال تک یہ سلطنت کی پوری حفاظت کرتا رہا۔ یہیں اس کی تکمیل ہوئی اور اس پر نہیں لاکھ روپیہ خرچ ہوئے۔ قلعہ تمام پتھر اور چوڑے سے بنایا گیا اور اس کے وایک وسیع فصیل بنائی گئی جس کا محیط آٹھ ہزار گز بتایا جاتا ہے، اس میں آٹھ اونچی دروازے ہیں۔

وں اور برجوں کی تعداد کوئی چار سو کے قریب تھی۔ قلعے کے استحکام کے ساتھ غالباً کوچ کی بھی ازسرنو



تنظیم کی گئی اور فوج میں لائق سپاہی اور افسر مامور کیے گئے، کیونکہ ابراہیم کے عہد میں جو بڑے بڑے معرکے سر ہوئے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں قطب شاہی فوج زیادہ کار کردہ تھی۔

مرکزی حکومت میں لائق لوگ مامور کر کے اس کی کارکردگی بہت بڑھائی گئی جس میں ابراہیم کی مردم شناسی کو بہت دخل تھا جس وقت ابراہیم گولکنڈے کے تخت پر بیٹھا تھا عین الملک اور جگدیو راؤ جو پچھلی حکومت کے عمائد تھے باغی ہو گئے اور ملک سے باہر چلے گئے، اس لیے ابراہیم نے مصطفیٰ خاں اردستانی کو اپنا میر جلد بنایا، اور چند سال کے بعد جب اس سے بڑے بڑے کام انجام پائے تو ۱۵۹۳ء میں اس کو پیشوا بنایا گیا۔ تمام امور سلطنت، خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی، سب اسی کے مشورے سے روبراہ ہوتے تھے۔ اگر جنگ تالیکوٹ کے بعد اس سے انتظامی غلطی سرزد ہوتی تو عمر بھر کام آتا اور ابراہیم قطب شاہ کے تمام عہد حکومت میں اس کی پیشوائی قائم رہتی۔ رفعت خاں لاری کو ملک نائب بنایا گیا جو علمی و عملی قابلیت کی وجہ سے ممتاز تھا۔ تلنگانے کی اکثر فتوحات جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھیں، سب ملک نائب نے سر کیں۔ راجندر سی۔ ایلور وغیرہ اسی نے فتح کیے تھے۔ امیر شاہ محمد انجو بھی اسی عہد کے بڑے عہدہ داروں میں سے تھا، اور یہ غالباً تمام قطب شاہی افواج کا سپہ سالار تھا۔ تلنگانے کے بعض مہموں کی اس نے کمان کی تھی۔ حسین بیگ ترکمان جس کا قطب شاہی خاندان سے

---

۱۔ جنگ تالیکوٹ کے بعد جب کئی قلعے فتح ہوئے تو اس سے اتفاقی طور پر ایک اصولی غلطی سرزد ہو گئی۔ قلعہ رانچور مدگل۔ اوٹنگری۔ دتا کری پر قبضہ کرنے کے لیے پہلے ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے مصطفیٰ خاں حسین نظام شاہ کی طرف سے مولانا عنایت اللہ اور علی عادل شاہ کی جانب سے کشور خاں بھیجے گئے تھے، مصطفیٰ خاں نے ان قلعوں پر قبضہ کر کے بلا اجازت ان کی کنجیاں کشور خاں کے سپرد کر دیں، اس سے ابراہیم قطب شاہ اور حسین نظام شاہ دونوں ناراض ہو گئے۔ آخر اند کر کے ایما سے ابراہیم نے مصطفیٰ خاں کو معزول کر دیا اس معزولی کے بعد یہ بیجا پور میں ملازم ہو گیا اور علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد ایک فساد میں مارا گیا۔ تاریخ قطب شاہی میں

رشتہ تھا، فوج کی بڑی خدمت پر مامور تھا۔ اکثر معرکوں میں اس کا بھی نام آتا ہے۔ حضرت حسین شاہ دکنی بھی جو بادشاہ کے داماد تھے، حکومت کے بعض فرائض انجام دیتے تھے، اکثر تعمیری کام انھیں کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔

مرکزی حکومت کی کارکردگی میں خود بادشاہ کی بیدار مغزی کو بھی بہت دخل تھا۔ ابراہیم نے مرکزی حکومت کو اپنی دل سوزی اور لائق وزرا کی محنت اور قابلیت سے مضبوط اور باخبر بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کی بیدار مغزی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو مرکزی اور صوبے داری امور سے پوری طور پر وابستہ رکھتا تھا۔ غالباً کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہ تھی مان اغراض کے لیے کہ مرکزی حکومت اپنے دور دراز اقطاع کے حالات سے بروقت باخبر رہے، جاسوسی میں بہت ترقی دی گئی۔ اور اگر بعض مورخوں پر اعتماد کیا جائے تو اس نے جاسوسوں کا ایک بڑا محکمہ قائم کر دیا تھا، جو گولکنڈہ تو کجا خود دکن کے لیے بھی ایک نئی چیز تھی۔ اس محکمے کے انتظام کی بدولت اس کے جاسوس تمام ملک میں پھیل گئے اور اس سے حکومت کی کارکردگی بہت بڑھ گئی۔ اسی انتظام کا اثر تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں غیر معمولی امن قائم ہو گیا، جو ایک متمدن سلطنت کی شرط اولین ہے۔

قطب شاہی خاندان میں ابراہیم قطب شاہ سب سے پہلا حکمران ہے جس نے باضابطہ نظم و نسق قائم کر کے سلطنت کو پر امن بنایا۔ ولایت تلنگ کہ پر از دزد و حرامی بود کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ تلنگانہ چوروں اور لٹیروں کا گھر تھا۔ راستے ایسے پر خطر تھے کہ مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ گزرنا حد درجہ دشوار تھا۔ بڑے قافلوں کی ہمراہی کے بغیر کوئی شخص اطمینان سے راستہ نہیں چل سکتا تھا اور یہاں کے چور اور لٹیروں بھی اپنے فن میں ایسے مشاق تھے کہ شاید دکن کے دوسرے حصوں میں ان کی نظیر نہ تھی۔ طرح طرح چوریاں کرتے تھے اور لوٹ مار سے مسافروں کو پریشان کرتے تھے۔ اور یہ حقیقت تاریخ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے کہ: ”مردم تلنگانہ در فن دزدی از زہندان ممالک دیگر ممتازند“۔ تاسیس سلطنت کے بعد

غالباً یہ ہر حکومت کا پہلا فرض ہے کہ سلطنت کو پُر امن بنائے۔ ابراہیم قلب شاہ نے پورے اہتمام کے ساتھ تلنگانے کے چوروں اور لیٹروں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی، تاکہ ہر جگہ امن و امان قائم ہو، اور اس کی بدولت تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں انتہائی سختی سے کام لیا گیا یعنی چوروں اور لیٹروں کا سختی سے پیچھا کیا گیا، اور معمولی جرائم کی سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ بادشاہ کا یہ حکم تھا کہ مجرموں کو کوڑے مار کر ان کے پیر کے ناخن جدا کریں اور ان کو برتن میں رکھ کر اس کے سامنے پیش کریں۔ یہ بہ ظاہر ایک وحشیانہ سزا معلوم ہوتی ہے، لیکن اس زمانے میں جرائم کے انسداد و قیام امن کے لیے اس سخت گیری کی بہت ضرورت تھی۔ ابراہیم قلب شاہ نے تلنگانے میں وہی کام کیا جو غیاث الدین بلبن نے شمال ہند میں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت بہت جلد پُر امن ہو گئی۔ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم کے حسن انتظام کی وجہ سے چوری اور نکاب تو کجا کوئی شخص چوری کا لفظ زبان پر نہیں لاتا تھا۔ سزاؤں کی دہشت کی وجہ سے چوری و قزاقی بالکل مفقود ہو گئی۔ نیز کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی تھی۔ جہاں کہیں جدید فتوحات ہوتی تھیں، پہلے وہاں کے چوروں و مفسدوں کا خاتمہ کیا جاتا تھا چنانچہ اندر کنڈے کی فتح کے بعد یہی انتظام کیا گیا۔ اگرچہ اس بیان میں کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں ہر بوڑھا زار و جواہر کی کشتی لیے ہوئے تنہا گولکنڈے سے دور احمد نگر اور بیجاپور کے حدود میں چلی جاتی تھی اور کوئی شخص اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا تاہم یہ کہنا صحیح ہے کہ سلطنت کے تمام گوشے بے خطر ہو گئے تھے، اور مسافر بے کھٹکے بغیر قافلے کے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی انتظام تھا کہ جب بھی کسی تاجر کا کوئی جانور مر جاتا، یا چوری جاتا تو سرکار سے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے ابراہیم کو عدل گستری کا پورا خیال تھا بظاہر ہے کہ اس انتظام سے ملک میں نہ صرف امن قائم ہو گیا، اور لوگ چین کی نیند سونے لگے، بلکہ اس سے تجارت اور صنعت و حرفت کو بہت فروغ ہوا، اور دوسری تمدنی ترقیوں کی راہیں پیدا ہو گئیں، جو کامیاب نظم و نسق کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اور تاریخ کے یہ الفاظ کہ ”آن وقت آباد“

آپجہ در ضبط ملک ولایت دست و اہمہ در سیح تاریخ کسے شاہ ندادہ“ بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

م کے کام اور علمی سرپرستی بھی شامل ہے، ہدایت کی ترقی کے لیے کئی  
 سے بڑی بڑی زمینیں سیراب ہوتی ہیں کئی باغ لگائے گئے اور قصبات  
 میں ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حکمران تھا، وہ شاعر بھی تھا۔  
 ہنگامی کی بھی بہت سرپرستی کی تھی اس کے دربار میں ہمیشہ علماء و فضلاء  
 فاضل، اور ان سے اکثر مسائل پر بحث کرتا تھا۔ تقریباً بیس سالہ  
 وہ، باغ لنگریں اس کو دفن کیا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر  
 اسباب یہ ہے کہ اس کو بہت مصیبتیں مہلنی پڑی تھیں اور بادشاہ  
 ارجی بڑے بڑے جاں گداز مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

حصہ سوم  
سلطنت کا عروج



(۱) سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۷۷۰ء

# نوال باب

## دن کا سیاسی توازن

۱۸۸۹ء میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا، تو اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ کو تخت نشین کیا گیا جو کے انتقال کے وقت اپنے تمام بھائیوں سے بڑا تھا۔ چودہ رمضان ۱۲۹۳ھ کو اس کی پیدائش ہوئی تھی، بہ روزی اہل عالم کے الفاظ سے اس کی تاریخ پیدائش ملتی ہے کئی شاعروں نے اس کی پیدائش کی میں نظمیں لکھیں اور ابراہیم قطب شاہ کے سامنے پیش کی تھیں اور اس کے صلے میں ان کو بیش بہا انعام

بدلتقاد عرف شاہ صاحب بڑا بیٹا تھا اس کی شادی ایک معزز خاندان میں کی گئی تھی، لیکن اکیس سال کی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا بیٹا حسین قلی بہت تعلیم یافتہ تھا تاریخ کے الفاظ میں: ”یہ زیور علم و فضل آراستہ و از علم و حکمت بھرہ تمام داشت“ بھی چھبیس سال کی عمر میں ایک تالاب میں ڈوب مرا تیسرا بیٹا محمد قلی ہے جو باپ کا جانشین ہوا چوتھا مرزا عبدالفتاح تھا جو فن قزاقی کی بہت مشہور ہے، باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی، محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (۱۲۹۳ھ) اس کا انتقال ہوا یا پنجویں ماہ بندہ ہے جو محمد قلی قطب شاہ کا سگا بھائی تھا، باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر بارہ سال کی تھی چونکہ اس نے اپنے ملاقات بغاوت کی تھی اس لیے قلعہ گوکنڈے میں قید کر دیا گیا، اور قید عرصے میں (۱۲۹۱ھ) مر گیا چھٹا محمد امین ہے جس کی عمر باپ کے کے وقت نو سال کی تھی، محمد قلی قطب شاہ سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ یہ اپنے پاکیزہ اخلاق اور وجہ سے بہت مشہور ہے (تاریخ قلعہ شاہی ص ۲۲۳)۔ ایک روایت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی ماں ایک عورت تھی

ملے، منجملہ ان کے یہ قطعہ بہت مشہور ہے:-

شاہ را داود خدا فرزندے کہ شد از دیدن او دل خرم

پئے شکرانہ شبہ دریا دل کرد با خلق بہ صد لطف و کرم

سال مولودش را یافت فلک باعث روزی اہل عالم

تخت نشینی کے وقت اس کی عمر پندرہ سال کی تھی، لیکن تاریخ کے الفاظ میں بہادرانہ جمیع صفات صوری و معنوی ممتاز بود چنانچہ قطب شاہی سلطنت کا پورا عروج جو اس کے عہد میں ہوا ہے اس قابلیت اور اولوالعزمی کا بین ثبوت ہے۔

محمد علی قطب شاہ ایسے وقت میں تخت نشین ہوا تھا جبکہ دکن میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا اور دکن کے ہر گوشے میں تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ کیونکہ جنگ تالیکوٹ کے لیے دکن کی چار سلطنتوں میں جو اتحاد ہوا تھا وہ بہت دنوں تک قائم نہیں رہا، بلکہ جنگ کے عین بعد ہی اس کے پرچھے اڑ گئے جو طاقتیں ابھی باہم متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن و بھینا نگر کے مقابلے کے لیے گئی تھیں وہ اب آپس میں لڑنے لگیں۔ یہ دکن کے لیے بہت برا شگون تھا کہ جنگ سے واپس ہونے کے بعد دکن کے مشہور سورما، اور فاتح تالیکوٹ حسین نظام شاہ کا بہت جلد انتقال ہو گیا، یعنی آفتاب دکن بشت نہاں<sup>۱</sup> اس کی بے وقت موت سے دکن کی بساا بالکل اُٹ گئی اور پھر پیرانا نقش جم گیا جو جنگ سے پہلے تھا کیونکہ علی عادل شاہ اول جو دکن کے تمام تلامم کا تنہا ذمہ دار تھا، اپنی دست درازیوں کے لیے ابھی زندہ تھا، اور اس کے سامنے احمد نگر کی

جس کا نام بھاگ رتی بتایا جاتا ہے (ماہ نامہ)۔

۱۔ یہ حسین نظام شاہ کی وفات سے متعلق کہا گیا ہے جس سے اس کی تاریخ وفات ۱۷۷۲ء تکلیفی ہے۔

جنگ تالیکوٹ کے صرف چار مہینے کے بعد اس کا انتقال ہوا ہے، یعنی یہ لڑائی جمادی الثانی میں ہوئی اور

اس کی وفات ذیقعدہ میں واقع ہوئی۔



سلطنت جو اس کے حرص و آرزو کا ہمیشہ نشانہ بنی رہی۔ پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئی تھی، کیونکہ اب اس کے تخت پر حسین نظام شاہ کے بیٹے مرثیے نظام شاہ کو بٹھایا گیا جو ایک نیم دیوانہ شخص تھا۔ اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کی ماں خونزہ ہمایوں حکومت کرتی تھی، اس طریقے سے ملک کی مدافعت بہت مشکل ہو گئی، علی عادل شاہ کی دست درازیوں کے لیے اچھے مواقع پیدا ہو گئے، معمولی بہانے سے اس نے احمد نگر پر وار شروع کر دیے جو ایک کھلی بد عہدی، اور بد اخلاقی تھی۔ اب احمد نگر کی کمزور حکومت کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنی مدافعت کے لیے حسب سابق گولکنڈے کو دعوت دے۔ خونزہ ہمایوں نے اپنے وزیر ادا کے مشورے سے گولکنڈے سے مدد کی درخواست کی، ابراہیم قطب شاہ بیجاپور کی بد عہدی سے بہت برا فروختہ ہوا، فوراً احمد نگر کی امداد کے لیے کو اس پہنچ گیا۔ کیونکہ دکن کے سیاسی توازن اور امن کے لیے احمد نگر کی امداد ضروری تھی، اور گولکنڈے کا ہمیشہ ہی مسلک رہا ہے۔ دونوں متحدہ فوجیں بیجاپور پر حملہ آور ہو گئیں۔ علی عادل شاہ اس صورت حال سے اس قدر خائف ہوا کہ مجبوراً صلح کر لی، کیونکہ اس متحدہ طاقت کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ حملہ آور بھی پہنچتے تھے کہ دکن میں امن قائم ہو نہ کہ بیجاپور کی تسخیر، اس لیے ان لوگوں نے صلح قبول کر لی اور واپس ہو گئے، لیکن علی عادل شاہ نے دوسرا گل کھلایا، اب اس نے گولکنڈے کے خلاف دل کا بخار کھانا چاہا، کیونکہ یہ سلطنت اس کے راستوں میں مزاحم تھی اور اس کی وجہ سے علی عادل شاہ کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے۔ چونکہ گولکنڈے کا تنہا مقابلہ اس کے قابو سے باہر تھا، اس لیے اس مرتبہ اس نے احمد نگر کو دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ہموار کر لیا۔ پہلے برار کی تسخیر کا سبب باغ دکھایا، اور اس کے بعد خود گولکنڈے پر فوج کشی کی تجویزیں ہو گئیں۔ مرثیے نظام شاہ جو بیجاپور کی سیاسی جوڑ توڑ سمجھنے سے قاصر تھا، علی عادل شاہ کے دام میں آ گیا، چنانچہ احمد نگر اور بیجاپور کی متحدہ فوجوں نے کاویل (برار) پر حملہ کر دیا۔ تقال خاں جو اس زمانے میں برار کے پڑاے عماد شاہی خاندان کو بے دست و پا کر کے سلطنت کا مالک بن بیٹھا تھا، بہت پریشان ہوا، اور ملّا وردوں کو ہتے پڑھا کر برار سے ٹلانے کی کوشش کی۔ مختلف تحفے تحایف اور دل آویز مراسلت سے کام لے کر علی عادل شاہ کو فراہم کر لیا۔ اب مرثیے نظام شاہ، تو وہ علی عادل شاہ کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں حملہ آور برار سے واپس تو ہو گئے، لیکن

جنوب میں قطب شاہی سلطنت کا رخ کیا، اور کولاس پہنچ گئے جو قطب شاہی شمالی حدود پر واقع تھا۔ لیکن ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس دوران میں عادل شاہی برگی فوج اور نظام شاہی فوج میں جھڑپ ہو گئی، اور یہ معاملہ بہت طویل کھینچا، لیکن بعض ارباب سیاست کے بیچ بچاؤ سے یکسوئی تو ہو گئی لیکن قطب شاہی سلطنت پر حملہ ناممکن ہو گیا، اور یہ حملہ آور اس تلخی میں اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

اگرچہ اس اتفاقی حادثے سے یہ حملہ ٹل گیا لیکن احمد نگر اور بیجا پور کا اتحاد نہ صرف تاریخ دکن کے لیے ایک نئی چیز تھی بلکہ اس سے دکن کے توازن کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ احمد نگر کی اس ناحق شناسی سے گولکنڈے کا دیرینہ مقصد خاک میں مل جاتا۔ اسی لیے ابراہیم قطب شاہ نے اس اتحاد کو توڑ کر پرانا سیاسی نقشہ جانے کی کوشش کی۔ مرتضیٰ کو سمجھایا گیا کہ علی عادل شاہ کا اتحاد ایک دایم فریب سے زیادہ نہیں ہے اور اس میں سب کا نقصان ہے۔ گولکنڈے کی معقول سفارتیں جس طرح پہلے کامیاب ہوتی رہی ہیں اس موقع پر بھی کامیاب ہوئیں، اور احمد نگر و گولکنڈے کا روایتی اتحاد قائم ہو گیا، اور یہ بھی طے ہوا کہ والی و بیجا نگر یلتم راج کو اس اتحاد میں شریک کر کے بیجا پور کو سبق دینا چاہیے تاکہ وہ پھر دکن کے امن میں خلل نہ ڈال سکے۔ دریائے کرشنا پر تینوں حکمرانوں کی ملاقات ہوئی اور بیجا پور پر حملہ ہو جاتا، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ احمد نگر کے ایک غلط مسلک کی وجہ سے یلتم راج اتحاد میں شریک نہیں ہو سکا۔ اس کی ذمہ دار مرتضیٰ کی ماں خونزہ ہمایوں تھی اس نے یلتم راج سے دو لاکھ ہون نعل بہا طلب کیا، یلتم راج اس سے ناراض ہو گیا۔ ابراہیم نے مرتضیٰ اور خونزہ ہمایوں کو لاکھ سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان متحدین میں پھر کشیدگی ہو گئی۔ ابراہیم، یلتم راج اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔ لیکن احمد نگر کے ارباب سیاست کو یہ مشکل آن پڑی کہ جب یہ لوگ اپنے گھر واپس ہونے لگے تو راستے میں عادل شاہی فوجیں مزاحم ہونے لگیں، مرتضیٰ اور خونزہ ہمایوں بہت پریشان ہوئے۔ اب ان کے لیے صرف یہ چارہ کار تھا کہ دوسری طرف سے اپنا راستہ بنائیں، چنانچہ یہ کوئل کنڈہ اور گھنپورے کی طرف سے گزرے اور قطب شاہی حدود میں لوٹ مار شروع کر دی جو بڑی زیادتی تھی۔ اس سے احمد نگر اور گولکنڈے کے تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہو گئے۔

ابراہیم قطب شاہ نے صلابت خاں اور مقرب خاں کو دو تین ہزار سوار کے ساتھ ان کی مزاحمت کے لیے بھیجا جس کی وجہ سے نظام شاہی فوج کو بہت نقصان پہنچا اور وہ میدان سے بھاگی۔

خود احمد نگر میں اس کے اعضاء سیاسی کی کشمکش کی وجہ سے بے اطمینانی پھیل گئی، خونزہ ہمایوں کو گرفتار کر لیا گیا، اور اس کے سب ہو خواہ ملک سے باہر بھاگ گئے۔ علی عادل شاہ کے حرم و آؤ کے لیے پھر اچھا موقع پیدا ہو گیا۔ کیونکہ احمد نگر کی مرکزی حکومت کمزور تھی اور گولکنڈہ سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۶۷۷ء میں بیجا پور کی طرف سے کشور خاں لاری احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے آگیا، اور کوئٹہ ہانڈ اور ہارور کے قلعے فتح بھی کر لیے۔ لیکن جنگیز خاں نے جو اس زمانے میں احمد نگر کا مشہور وزیر تھا حملہ آوروں کا پُر زور مقابلہ کیا اور کشور خاں کو تلوار کی گھاٹ اُتار دیا۔ عادل شاہی فوج بھاگ گئی، لیکن علی عادل شاہ نے مین الملک اور ظریف الملک کی سرکردگی میں ایک اور تازہ دم فوج بھیج دی۔ اس فوج نے بڑی ادمم چھائی جو احمد نگر کے لیے بڑی پریشانی کا سامنا تھا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ گولکنڈہ کی امداد کے بغیر یہ کتنی نہیں سلجھے گی چنانچہ گولکنڈہ سے امداد کی درخواست کی گئی اس زمانے میں ابراہیم قطب شاہ راج سندھی اور قاسم کوٹہ وغیرہ کی فتوحات سے بہت طاقتور ہو گیا تھا، اور شمالی دکن کے حالات رو بہ راہ کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ فوراً امداد کے لیے احمد نگر پہنچ گیا۔ علی عادل شاہ کو سبق دینے کے لیے گولکنڈہ اور احمد نگر کی متحدہ فوجیں بیجا پور پر حملہ آور ہو گئیں اور یہ اس قدر پُر زور حملہ تھا کہ علی عادل شاہ کے ہاتھوں کے ٹوٹے اڑ گئے۔ غالباً حملہ آور بیجا پور کو مسخر کر لیتے لیکن شکل یہ ہوئی کہ علی نے اپنے پیشوا، ابوالحسن ابن شاہ طاہر کو اس شبہ میں گرفتار کر دیا کہ حملہ آور اسی کے ایما سے متحد ہوئے تھے، اور غالباً وہ قتل بھی ہو جاتا لیکن ابوالحسن کے ملک میں اکثر لوگ ہمدرد بھی تھے، ہنملہ ان کے ایک سید مرتضیٰ بھی تھا جو پہلے احمد نگر کا ملازم تھا، وہ مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس دوڑا آیا، اور درخواست کی کہ خدا کے واسطے صلح کر لیجیے ورنہ ابوالحسن کا خاتمہ ہو جائے گا، اگر شرط صلح ابوالحسن کی رہائی قرار دی جائے تو بہت اچھا ہے مرتضیٰ نظام شاہ راضی ہو گیا اور صلح کے ساتھ ابوالحسن بھی رہا ہو کر مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس آگیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے اس طرز عمل سے گولکنڈہ کو ایک نقصان تو

پہنچا تھا لیکن اس پر طرہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ نے سید مرتضیٰ کے توسط سے ایک اور ہتھکنڈہ یہ اختیار کیا کہ مرتضیٰ نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ میں پھوٹ ڈال دی۔ مرتضیٰ کی بے وقوفی سے ابراہیم کے تمام منصوبے بے کار ہو گئے، وہ اس واقعے سے دلگیر ہو کر بیدر کے راستے گولکنڈہ پہنچ گیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ کی بار بار بد عہدی کی وجہ سے دکن کے معاملے کو جو نقصان پہنچ رہا تھا، اس سے ابراہیم بہت متاثر تھا، اور اس نے بالآخر یہ کوشش کی کہ اب بجائے بیجا پور کو پریشان کرنے کے احمد نگر کو سبق دینا چاہیے۔ اس کے لیے اس نے ایک بڑا اتحاد کر لیا جس میں تغال نہاں والی برار، اور برید والی بیدر شریک ہو گئے اور علی عادل شاہ کو بھی دعوت دی گئی جو گولکنڈے کے لیے نئی چیز تھی اور ان حالات میں ناگزیر بھی گئی۔ یہ اتحاد احمد نگر کے لیے بہت خوفناک تھا۔ مرتضیٰ سخت پریشان ہوا اب اس کے لیے ایک ہی چارہ کار تھا، یعنی علی عادل شاہ کو اس اتحاد سے جدا کرے۔ چنانچہ احمد نگر کے وزیر چنگیز خاں نے یہی کیا، مختلف ترفیبوں سے علی کو اس اتحاد سے علاحدہ کیا گیا۔ علی کی اس بد عہدی سے گولکنڈے کے منصوبے کو پھر نقصان پہنچا۔ برید اور ابراہیم جو احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے، واپس ہو گئے۔ لیکن علی عادل شاہ اور مرتضیٰ نظام شاہ نے متحدہ طور پر تلنگانے پر حملہ کر دیا، جو علی کا پیرانا منصوبہ تھا مگر گولکنڈے میں قوت مدافعت بہت تھی، قطب شاہی فوجوں نے ایسا دل کھول کر مقابلہ کیا کہ حملہ آور ہارمان گئے اور پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ یہ واپس تو ہو گئے لیکن انھیں یہ ڈر ہوا کہ بنادا ابراہیم احمد نگر اور بیجا پور پر حملہ نہ کر دے، جاتے ہوئے کو لاس کی سرحد پر تیس ہزار کی فوجیں چھوڑ دیں تاکہ اگر حملہ ہو تو بروقت مزاحمت ہو سکے۔ لیکن یہ فوجیں خاموش نہیں رہیں بلکہ قطب شاہی حدود میں شورش کرنے لگیں۔ ابراہیم نے ان کی سرکوبی کے لیے امیر شاہ محمد انجوا اور مرزا حسین بیگ ترکھان کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بھیج دی۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی اور اس میں دشمن کا بہت نقصان ہوا، اور وہ بھاگ گئے۔ اس اثنا میں مرتضیٰ نظام شاہ نے براہِ فتح کر کے اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تھا، لیکن علی برید کی ریشہ دوانیوں سے اس کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ بنابر سے فارغ ہونے کے بعد مرتضیٰ نے بیدر پر حملہ کرنا چاہا لیکن یہ کام بغیر گولکنڈے کی امداد کے نہیں ہو سکتا تھا۔ گولکنڈے سے پھر

مدد کی درخواست کی۔ میرا بوا القاسم کو سفیر بنا کر بھیجا چونکہ ابراہیم قطب شاہ کا نصب العین دکن کا نوازین قائم کرنا تھا، اس لیے باوجود ان ناگوار واقعات کے جواب تک ہوتے رہے اس لئے احمد نگر کی دعوت قبول کر لی اور امیر شاہ میر کی سرکردگی میں ایک فوج مرتفعی کو امداد کے لیے بھیج دی۔ بیدر پر حملہ تو ہوا مگر علی عادل شاہ کی امداد کی وجہ سے جو بیدر کے لیے بیجا پور سے بھیجی گئی تھی حملہ آور ناکام ہو گئے۔

لیکن علی عادل شاہ اول کے انتقال کی وجہ سے جو ۹۸۵ھ میں ہوا، دکن کے حالات بالکل بدل گئے۔ علی عادل شاہ کو اولاد نہیں تھی، اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی اس کی جگہ تخت پر بٹھا یا گیا جو جنگ و جدل سے زیادہ خاموش ترقی کا قائل تھا۔ اگرچہ چند روز تک اس نے اپنے چچا کی تقلید جاری رکھی اور ملک کی مدافعت کی، لیکن اس کے صلح کل، سلک کی وجہ سے دکن کے سیاہ بادل بہت جلد چھٹ گئے چونکہ علی عادل شاہ مرحوم نے علی بریدی کی مدد کی تھی، اس لیے مرتفعی بیجا پور سے انتقام لینا چاہتا تھا، اور اس کا یہ ارادہ بیجا پور کو بھی معلوم ہو گیا تو اپنے ارباب سیاست کے مشورے سے ابراہیم عادل شاہ نے بیس ازبیش احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ شاہ درگ پر لڑائی ہوئی۔ احمد نگر کی طرف سے بہزاد الملک نے مدافعت کی، لیکن اس کو شکست ہو گئی۔ ایک روایت یہ ہے کہ بہزاد الملک نے جلدی کر کے بیجا پور پر دھاوا بول دیا، اور بیدر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس کو جب شکست ہو گئی تو گولکنڈے سے امیر شاہ میر کے تحت امدادی فوج آگئی اور ان فوجوں نے قلعہ نلدرگ کا محاصرہ کر لیا۔ اس دار و گیر میں مرتفعی کا بہت نقصان ہوا۔ اگرچہ عادل شاہیوں کو شکست ہو گئی لیکن قلعے کی محصور فوج کو مغلوب کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس لیے یہ حملہ آور راتوں رات بیجا پور پہنچ گئے اور مرکز پر حملہ کر دیا جو بیجا پوری فوج نلدرگ پر تھی وہ بھی مدافعت کے لیے بیجا پور آگئی، یہاں کئی روز تک لڑائی ہوئی۔ اس دوران میں گولکنڈے کے ایک دوسرے جنرل امیر زبیل نے ناکاوی کا کن اور کلکور مسخر کر لیے جو بیجا پور کے مقبوضات تھے۔ اس سے بیجا پوری فوج زیادہ پریشان ہوئی اور ممکن تھا کہ حملہ آور خود بیجا پور کو مسخر کر لیتے لیکن قطب شاہی سپہ سالاروں کی نا اتفاقی اور بیجا پور کے ہتھکنڈوں سے معاملہ

غراب ہوا، اور حملہ آوروں کو بیجا پور چھوڑا پڑا۔ یہ پھر نلدرگ آگئے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا چونکہ محاصرہ بہت سخت تھا اس لیے امیر شاہ میر نے خود بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ محاصرے سے ہٹ جائے تو اچھا ہے لیکن عین اتنی زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو گیا تھا، اور اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ سربراہ بنے۔

قطب شاہی اور نظام شاہی کیمپ کے لیے ابراہیم قطب شاہ کی موت کی خبر سننے پر غیظ تھا لیکن امیر شاہ میر نے بہت روز تک یہ خبر چھپائے رکھی اس خبر کے افشا سے پہلے اس نے نظام شاہی اور قطب شاہی تمام ارکان سپاہ کو جن میں سید مرتضیٰ حمید خاں، خداوند خاں، بہزاد الملک تھے، جمع کر کے ایک مجلس کی اور ایمان کی قسم دی تاکہ ان کے منصوبے میں کوئی فرق نہ آئے۔ ادھر گو لکنڈے کے نوجوان بادشاہ نے بھی اپنے باپ کے منصوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ مرتضیٰ نظام شاہ کی طرف سے مرحوم بادشاہ کی تعزیت اور نئے بادشاہ کی کیفیت کے لیے میر حسین میرک سبزواری آیا اور اتحاد کی دعوت دی تو اس کا پورا خیر مقدم کیا گیا، اور اس کے ساتھ امیر شاہ میر نے بھی دربار میں آکر قلعہ نلدرگ اور اس کے محاصرے کی صورت حال بیان کی تو بادشاہ فوراً نلدرگ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اور ”مہیچہ رایت“ روانہ ہوئے۔ نوجوان بادشاہ کی آمد سے محاصرہ میں بڑی تقویت پیدا ہو گئی قطب شاہی تو بیٹیا محمدی و حیدری اور نظام شاہی، نوگزی اور لیلیٰ مجنوں نصب کی گئیں اور محاصرہ بہت سخت ہو گیا۔ قلعہ دار وزیر الملک اور تمام اہل قلعہ بہت پریشان ہو گئے اور بیجا پور کو اطلاع دی گئی۔ ابراہیم عادل شاہ کا صلح کل مسلک اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ خواہ مخواہ خونریزی ہو اس نے فوراً حملہ آوروں سے صلح کی درخواست کی حملہ آوروں نے بھی دکن کے اس کے لیے یہ صلح منظور کر لی تاکہ خانہ جنگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ اور لڑائی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایسی دست دراز مملکتوں کو سبق دے کر جو امن میں خلل ڈالتی ہیں خانہ جنگی کا راستہ بند کیا جائے۔ یہ سیاسی توازن ابراہیم قطب شاہ کا دیرینہ نصب العین تھا جو اس کی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے مرنے کے بعد پورا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ علی عادل شاہ کے ہوتے ہوئے جس کی ناجائز حرص و آرزو نے دکن کو پُر آشوب بنا رکھا تھا، یہ توازن پیدا نہیں ہو سکتا تھا اس کے جانشین کی صلح جو طبیعت نے بالآخر یہ گتھیاں سلجھا دیں اور گو لکنڈے کا پاکیزہ نصب العین جس کے لیے اس نے ہمیشہ کوشش کی اور ہر دست درازی کا جواب دیا، بالآخر پورا

نصا خاموش ہوئی تو بہت زمانے تک اس میں رخنہ نہیں پڑا گو ایک زمانے کے بعد بیجا پور اور  
 ایس لیکن وہ بہت مختصر ہوئی تھیں اور ان سے دکن کی پوری فضا متلاطم نہیں ہوئی گولکندے سے تو  
 گولکندے سے اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے ابراہیم عادل شاہ نے محمد قلی قطب شاہ کی بہن  
 نا جو <sup>۹۹ھ</sup> ۱۵۸۶ء میں رچائی گئی تھی اور ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کی مرضی سے نکاح شاہ  
 دی کی گئی اس ساکت فضا کی وجہ سے ان سلطنتوں کو خاموشی کے ساتھ ارتقاء تھے تمدن کا  
 نامجری یا سولہویں صدی عیسوی کا نصف اول ان سلطنتوں کے تمدنی عروج کا زمانہ ہے۔

---

بلکہ تاریخ تحریر تک کوئی بیس سال ہوئے ہیں کہ دکن میں کوئی حاکم جی نہیں ہوئی تاریخ فرشتہ  
 رک کی آخری لڑائی کے متعلق فرشتے کا بیان بہت مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے  
 ملے کیے تھے اور پھر بیجا پور پر حملہ کیا تھا۔

# دسواں باب

## دکن پر مغلوں کے حملے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ویجیا نگر کے خاتمے کے بیس پچیس سال کے بعد دکن کو ایک اور بڑی طاقت سے بار ہونا پڑا، اور یہ مغلوں کی طاقت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ویجیا نگر کا سیلاب جنوب سے آتا تھا تو اس کے برعکس شمال کی طرف سے گھس آئے۔ دکن کے حکمران <sup>۱۵۶۳ء</sup> ۱۵۶۳ء میں ویجیا نگر کا خاتمہ کر کے نچنت ہو گئے تھے اور انھیں نہیں معلوم تھا کہ چند سال کے بعد انھیں شمال کی ایک بڑی طاقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عین اسی زمانے میں <sup>۱۵۶۲ء</sup> ۱۵۶۲ء ویجیا نگر کا خاتمہ ہوا ہے مغل سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ <sup>۱۵۶۲ء</sup> ۱۵۶۲ء والی پانی پت سے مغلوں کے <sup>۱۵۶۲ء</sup> ۱۵۶۲ء دستان میں پھر ایسے قدم جم گئے کہ اب کوئی طاقت انھیں متزلزل نہیں کر سکتی تھی جنگ پانی پت کے بعد بالوہ بنگالہ۔ <sup>۱۵۹۱ء</sup> ۱۵۹۱ء چٹنا پچہ <sup>۱۵۹۱ء</sup> ۱۵۹۱ء تک مغل سلطنت تمام شمالی ہند پر چھا گئی۔ کے بعد اس کو دکن کی ہمسایہ سلطنتوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع تھا۔ چٹنا پچہ <sup>۱۵۹۱ء</sup> ۱۵۹۱ء سے شہنشاہ اکبر نے دکن کے مسئلے پر سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ مغل پیشقدمی کا باعث خود شہنشاہ کا سیاسی نصب العین تھا کہ وہ تمام ہندوستان کی <sup>۱۵۹۱ء</sup> ۱۵۹۱ء بندہ کر کے ایک متحدہ سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا، لیکن دکن کے ناگوار حالات بھی خود یہ خود اس کے محک ہو گئے۔ <sup>۱۵۹۱ء</sup> ۱۵۹۱ء پس کی ناچاقی کی وجہ سے دکن کے بعض حکمرانوں نے خود شہنشاہ اکبر کو دعوت دی اور شہنشاہ حملہ کرنے کے لیے <sup>۱۵۹۱ء</sup> ۱۵۹۱ء ہو گیا۔

جس زمانے میں احمد نگر کی فوجیں برار کی تسخیر کے لیے آگے بڑھنے لگیں تو تغال حاکم نے جو برار کا والی



بن بیٹھا تھا شہنشاہ اکبر سے امداد کی درخواست کی تھی اور شہنشاہ نے مرتضیٰ نظام شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ برابر سے اپنی فوجیں ہٹالیں، چونکہ یہ دور کی دھمکی تھی اس لیے مرتضیٰ نے اس کی پروا نہ کی اور ۹۸۲ھ میں برابر پر قبضہ کر ہی لیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اس سے ناراض ہوا، کوئی فوجی نقل و حرکت تو نہیں کی لیکن شکار کے بہانے سے ۹۸۳ھ میں جہانگیر کے پہاڑوں کے نیچے شمالی دکن کی سیر کی۔ غالباً اس سے منشا یہ تھا کہ دکن کے حالات دریافت کرے اور سلاطین دکن کو خوف دلانے۔ اس کے بعد ۹۹۲ھ میں احمد نگر کی خانہ جنگی سے دکن کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے بھائی برہان نے بغاوت کی اور جب وہ اپنی بغاوت میں ناکام ہوا تو پہلے کوکن بھاگا اور پھر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے احمد نگر کے اکثر عمائد جیسے فتح اللہ شیرازی اور ۹۹۳ھ میں سید مرتضیٰ خاں سبزواری اور خداوند خاں بھی اکبر کے دربار میں آ گئے اور وہاں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور خطاب و انعام ملے اور برہان کی امداد کے لیے اکبر نے مالوے کے گورنر مرزا عزیز کو کہہ دیا تھا کہ وہ احمد نگر پر حملہ کرے۔ لیکن یہ حملہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔

لیکن دو سال کے بعد احمد نگر کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ مرتضیٰ نظام شاہ کی دیوانہ وازرکتوں کی وجہ سے ۹۹۶ھ میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا اور اکابر ملک نے اس کے بھائی حسین کو حسین نظام شاہ ثانی کے نام سے تخت نشین کر دیا، اور یہی بہت جلد یعنی صرف دس مہینوں کی حکومت کے بعد طبقہ واری کشمکش کا شکار ہو گیا۔ اب چونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اہل ملک نے برہان کے بیٹے اسماعیل کو ۹۹۹ھ میں تخت نشین کر دیا، کیونکہ برہان اکبر کے دربار میں تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات کے مد نظر شہنشاہ نے یہ چاہا کہ برہان کو جو اس کے دربار میں تھا ایک مغل فوج کے ساتھ احمد نگر بھیجے اور اس کو احمد نگر کے تخت پر بٹھادے۔ گو بہ ظاہر یہ شہنشاہ کی نوازش تھی، لیکن اس کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ احمد نگر مغل سیادت کے تحت آجائے لیکن برہان اس متحکم ڈے کو سمجھتا تھا اس نے شہنشاہ کو یہ سمجھایا کہ مغل فوج احمد نگر لے جانا مصلحت کے خلاف ہے اس سے اہل دکن ناراض ہو جائیں گے، بلکہ میں خود اپنے دست و بازو سے تخت حاصل کرتا ہوں جب ۹۹۹ھ میں یہ احمد نگر آیا تو اکابر ملک نے اس کا

غیر مقدم کیا، اور تخت پر بٹھا دیا۔

احمد نگر میں برہان نظام شاہ کی تخت نشینی مغل فوج کشی کا پیغام تھا، کیونکہ برہان نے تخت حاصل کرنے کے بعد اکبر کی سیادت تسلیم نہیں کی بلکہ مغل سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھا جو شہنشاہ کے منشا کے خلاف تھا۔ شہنشاہ اس وجہ سے بھی زیادہ برا فروختہ ہوئے کہ برہان بادشاہ ہونے سے قبل مغل سلطنت کا ملازم و جاگیردار ہو گیا تھا اور اس کو مغل شہنشاہت کا پاس رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی اس حرکت کو شہنشاہ بغاوت سمجھتے تھے، اس سے متاثر ہو کر شہنشاہ نے دکن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانے میں جبکہ گولکنڈہ سے میں شہر حیدر آباد کی بنیاد پڑ رہی تھی شمال میں تغیر دکن کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ اپنے اصول کے مطابق شہنشاہ نے حملے سے پہلے ۹۹۹ھ میں چاروں والیان دکن کے نام اپنے سفیروں کے ذریعے اطاعت کے پیغام بھیجے۔ سوائے دالی خاندیش راجہ علی خاں کے باقی تین سلطنتوں یعنی احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں تو جنوب میں تھیں اور شمالی سلطنت احمد نگر کے ہوتے ہوئے ان کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ جب تک احمد نگر کی سلطنت کا خاتمہ نہ ہو جاتا بیجاپور اور گولکنڈہ پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دالی گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ نے اس سیاسی حالت کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ گولکنڈہ میں جو مغل سفیر آیا تھا وہ مرزا سعود دیا ابوالفضل کے الفاظ میں ”میر میر“ ہے، اس کی آؤ بھگت تو بہت کی گئی لیکن جب اطاعت کا سوال ہوا تو غالباً اس کو صاف جواب دے دیا گیا چنانچہ ابوالفضل نے ”میر میر“ سے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ:۔

”میر میر کہ پانڈاز گوی مرزا بنگلکندہ دستوری یافتہ بود بہ ایچی و پیشکش رسید“ یعنی اس کو کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔

بیجاپور اور احمد نگر کے درباروں سے بھی مغل سفیر میر محمد رضوی اور فیضی بالکل اسی طرح بے نیل مرام واپس ہو گئے جس طرح

۱۔ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۶۴۸۔ تاریخ قطب شاہی میں اس واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو سرسری

سجھ کر نظر سے گزر گیا۔

گولکنڈے سے آئے تھے تو شہنشاہ اکبر نے پھر دکن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی مگر چہرہ یہ تیاری بہت جلد بارور نہیں ہوئی سفیر تو دو سال کے بعد یعنی ۱۵۹۳ء میں شہنشاہی دربار میں واپس آگئے اور شہنشاہ کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کر دی اور رپورٹ پیش ہوتے ہی اعلان جنگ کر دیا گیا لیکن فوج کی واقعی نقل و حرکت اور تین سال کے بعد ہوئی۔ چنانچہ مغلوں کا پہلا حملہ جو احمد نگر پہ ہوا وہ ۱۵۹۵ء میں ہوا۔

چاند بی بی کا زمانہ | جس وقت مغل فوجیں احمد نگر کے سامنے آگئیں تو اس ملک کی سیاسی حالت بہت حوصلہ شکن ہو گئی تھی۔ برہان ثانی کے انتقال کے بعد جو ۱۵۹۲ء میں ہوا، اس بد بخت سلطنت کا کوئی رہنمائے سیاست ایسا نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا چھوٹے بچے تخت نشین کیے گئے یعنی برہان کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بیٹے ابراہیم کو تخت نشین کیا گیا، لیکن بد قسمتی سے اسی سال یہ بیجا پور کی لڑائی میں مارا گیا۔ ایک فریق نے جس کا سرگروہ اخلاص خاں تھا ابراہیم کے چھوٹے بیٹے بہادر کو تخت نشین کرنا چاہا لیکن اس کے برعکس دوسرے فریق نے جس کا سرغنہ ابراہیم کا پیشوا میاں منجھو تھا احمد نامی ایک اور لڑکے کو بادشاہ بنانا چاہا۔ دونوں فریقوں میں خانہ جنگی ہو گئی جب میاں منجھو نے دیکھا کہ اخلاص خاں کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں ملتی تو اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے شہزادہ مراد کو حملے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں مثل فوجیں شہزادہ مراد، عبدالرحیم خانخاناں اور شاہ رخ مرزا کے تحت حملے کے لیے جمع ہو رہی تھیں اور یہ احمد نگر کے سامنے پہنچ گئیں جو اس بد بخت ملک کے لیے بہت افسوسناک واقعہ تھا۔ ان حملہ آوروں کے آنے سے ان باغیوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں جنہوں نے دشمنوں کو بلایا تھا۔ اب ہر طبقہ احمد نگر کو دشمنوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگا چونکہ اس وقت ملک میں کوئی ناخدا ئے سیاست ایسا نہیں تھا جو ملک کی رہنمائی کرتا، اس لیے سب طبقوں نے برہان نظام شاہ ثانی کی بہن چاند بی بی کو جو بیجا پور میں تھی، احمد نگر کی امداد کے لیے بلایا، اس ہیرہ رخن نے اپنے وطن مالوت کو دشمنوں سے بچانا اپنا فرض سمجھا، اور فوراً بیجا پور سے احمد نگر کو بچانے کے لیے دوڑی آئی۔ بیجا پور اور گولکنڈے کے حکمران بھی اس نازک صورت حال کو خوب محسوس کرتے تھے ان کی بقا احمد نگر کی سلامتی پر منحصر تھی۔ جب چاند بی بی نے شہزادہ مراد کے مقابلے میں نظام شاہی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اس کی امداد کے لیے اپنی فوج بھیجی تو گولکنڈے کے والی محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنی پوری ذمہ داری محسوس کی اور چاند بی بی کی مدد کے لیے قطب شاہی فوج بھیجی۔ تاریخ کے الفاظ میں:-

”چوں شہزادہ مراد فرزند ارجمند اکبر پادشاہ و خانخانان بہ جہت تسخیر ولایت احمدنگر

بالشکر بید و عدتوجہ نمود فتنہ و شور در آں بلاد اندامتہ خسرو راں مہدی قلی سلطان را

بہ امر او و خوانین و لشکر فراوان بہ جہت امداد سلسلہ نظام شاہیہ نامزد فرمود“

یعنی مہدی قلی کے تحت جو گولکنڈے کا جنرل تھا چاند بی بی کی امداد کے لیے ایک بڑی فوج آئی۔ چاند بی بی کی مشہور آفاق دلاوری اور اس متحدہ امداد کا نتیجہ تھا کہ مغل احمدنگر کی تسخیر میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ صرف بارہ لہجے پر اکتفا کر کے صلح کر لی اور بہادر نظام شاہ کی پادشاہی تسلیم کر لی۔

لیکن یہ صلح دائمی ثابت نہیں ہوئی، بلکہ اس کے دو سال کے بعد ۱۵۹۱ء میں پھر شہزادہ مراد اور خانخانان نے احمدنگر کے علاقے میں دھاوا بول دیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے سوپہ کے مقام پر ایک بڑی لڑائی ہوئی، لیکن اس موقع پر بھی بیجا پور اور گولکنڈے نے دل کھول کر مدد کی۔ بیجا پور کی طرف سے سھیل خاں، عادل شاہی فوج کے ساتھ آیا تھا تو گولکنڈے کی طرف سے اخلاص خاں اور طاہر خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے تھے چنانچہ اس معرکے میں جب دکنی فوجوں کی صف آرائی ہوئی تو پیرائے دستور کے مطابق نظام شاہی فوجوں کو پیچ میں رکھا گیا تھا، اور میمنہ پر بیجا پوری، و میرہ پر قطب شاہی فوجیں تھیں۔ یہ بھی بڑا سخت معرکہ تھا۔ اگرچہ اس معرکے میں دکنی فوجوں کو پوری شکست ہوئی، لیکن مغلوں کا بھی بڑا نقصان ہوا۔ دو سال کے بعد خود شہنشاہ اکبر نے دکن کی تسخیر کے لیے کوچ کر دیا۔ فوج کے دو حصے کیے، ایک حصے کی کمان خود شہنشاہ نے اپنے ہاتھ لی اور قلعہ اسیر گنڈہ کا محاصرہ

24405

کر لیا کیونکہ والی خاندیش راجہ علی خاں کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ مغل سلطنت سے مخوف ہو گیا تھا اور فرج کا دوسرا حصہ شہزادہ دانیال کے تحت احمد نگر پر وار کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ ۱۱۶۹ھ میں احمد نگر کا دوسرا محاصرہ ہوا۔ ملک کی طبقہ واری کشمکش کی وجہ سے چاند بی بی اس قدم بے بس ہو گئی تھی کہ اب وہ مذاقت سے قاصر تھی، لیکن اس کی قومی خود داری اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے جیتے جی احمد نگر دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس لیے اس نے قلعہ فتح ہونے سے پہلے خودکشی کرنی اور قلعہ احمد نگر پر مغل فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے ایک سال کے بعد ۱۱۶۱ھ میں برہان پور، اور اسیر گڑھ بھی مغل سلطنت کے قبضے میں آ گئے۔

چاند بی بی کے انتقال کے بعد جو ۱۱۶۹ھ میں ہوا، دکن پر سخت مایوسی چھا گئی۔ کیونکہ اب ملک عنبر کا زمانہ اقتدار دکن کا کوئی پشت پناہ نہیں تھا۔ وہ دن دور نہیں تھے کہ دکن مغل یورشوں کا پوری طور پر شکار ہو جاتا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی سرزمین دکن سے چاند بی بی کے کئی نام لیوا پیدا ہو گئے جو اس کے مقدس منصوبے کو پورا کر سکتے تھے۔ اگرچہ چاند بی بی دنیا سے رحلت ہو گئی تھی لیکن اس کی جیتی جاگتی روح دکن کے ہر گوشے میں گھومتی تھی۔ اسی کے نقش قدم پر ملک عنبر کی صورت میں دکن کا ایک اور شعلہ پیدا ہو گیا جس نے اپنی زندگی بھر دکن کی آزادی قائم رکھی۔ اس نے نظام شاہی خاندان کے ایک سپوت کو جس کا نام مرتضیٰ نظام شاہ ثانی تھا قلعہ دولت آباد میں تخت نشین کر کے نہ صرف احمد نگر کی مردہ سلطنت میں جان ڈال دی، بلکہ احمد نگر کے بل بوتے پر تمام دکن کی آزادی قائم رکھی۔ اس طریقے سے یہ چاند بی بی کی طرح نہ صرف احمد نگر بلکہ تمام دکن کی پشت پناہ تھا۔ اس نے اپنے خاص نظم و نسق سے ملک کو سبزارا، اور شہر و قصبات آباد کیے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں کی نئی فوجیں مرتب کر کے رہے۔ نظام شاہی علاقوں کی نگہداشت کی اور کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت شروع کر دی، اور اس کے لیے مغلوں کی شہنشاہی قوت کا مقابلہ تھا۔ شہنشاہ اکبر کے انتقال کے بعد جو ۱۱۶۶ھ میں ہوا، اس کے جانشین جہانگیر نے اپنے نامور افسروں کے تحت ملک عنبر کے مقابلے کے لیے فوجیں بھیجیں۔ شہزاد میر ویر۔ آصف خاں۔ خان جہاں لودی۔ عبداللہ خاں بہاوت خاں یکے بعد دیگرے آئے۔ لیکن ملک عنبر نے سب کو ایسی شکستیں دیں کہ سب مارا مان گئے۔ اگرچہ

یہ تمام لڑائیاں براہ راست احمد نگر سے تھیں لیکن بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں بھی ان سے متاثر ہوئیں۔ کیونکہ ان کی بقا احمد نگر اور ملک عنبر کی ذات سے وابستہ تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سلطنتوں نے چھپکے چھپکے ملک عنبر کی مدد کی تھی۔ بیجا پور کی امداد تو صاف معلوم ہوتی ہے، لیکن قراین یہ ہیں کہ گولکنڈہ سے بھی امداد کی گئی جب تک محمد قلی قطب شاہ زندہ تھا اس نے پوری مدد کی، اس کے مرنے کے بعد اس بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ جو ۱۵۲۲ء میں تخت نشین ہوا تھا، اس سیاست سے بے خبر نہیں رہا، اس نے بھی اپنے بچا کی طرح سیاست و کن کی کامیاب رہنمائی کی اور ملک عنبر کی مدد کے لیے روپیہ اور فوجیں بھیجیں، غالباً یہ سید کمال الدین کے تحت گئی تھیں جو اس زمانے میں گولکنڈہ کا سر لشکر تھا۔

ملک عنبر کے دارو گیر میں دو موقعے ایسے آئے تھے جبکہ اس کو ہتھیار ڈالنے پڑے کیونکہ تمام مغل جنرلوں سے مایوس ہو کر شہنشاہ جہانگیر نے بالآخر اپنے بیٹے شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو دکن بھیجا تھا تاکہ کئی طاقتوں کا پُرزور مقابلہ کرے۔ یہ ۱۵۶۱ء اور ۱۵۶۲ء کے واقعات ہیں۔ ملک عنبر کو ان مقابلوں کی تاب نہ تھی جب وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو گولکنڈہ اور بیجا پور پر بھی اس کا اثر پڑا چنانچہ ان سلطنتوں نے اپنے بچاؤ کے لیے شہزادہ خرم کی خدمت میں کئی تحفے اور اندرانے پیش کیے۔ ۱۵۶۱ء کے صلح نامے کی رو سے دکنی سلطنتوں پر خراج عاید کیا گیا۔ مغل اس کے بیس لاکھ روپیے گولکنڈہ پر عاید کیے گئے جو نسبتاً زیادہ تھے کیونکہ بیجا پور سے اٹھارہ لاکھ اور احمد نگر سے صرف بارہ لاکھ لیے گئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد نامے کی کبھی پابندی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے ایک سال بعد ہی کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ مغل شہنشاہت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شہزادہ خرم نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کی سرکوبی کے لیے مغل سلطنت کا مشہور جنرل مہابت خاں مامور ہوا جب خرم کو شکست ہو گئی تو وہ بھاگ کر دکن آیا گولکنڈہ کے شمالی حدود میں داخل ہو کر سلطنت محمد قطب شاہ سے مدد مانگی۔ یہ ۱۵۶۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک مغل شہزادہ پہلی مرتبہ گولکنڈہ کے حدود میں آیا تھا، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وہی خرم جو ایک سال پہلے فاتحانہ شان سے دکن آیا تھا، اب ایک بے پناہ مظلوم کی حالت میں تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ خرم کی مدد کرنا تمام مغل سلطنت کو دشمن بنانا تھا، کیونکہ جو مغل فوجیں خرم کا پیچھا کر رہی تھیں وہ گولکنڈہ پر ٹوٹ پڑتیں، اس لیے سلطان محمد قطب شاہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا، ظاہر تو اس نے مدد دینے سے انکار کر دیا، مگر غیبی طور پر

لیکن حرم کو جب بنگال میں ناکامی ہوئی تو پھر وہ گولکنڈے کے  
لی ہو شیری سے یہ بلا ٹل گئی۔

دکی رہنمائی کرتے ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کی  
مازک موقع پر اپنے شعور سیاست کا ثبوت دیتی تھی، اور  
زمانے کے باخبر سیاس تھے ان کو ملک عنبر کی ہر فوجی نقل و حرکت کی

---

# گیارہواں باب

## سلطنت کی توسیع و ترقی

مغل پادشاہوں کی روک تھام اور آزادی دکن کی حفاظت گو لکنڈے کا ہمیشہ مطمح نظر رہا تھا، جو ہم گذشتہ دیکھ آئے ہیں لیکن محمد قلی قطب شاہ کی وسیع نظر سلطنت گو لکنڈہ کے چاروں گوشوں پر بھی پڑتی تھی۔ اس نے بات کی کوشش کی کہ مرکز کی طرح اس کے دور دراز حدود سلطنت بھی مستحکم اور محفوظ رہیں۔ جنوب اور جنوب مشرق میں ت کے حدود دریائے تنگھڑا سے اور شمال مشرق میں دریائے گو داوری سے ملتے تھے۔ بیرونی حملوں کی مدافعت کے لیے روں پر جرار فوجیں متعین تھیں۔ دریائے گو داوری پر راج مند ری ایک بڑا فوجی مستقر تھا، اور اس کے بعد مرتھے نگر مشرقی چھاؤنی تھی اور جب ضرورت ہوتی تھی تو ان چھاؤنیوں سے فوجوں کی نقل و حرکت عمل میں آتی تھی۔ اور کہ قطب شاہی سلطنت کو اس زمانے میں جنوبی اور مشرقی طاقتوں کی مزاحمت کرنی پڑتی تھی، کیونکہ گوجک تالیکنڈے کا خاتمہ تو ہو چکا تھا لیکن رام راج کے بھائی ملتم راج اور وینکٹ پٹی ابھی باقی تھے جو کرناٹک کے چند محدود علاقوں پر تھے اور یہ کبھی کبھی انگریزوں کو لیتے تھے۔ ان کی کئی مرتبہ سرکوبی کرنی پڑی۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلے علی خاں لرو کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ یہ شخص گنٹور کی کا سپہ سالار تھا، سلطنت سے بغاوت کر کے ویدیا نگر کی طاقتوں کو اپنی امداد کے لیے طلب کیا۔ اس کی خاطر خواہ سرکوبی تو بن رائے ویدیا نگر وینکٹ پٹی کو آئندہ حملہ کرنے کی بہت جرات ہو گئی اور وہ پیش قدمی کا سامان کرنے لگا۔ محمد قلی نے اسے استغناء ال کے لیے کرناٹک پر کئی حملے کر دیے۔ اس وقت وہ سلطنت کے نظم و نسق سے فارغ ہو گیا تھا۔ فوج کی خود



رہنائی کی۔ ایک حملے میں اس نے قلعہ موسکورک رندیاں اور کلکو فتح کر لیے اسی دوران میں امین الملک جو سلطنت کا میر جملہ تھا کندی کوٹھ کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا، اس کا محاصرہ ہوا، چند روز کے بعد خود بادشاہ بھی یہاں آگیا یہ قلعہ رام راج کے بھانجے نرسم راج کے زیر نگین تھا، اس نے معافی چاہی لیکن وینکٹ پٹی قلعہ وینکٹ سے میں محصور ہو گیا جو قطب شاہی حدود کے قریب تھا چونکہ برسات کا موسم قریب تھا، اس لیے قطب شاہی فوجیں مقابلہ نہیں کر سکیں چند مہینوں کے بعد وینکٹ پٹی نے مرتھے نگر پر حملہ کر دیا افضل خاں حوالدار نے اس کا پُر زور مقابلہ کیا، اور ہندو فوج منہزم ہو گئی برسات ختم ہونے کے بعد کندی کوٹھ پر جہاں بخر خاں متعین تھا بڑا حملہ ہو گیا اگرچہ اس کی مدافعت کے لیے مرکزی حکومت سے رستم خاں اور دوسرے سپہ سالار بھیجے گئے تھے لیکن اول الذکر کی بددلی کی وجہ سے قطب شاہی فوج کو بڑی شکست ہو گئی، اس کی وجہ سے وینکٹ پٹی کی فوجوں کی جرات بڑھ گئی اور یہ قطب شاہی حدود میں لوٹ مار کرنے لگیں۔ بادشاہ نے ان کی مدافعت کے لیے اعتبار خاں یزدی علی خاں خاٹاناں۔ سا باجی، اور بھالے راؤ کو مامور کیا ان لوگوں نے نہ صرف وینکٹ پٹی کی فوجوں کو قطب شاہی حدود سے باہر نکالا بلکہ خود ویجا نگر میں بڑھ کے حملے کیے اور بڑی شکستیں دیں۔ اس کے بعد جب مغل فوجوں نے احمد نگر کا محاصرہ کیا تو اس واقعے سے وینکٹ پٹی کو پھر جرات ہو گئی اور گھنچوہ پر پھر حملہ کر دیا لیکن عادل خاں نے اس کا پورا مقابلہ کیا اسی طریقے سے شمال مشرق میں جو بغاوتیں ہوئیں ان کا بھی خاطر خواہ سد باب ہو گیا جب قاسم کوٹھ کے باجگزار راجہ بلند رائے کا انتقال ہوا تو اس کا جانشین مکندر رائے باغی ہو گیا، امین الملک نے اس کی گوشمالی کی اس کے بعد راج مندری اور دیور میں بغاوت ہو گئی، اس کا بھی سد باب کر دیا گیا یہ ایسا سد باب تھا کہ پھر کوئی نقل و حرکت نہیں ہوئی محمد قلی قطب شاہ کا آخری زمانہ اور اس کے جانشین محمد قطب شاہ کا عہد حکومت نہایت اطمینان سے گذرے۔

یہ تو سلطنت کی توسیع اور تنظیم تھی لیکن محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت جو کم و بیش تینتیس سال محیط ہے، ارتقائے تمدن کا زریں باب ہے۔ اسی عہد میں قطب شاہوں کا بڑا تمدن پیدا ہوا جس پر آندھرا ویش ہمیشہ فخر کرتا ہے۔ اسی عہد میں قرون وسطیٰ کا مشہور شہر حیدر آباد آباد ہوا اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم اس سلیقے کے ساتھ جمع کیے گئے کہ

ان کی مثال نہ تھی، اس کی وجہ سے تلنگانے کے طول و عرض میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کی گئی۔ داد محل۔ خداداد محل۔ ندی محل۔ باغ محمدی۔ بنات گھاٹ، اور کوہ طور کی سی متعدد عمارتیں بنا کر معاشرت کو بلند پایہ کیا گیا۔ فنون لطیفہ کو ترقی دے کر زندگی میں شگفتگی پیدا کی گئی، علم و فن کی اس قدر خدمت کی گئی کہ دور دور تک دنیا کے معلومات میں اس کے چرچے ہوتے تھے۔ اسلامی علوم کے ساتھ مقامی زبان تلنگی کو بھی فروغ دیا گیا۔ نہ صرف تلنگی شعراء کی خاطر خواہ مہر سہتی کی گئی بلکہ خود بادشاہ وقت نے تلنگی میں ملیح آزمائی کی۔ تلنگانے کی مقامی روایات و رواجات زندہ کر کے قومی بیداری پیدا کی گئی۔ اس کی تفصیل دیکھنے کا ہمیں آئندہ موقع ملے گا۔

ان تمام ترقیوں کا اصل محرک خود بادشاہ کی جلیل القدر شخصیت تھی جو تمام قطب شاہی خاندان میں خاص امتیاز کی حامل ہے۔ سیاست اور تمدن کی رہنمائی میں اسی کی بیدار مغزی کار فرما تھی لیکن عجیب اتفاق ہے کہ بادشاہ کی مردم شناسی کی یہ دولت ملک میں لائق وزرا و جمع ہو گئے تھے حضرت میر مومنؒ استرآبادی جن کو ان کے علم و فضل، سیاست و ادبی کی وجہ سے مرقعائے ممالک اسلام کہا جاتا تھا سلطنت کے پیشوا تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین محمد قطب شاہ کے عہد میں انھوں نے یہ عظیم الشان خدمت انجام دی اور ملک کو اپنی غیر معمولی قابلیت سے بہت فائدہ پہنچایا ملک کا کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا بڑا عہدہ دار مرزا محمد امینؒ ہے جو میر جگہ کی بڑی دزارست پر مامور تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس کی علمی و علمی قابلیت کا بار بار امتحان کر کے اس کو امین المملک کا خطاب دیا، اور حیلۃ المملکی کی خدمت دی تھی۔ تاریخ میں اس کو آصف دوراں کہا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف

۱۔ حضرت مومنؒ کے آبا و اجداد استرآباد کے رہنے والے اور صفوی خاندان کے ملازم تھے۔ ایران میں ان کی بڑی عزت تھی۔  
 ۲۔ حضرت مومنؒ غالباً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکن آئے تھے۔ شاہ مرزا صفہانی کے بعد یہ سلطنت کے پیشوا بنائے گئے۔  
 ۳۔ یہ بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ فارسی میں ان کا کلام پایا جاتا ہے۔ یہ دائرہ میر مومنؒ جو انھیں کا بنایا ہوا ہے

اس عہد کے داخلی فرائض انجام دیے بلکہ بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں قطب شاہی فوجوں کی کامیاب رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ میرزین العابدین سر لشکر اور میر ابو طالب ناظر بھی اسی عہد کے قابل ذکر عہدہ داروں میں سے تھے، اور یہ سب سید گھرانے کے لوگ تھے اور غالباً تقرر میں خاندانی شرافت کا سہارا رکھا جاتا تھا۔ ہندو بھی فوج کی بڑی خدمات پر مامور تھے، سا با جی اور بھالے راؤ فوج کے افسر تھے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے سلطنت کی طرف سے ہندو طاقتوں کی سرکوبی کی تھی۔

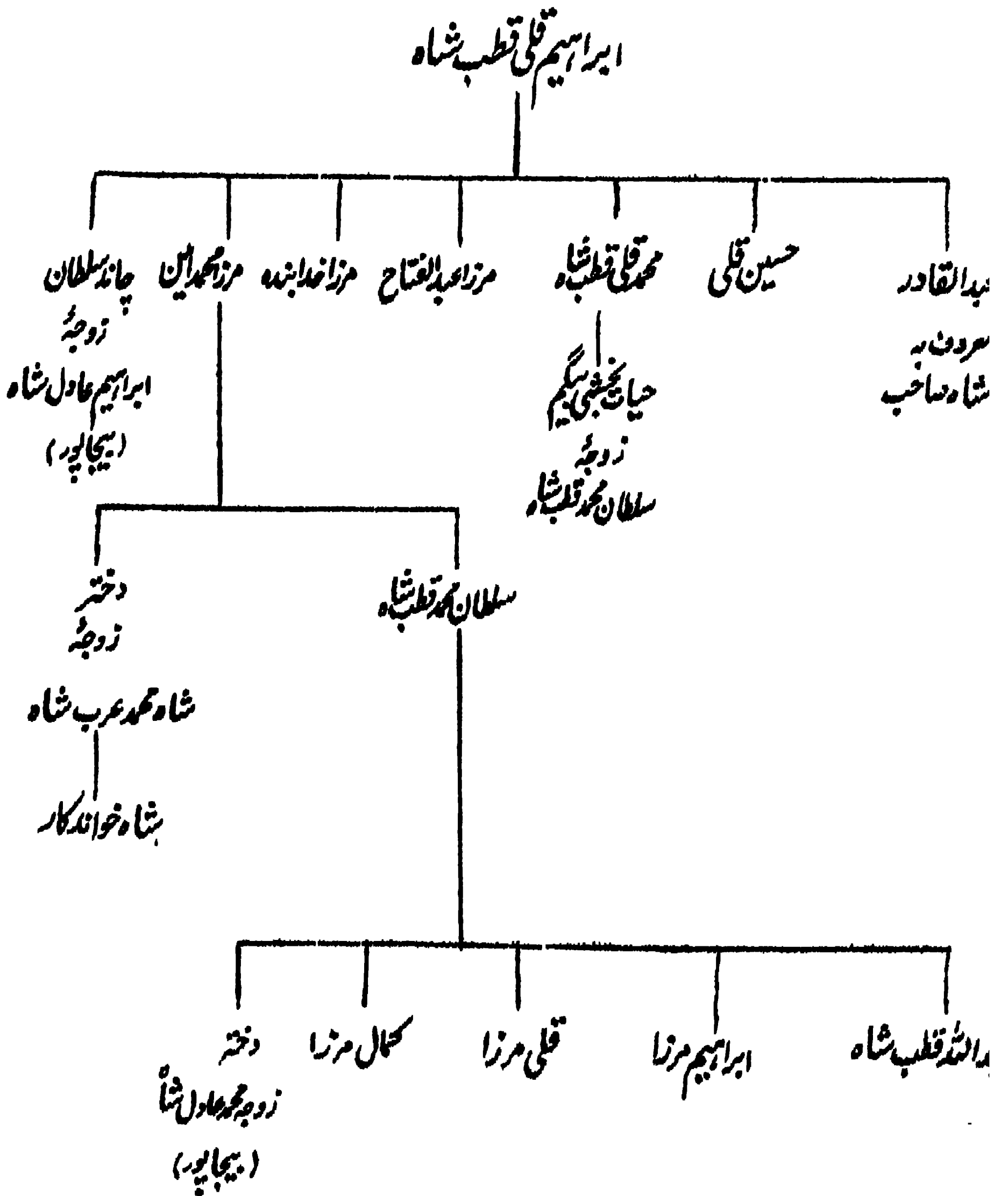
ایک طویل حکومت کے بعد جو تفتیش سال پر مشتمل ہے، ارذیقعدہ ۱۱۲۰ھ کو محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر اڑتالیس سال سے زیادہ نہ تھی، اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تمام زندگی عیاشی میں گزری تھی، لیکن اس کمزوری کے قطع نظر وہ بہت بڑا علی آدمی تھا۔ اس نے اپنی تظہیم و تعمیر سے تلنگانے کو جس قدر فائدہ پہنچایا تھا، اس کی مشکل سے مثال ملتی ہے۔ اگرچہ وہ بہت رحم دل تھا، اور تاج کشمیری ہے کہ اس نے اپنے تمام عہد حکومت میں کبھی کسی کو قتل نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود سلطنت میں کبھی بد امنی اور خونریزی نہیں ہوئی۔ دارالقضا سے تمام مقدمات کے منصفانہ فیصلے ہوتے تھے۔ اس نے اجناس کا محصول جو پچھلے زمانے میں لیا جاتا تھا معاف کر دیا۔ خیرات و مبرات کا یہ مال تھا کہ مذہبی تقریروں میں لاکھوں روپیے غرباء و مستحقین کو دیے جاتے تھے۔ ہر سال بارہ اماموں کے نام سے ساٹھ ہزار ہون خیرات ہوتے تھے۔ محرم میں بارہ ہزار ہون اور ربیع الاول میں ایک لاکھ ہون خرچ کیے جاتے تھے، اور ایک بہت بڑی رقم مقدس مقامات کے لیے بھیجی جاتی تھی۔

۱۔ فرشتہ محمد قلی کو حلیم الرون لکھتا ہے۔

۲۔ محرم میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا، تمام سلطنت میں عزا داری ہوتی تھی۔ حکومت کی طرف سے سب لوگوں کو سیاہ کپڑے تقسیم ہوتے تھے تاکہ وہ سیاہ کپڑے پہنیں۔ غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

بہرے طریقوں سے بھی مدد کی جاتی تھی، یعنی شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں میں شاہی خزانے سے روپیہ

۱۔





۵۱ سلطان محمد قطب شاه دینا نمر سید

# بارھواں باب

## عہد ارتقا

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کی جو ترقیات شروع ہوئی تھیں، وہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ سلطان محمد قطب شاہ جو محمد قلی قطب شاہ کا بیٹا ہے چہار شنبہ ۱۲۳۲ رجب المرجب ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام سلطان مرزا ہے۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کے بھائی محمد امین کا بیٹا ہے، اس کی ماں خانم آغا قطب شاہی خاندان سے تھیں، مگر ایک بڑے شریف گھرانے کی خاتون تھیں یعنی یہ میر مقصود علی بن میر علاء الدین طباطبائی کی بیٹی تھیں جس کا سلسلہ نسب کوئی چار پشتوں قبل حضرت امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا تھا۔ میر مقصود علی کو گو لکنڈے کے امیر اور سر لشکر سید کمال الدین مصطفیٰ خاں سے نزدیک کی قرابت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی قرابت اس کو گو لکنڈے میں لائی۔ چونکہ سید کمال الدین کی گو لکنڈے سے ایک ذمی اثر حیثیت تھی اس لیے یہاں اس کے خاندان کے کئی افراد جمع تھے۔ بھلا ان کے میر مقصود علی بھی تھا۔ مقصود علی نے اپنی خاندانی وجاہت اور مصطفیٰ خاں کے سیاسی اثر سے بہت جلد قطب شاہی دربار میں رسوخ پیدا کر لیا۔ گو لکنڈے کے سلاطین خود ایسے بلند پایہ خاندانوں کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور نہ صرف ان کو دربار میں جگہ دیتے تھے بلکہ ان کے ساتھ

---

۱۔ اگرچہ تاریخ قطب شاہی کا مولف تاریخ پیدائش ۱۲۳۲ رجب الثانی بتاتا ہے، لیکن اول الذکر تاریخ

زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ دوسری تاریخیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور سلطان محمد کی قبر کے کتبے میں بھی

ماہ رجب درج ہے۔

ازدواجی تعلقات پیدا کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے مقصود علی کی بھی بہت آؤ بھگت ہوئی اور اس کی بیٹی خانم آغا سے شہزادہ محمد امین کی شادی کی گئی اس طریقے سے سلطان محمد کا رشتہ عائدانی ایک بڑے سید گھرانے سے جڑا ہوا تھا۔

اس کی شادی کی صحیح تاریخ بتانی بہت مشکل ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ شادی محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہی ہوئی ہوگی کیونکہ ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت خود محمد قلی قطب شاہ کی عمر پندرہ سال سے زیادہ تھی۔ محمد امین تو اس سے بہت چھوٹا تھا، خود محمد قلی قطب شاہ کی شادی بھی اس کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی اس نے بادشاہ ہونے کے بعد نہ صرف اپنی شادی کی بلکہ اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کی شادی کی چونکہ سلطان محمد رشتہ میں پیدا ہوا ہے اور یہ محمد امین اور خانم آغا کی پہلی اولاد تھی اس لیے محمد امین کی شادی سنہ ۱۵۹۱ء کے لگ بھگ ہوئی چاہیے۔ اس شادی کے وقت محمد قلی قطب شاہ کو تخت نشین ہونے تقریباً بارہ سال ہو چکے تھے چونکہ محمد قلی قطب شاہ کو صرف ایک بیٹی کے سوائے کوئی اور اولاد نہیں تھی اس لیے یہ سلطان محمد کی پیدائش سے بہت خوش ہوا کیونکہ یہی اس کا جانشین ہونے والا تھا۔ حضرت میر مومن استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوائے اظہار مسرت میں یہ نظم لکھی تھی :-

ہا از عالم ابتداء کا مرانی کردہ است	صد بشیر کامرانی می برد ہر سو خبر
دودمان ترکمانش خوش چراغ بر فروخت	پیر تو شاہزادہ بر چرخ میت بد و گر
رونق عز و شرف سلطان محمد آنکہ ہست	ہر دو عالم یک صدق از بہر آن عالی گہر
خواتم تاریخ آن فرخندہ گو ہر عقل گفت	اول کام است و فیروزی و اقبال و ظفر
چون دعائیں بہ نئی دامن از آن میگوش	سرور عالم مشوی در ظل اقبال پدر

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اس بچے کو اپنا مستقبے بنانے کی خواہش کی اور محمد امین سے اس بچے کو تنہیت کے لیے طلب کیا کہ: ”تم کو خدا اور بچے دے دیگا یہ بچہ مجھے دے دو“ محمد امین نے بچے کو دینے میں بہت تامل کیا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے انتقال تک بہت لیتے و لعل کرتا رہا جب چار سال کے بعد محمد امین کا انتقال سنہ ۱۵۹۶ء میں انتقال ہو گیا تو سلطان مرزا خود بخود اپنے چچا کے آغوش میں آگیا۔ یوں بھی محمد قلی قطب شاہ اس بچے کا سر پرست تھا

لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اس بچے کو لینے کے لیے خود محمد امین کے گھر گیا تھا، اور بچے کو اپنے ساتھ لایا اور خود اس کی پرورش کی۔

”از آوان طفولیت کہ پدر بزرگوار جهان فانی را وداع نمودہ بود در کنت لطف و مرحمت  
خاقان زمان نشو و نما یافتہ بود“<sup>۱</sup>

شہزادے کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا، یعنی دستور کے مطابق اس کی اس طرح تعلیم و تربیت کی گئی جس طرح اور شہزادوں کو دی جاتی تھی! اسی وجہ سے گولکنڈے کے تمام سلاطین سب کے سب پڑھے لکھے علم و فن کے قدردان ہوئے ہیں۔ علمی تعلیم کے لیے قاضی سمغانی، اور فوجی تربیت کے لیے حضرت شاہ یوسف صاحب جن کو تاریخ قطب شاہی میں چاندیاں یوسف لکھا گیا ہے، مقرر کیے گئے تھے یہ دونوں حضرات اپنے زمانے کے فاضل تھے اس اہتمام تعلیم کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمد ذی علم اور ذی اخلاق بادشاہ ثابت ہوا ہے علم و فن کی اس نے بہت قدر کی۔

یہ تو تعلیم و تربیت کا انتظام تھا، اور برب سلطان محمد کی عمر کم و بیش پندرہ سال کی ہوئی تو اس کی شادی کا انتظام کیا گیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم سے اس کی شادی کر دی جو ۱۰۱۶ھ میں ہوئی تھی۔ چونکہ سلطان مرزا محمد قلی قطب شاہ کا جانشین اور گولکنڈے کا تاجدار ہونے والا تھا، اور حیات بخشی بیگم جیسی لائق شہزادی سے شادی ہو رہی تھی اس لیے اس میں غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اگرچہ غالباً شادی کی اصل تقریب خود گولکنڈے میں ہوئی تھی جو تاریخ جگہ تھی، لیکن شہر حیدرآباد میں بھی اس شادی کی خوشیاں منائی گئیں۔ کیونکہ یہ فوجی شہر بھی جو اس وقت آباد ہو گیا تھا، ان سرتوں کا مستحق تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں بھی روشنی کا انتظام کیا گیا، اور مہانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ تمام افراد مملکت کو درجہ بدرجہ جامدار خانہ عامرہ سے خلعت فاخرہ تقسیم ہوئے، ان خلعتوں کی تعداد کوئی تیس ہزار

۱۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۵۔

۲۔ یہ حیدرآباد کے بہت مشہور بزرگ ہیں جن کا مقدس مزار نام پلی میں مرجع خلافت ہے۔



بتائی جاتی ہے، اس سے شادی کے دوسرے اخراجات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آئندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسرتیں بے معنی نہیں تھیں یہ ایسا سنجوگ تھا جس کی شمیم انگیزیاں برسوں تک گولکنڈے کو یاد رہیں۔ سلطان محمد تو جلد مر گئے، ورچو تیس سال سے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن حیات بخشی بیگم نے طویل عمر پائی، نہ صرف طویل مدت تک زندہ رہی، بلکہ آخر دم تک گولکنڈے کی سیاسی رہنمائی کی۔ اپنے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس نے چالیس سال گولکنڈے پر حکومت کی اور اپنے کارناموں کا ایک بڑا سرمایہ چھوڑا ہے اس وجہ سے گولکنڈے کے بہت سے شاعروں نے اس شادی میں مسرت کے گیت گائے تھے۔

جب محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو مرحوم کی وصیت کے مطابق سلطان محمد کو اس کی جگہ تخت نشین کیا گیا۔ سلطان محمد مرحوم کا ہر طرح جانشین تھا، اسی امید میں اس کی تربیت کی گئی تھی اور بادشاہ کی لائق اور اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم اس کو دی گئی تھی نیز مرحوم بادشاہ نے اپنے عمائد سلطنت سے تاکید کی تھی کہ اس کی جگہ سلطان محمد کو تخت نشین کریں چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ:-

کہ ہم در زمان صحت اہم در وقت اشتداد مرض مکر فرمودند و از ہر کس عہد وصیت گرفتند۔<sup>۱۰۲</sup>

محمد قلی قطب شاہ نے حالت مرض میں میر مومنؒ استرآبادی کو بار بار وصیت کی تھی کہ سلطان محمد کی تخت نشینی کا انتظام کریں بلکہ خود اپنی زندگی میں بیعت لے لی تھی حضرت میر مومنؒ نے سلطان محمد کی تخت نشینی کا انتظام کیا تھا۔ تخت نشینی کی صحیح تاریخ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء کے قریب ہے چونکہ سلطان محمد قطب شاہ اپنے علم و فضل اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے ملک میں بہت مقبول تھا اور لوگ اس کو محمد قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین سمجھتے تھے اس کی تخت نشینی کے موقع پر جو مسرت کا اظہار کیا گیا وہ بے موقع نہ تھا، خود میر مومن صاحبؒ نے جو اپنے عہد کے علامہ تھے رسم تخت نشینی کے موقع پر دو بڑے قصیدہ ہائے تہنیت پڑھے تھے:-

قصیدہ (۱۱)۔ با محبت باز بستم عہد و پیمان نوے کہنہ جائے می فشام تم پیش جانان نوے

.....

.....

سرمہ شد خاک تلنگانہ ز فرخ پائے تو اے فدائے خاک پایت ہر ماں جان نوے

.....

.....

گر صفا ہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ حیدر آباد از تو شد شاہا صفا ہاں نوے

.....

.....

مخو استم تاریخ فرغندہ جلوست عقل گفت جملہ عالم تو ہمارے شد ز سلطان نوے

(۱۰۲۰ء)

از دعا گوے چو تو من ہم دعا بہتر کہ است

او کہن داعی و تو شاہا جہاں جان نوے انخ

قصیدہ (۱۲)۔ غلعت شاہی چو در بر کردہ شاہ دیں پناہ دہر بر گردوں رساند از خرمی طعن کلاہ

.....

.....

خسرو روے زمین شایستہ صاحبقران شاہ با فتح و ظفر سلطان محمد قلب شاہ

.....

.....

روزگار شمش را خالق عالم ضمہاں آفتاب دو نقش را خلق عالم در پناہ انخ

گولکنڈے کی تمام تاریخ میں سلطان محمد قلب شاہ کا اکیلا عہد ایسا ہے جو پورے سکون اور خاموشی سے گزرا۔ وہ گھر میں کوئی سیاسی

تلاطم ہوا نہ حدود و سلطنت پر کوئی جنگ ہوئی! ایسا خوشگوار زمانہ اس کے پہلے رہا نہ اس کے بعد، بلکہ ہر زمانے میں سلطنت کو

کچھ نہ کچھ جنگ و جدل میں حصہ لینا پڑا! اس عہد میں تمام حدود و سلطنت ہر قسم کے سیاسی تلاطم سے محفوظ تھے۔ ملک کا ہر شخص

آرام کی نیند سوتا تھا! اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان محمد کے چچا نے اپنی انتھک کوششوں سے سلطنت کی فضا خوشگوار اور

حدود و سلطنت ایسے محفوظ کر دیے تھے کہ ملک بالکل مطمئن تھا۔ تمام ہمسایہ طاقتیں ایسی مغلوب ہو چکی تھیں کہ اب ان کو

سراٹھانے کا کوئی موقع نہیں تھا چنانچہ سلطان محمد کو ان طاقتوں کے خلاف کبھی جنگ و جدل کرنے کی کوئی ضرورت دہی نہیں ہوئی اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی دکن میں مغلوں کے ساتھ خونخوار معرکے ہو رہے تھے جن میں ملک غنہ سلیمہ سپر تھا۔ گولکنڈہ کی سلطنت بھی بالواسطہ ان لڑائیوں میں شریک تھی، لیکن یہ جنگ و جدل حدود سلطنت سے اس قدر دور تھا کہ ان سے سلطنت کے اطمینان میں کوئی خلل نہیں پڑا، بلکہ حکومت کے سوا غالباً اہل ملک کو ان لڑائیوں کی خبر تک نہیں ہوئی۔ لیکن سلطان محمد کے پاکیزہ اخلاق اور مذہب پرستی نے ملک کی سیاسی فضا میں اور شگفتگی پیدا کر دی اور یہ اپنی بلند پایہ شخصیت اور پاکیزہ فطرت کی وجہ سے ملک میں اس قدر مقبول تھا کہ اس کی مثال نہیں سلطان محمد بلند پایہ اخلاق اور مذہب کا پتلا تھا یہ وثوق سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دائرہ اخلاق سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ بچپن سے وہ صوم و صلوٰۃ کا سختی سے پابند تھا، اور ہر روز صبح کو نماز کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا اس کے تقویٰ کی صحیح آزمائش اس وقت ہوئی جبکہ مکہ مسجد کی تاسیس کا وقت آیا جس وقت مکہ مسجد کی تعمیر کا ارادہ ہوا تو اس کے سنگ بنیاد کے متعلق بڑا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے تمام علماء و فضلاء جمع کیے گئے اور ان سے کہا گیا کہ اس مسجد کی تاسیس کے لیے ایسے زاہد کی ضرورت ہے جس کی بارہ سال کی عمر سے نماز تہجد قضا نہ ہوئی ہو اس مطالبے پر تمام علماء اور فضلاء ہلاکت ہو گئے، کیونکہ اس مجمع میں کوئی شخص ایسا پابند صلوٰۃ نہ تھا جب کوئی تیار نہ ہوا تو خود بادشاہ ان الفاظ کے ساتھ آگے بڑھے کہ ”بارہ سال کی عمر سے میری نماز تہجد بھی قضا نہیں ہوئی ہے اور تاسیس کی مقدس رسم انجام دی۔“

اگرچہ سلطان محمد کے بلند کردار اس سلطنت کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھے لیکن اس نے اپنے مختصر عہد میں جو چودہ سال سے زیادہ نہیں ہے اپنی سلطنت کی علمی اور عمرانی خدمت سے اس کو عروج پر پہنچایا اور حقیقت یہ ہے کہ اس پیر سکون عہد میں جبکہ سلطنت جنگ و جدل سے بے نیاز ہو، علمی و تمدنی کام ہونا ضروری ہے۔ سلطان محمد نے اپنے چچا کے نقش قدم پر سلطنت کی اس طرح عمرانی خدمت کی جس طرح اس زمانے میں ضرورت تھی، اور اپنے چچا کے پاکیزہ منصوبے کو پورا کر دیا۔ دفاعی انتظام اور تعمیری شوق کے مد نظر سلطان محمد نے حیدرآباد کے مشرق میں ایک اور شہر سلطان نگر کے نام سے آباد کرنے کی کوشش کی تھی، شہر کا نقشہ تیار ہو چکا تھا، اس کی فصیل اور قلعے کی افتاد ڈال دی

گئی تھی، اور اس کے مغرب میں عید گاہ بنادی گئی جو عید گاہ قدیم کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن سلطان محمد کی بے وقت موت کی وجہ سے شہر سلطان نگر ادھورارہ گیا۔ مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سلطان نگر، سلطان محمد کی آرزو کے مطابق آباد ہو جاتا تو وہ بھاگ نگر کا جواب ہو جاتا۔ اور یہ نہ صرف حیدر آباد کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتیں پوری کرتا، بلکہ اس سے سلطنت گولکنڈہ کا دفاعی انتظام بھی ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی سطح حیدر آباد سے بہت بلند ہے اور دفاعی انتظام کے لیے بہت موزوں ہے، چنانچہ اسی کے مد نظر سلطان محمد نے، سلطان نگر میں پہلے قلعے کی بنیاد رکھی تاکہ بھاگ نگر اور سلطان نگر کی تمام آبادی قلعہ گولکنڈہ اور جدید قلعے کے درمیان آجائے اور دار السلطنت کی خاطر خواہ حفاظت ہو سکے ورنہ خود حیدر آباد ایسا کھلا شہر تھا کہ اس میں حملہ آور آسانی سے داخل ہو سکتے تھے چنانچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں مغل فوجیں آسانی سے شہر میں داخل ہو گئیں اور اس کو نقصان پہنچایا۔

مارتوں میں مکہ مسجد کی تائیس، سلطان محمد کا بڑا کارنامہ ہے، اگرچہ یہ مسجد کئی پشتوں کے بعد جیسا کہ تیار ہوئی، لیکن اس کا نقشہ اور سنگ بنیاد سلطان محمد کی یادگار ہے۔ اس نے کئی محل بھی بنائے تھے، اس کا امان محل بہت مشہور ہے جو اپنی آرائش و زیبائش کے اعتبار سے بڑا اچھا محل تھا، یہ چار منزل بنایا گیا تھا، غالباً یہ بھی داد محل کی طرح عدل گستری کے لیے تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے، انہی محل محمدی محل حیدری محل، کی اس نے مرمت کی تھی اور اس میں اضافے کیے تھے۔ امان محل کے ساتھ ایک پرفضا باغ بنایا گیا جو نبی باغ کے نام سے موسوم تھا۔ علی شغف اور سرپرستی کا لحاظ کرتے سلطان محمد کو اس کے تمام خاندان میں امتیاز حاصل ہے۔ اس نے خود اپنے علم و فن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے، اس کی جو صولہ افزائی کی وجہ سے اس کے زمانے کے علما و شعرا نے بھی بہت کام کیا ہے۔

یگولکنڈہ کی بڑی بدقسمتی تھی کہ سلطان محمد بے وقت موت کا شکار ہو گیا۔ ۱۳۱۳ ہجری الاول ۱۵۲۷ء کو اس کا انتقال ہوا، اس وقت اس کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی اور پندرہ سال سے زیادہ یہ حکومت نہیں کر سکا۔ موت کے اسباب یہ بیان کیے جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسے سخت بخار میں مبتلا ہوا کہ اس کا علاج بہت دشوار تھا۔ دو قسم کے

## تاریخ گولکنڈہ

دواؤں سے کرنا چاہتے تھے، اور ہندوستانی طبیب  
نے ہندوستانی اطباء کی رائے سے اتفاق کیا۔  
اور بالآخر بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ لنگر حوض کے

صاحبزادہ  
مظفر حسین  
کمال

# تیرھواں باب

## حکومت کی کمزوری

سلطان محمد کے انتقال کے بعد قطب شاہی تخت پر اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین کیا گیا۔ یہ مرحوم کا بڑا بیٹا تھا۔ ۲۸ شوال ۱۰۲۲ھ کو اس کی پیدائش ہوئی تھی جس کی سمرت میں متعدد تاریخیں اور قصیدے کہے گئے۔

لے سلطان محمد قطب شاہ کی پانچ اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا عبداللہ قطب شاہ جس کا نام عبداللہ مرزا تھا ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا، اور اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ دوسری اولاد بیٹی تھی جس کا نام خدیجہ سلطانہ تھا جو عبداللہ قطب شاہ کے بعد میں محمد عادل شاہ والی بیجاپور سے بیاہی گئی۔ تیسرا بیٹا ابراہیم مرزا تھا جو عبداللہ کی تخت نشینی کے دوسرے سال مر گیا۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو رشید بی بی نامی ایک اور بیوی کے بطن سے دو بیٹے ہوئے تھے، جن کے نام قلی مرزا، اور مرزا کمال بتائے جاتے ہیں۔ حلیۃ السلاطین ص ۲۱۔

فرانسیسی سیاح تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی ماں ایک برہمن عورت تھی۔ یہ بڑا بیٹا نہیں تھا، بلکہ عبداللہ کا ایک علاقائی بھائی اور تھا جو اس سے بڑا تھا۔ عبداللہ کی ماں نے اس کو قید کر کے اپنے بیٹے کو تخت نشین کر دیا۔ اور مغلوں کے حملے کے زمانے میں جو ۱۰۶۶ھ میں ہوا، اس کو زہر دے کر مارا گیا۔ سیاحت نامہ تھیونو۔ لیکن گو لکھنڈے کی تاریخوں سے اس کی تفریق نہیں ہوتی۔ تھیونو ۱۰۶۵ھ میں گو لکھنڈہ آیا تھا۔

حضرت میرمومن استرآبادیؒ نے کام بخش جاہاں سے اس کی تاریخ اخذ کی تھی اور نظام الدینؒ نے یہ قطعہ تہنیت لکھا تھا:-

از آسمان قطبشہسان بنیر طلوع <sup>قطعہ</sup> کردہ کہ سعد گشتہ از دھجہ و مشتری  
مھرے طلوع کرد ز برج شہنشاہی <sup>قطعہ</sup> کز نور آن جو آئینہ شد سطح معنوی  
در سے ز درج غیب عیاں شد کہ پوش <sup>قطعہ</sup> شد بر زرقیہ ایزد بہ قہر اختری  
این گوہر نیکا نہ چو از لطف نہ صحت آمد برون بہ ششخہ ہجرنا وری  
در دادین ندائے تاریخ عقل کل <sup>قطعہ</sup> با حسن یوسف آمد و شان بکندری  
۸۱۰۲۳

عبداللہ قطب شاہ کی پرورش عجیب طریقے سے ہوئی تھی یعنی محل میں ماں باپ کے پاس اس کی پرورش نہیں ہوئی بلکہ قطب الدین نعمت اللہؒ مرزا شریف شہرستانی اور خواجہ مظفر علی جیسے بزرگوں نے اپنی گھڑ میں شہزادے کی پرورش کی اور بارہ سال کی عمر تک یہ محل میں نہیں بلایا گیا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے محل میں آنے کے چند روز بعد ہی سلطان محمد کا انتقال

۱۔ حضرت میرمومنؒ کے فرزند میر محمد الدینؒ نے اور دو تاریخیں نکالی تھیں: "قرۃ عین الانسان"۔ "ادایۃ فتح و ظفر آخر رخ و الم اسد"۔ اور نظام الدینؒ نے یہ تاریخ لکھی ہے بہر تاریخ عقل دورانیش۔ "افیت سلطان بنور بدیع معنی" (حدیقۃ السلاطین ص ۷۷)۔ ۸۱۰۲۳  
۲۔ عجیب روایت یہ مشہور ہے کہ عبداللہ مرزا کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ بیچہ باپ کے پہلے ہوگا۔ ان کے مال سے پہلے بادشاہ کو اس کی صورت نہ دیکھنی چاہیے ورنہ بادشاہ مر جائیگا۔ اس لیے اس کی پرورش محل کے باہر کی گئی تھی پہلے شہزادہ میر قطب الدین نعمت اللہ کے سپرد کیا گیا جن کو قطب شاہی خاندان سے رشتہ کی قربت ہوتی تھی لیکن دو سال کے بعد قطب الدین کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ ان کے داماد مرزا شہرستانی مقرر ہوئے جب بچے کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو شہرستانی کا بھی انتقال ہو گیا اس کے بعد حضرت میرمومنؒ کی رائے سے خواجہ مظفر علی بچے کی پرورش کے لیے مقرر ہوئے، دو سال کے بعد یہ بھی مر گئے تو اس کی جگہ مولانا حسین مقرر ہوئے لیکن عبداللہ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو حسب قرار بادشاہ نے بچے کو محل میں بلایا اور دیکھا لیکن بادشاہ کا بھی بہت جلد انتقال ہو گیا یہی مولانا حسین شیرازی نے جو اپنے زمانے کے بڑے علماء تھے عبداللہ کی تعلیم کے لیے مقرر تھے۔ سب تعلیم انھوں نے ہی دی تھی۔ (حدیقۃ السلاطین ص ۸)۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱)۔



ہو گیا چونکہ اس وقت عبداللہ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی اور اس کی کم سنی کی وجہ سے ملک میں بد امنی کا اندیشہ تھا اس لیے اس کی ماں حیات بخش بیگم اور اس کی دادی خانم آغا نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی منصور خاں حبشی وزیر ملک لداں اور ملک یوسف کے ساتھ اس کام کے لیے مقرر ہوا تھا کہ تمام شہر کی نگرانی کرے اور شورش نہ ہونے دے۔ قاسم بیگ کو تو ال کوچا وڑی میں اور اس کا نائب حسن بیگ چارمینار میں متعین کیا گیا کہ چاروں طرف اپنی نظر رکھے اور شورش و فساد نہ ہونے دے۔ خصوصاً باہر کے لوگ شکر و ایرانی خواہ سرکاری ملازم ہوں یا تجارت پیشہ وہ لوٹ مار کے خوف سے بہت پریشان تھے۔ ۱۳۱۶ھ اول ۱۶۲۶ء میں عبداللہ قطب شاہ کو محمدی محل میں تخت نشین کیا گیا پُرانے دستور کے مطابق ملک کے تمام چھوٹے بڑے عہدہ داروں کو خلعتیں دی گئیں سادات علماء اور طلباء کو وظائف و انعامات دیے گئے۔ ہاتھیوں اور رت گاڑیوں میں شکر بھر کر تمام راستوں اور بازاروں میں تقسیم کی گئی، اور تمام ملک میں اس تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، اور نئے بادشاہ کے نام کا سکہ ڈھالا گیا۔ مولانا رونقی نے ”عزیز شہجہان از جلوس شاہ عبداللہ“ اور فقیر سراج نے جو دربار کا شاعر تھا ”شد شاہ دکن قطب زماں عبداللہ“ سے تاریخ تخت نشینی اخذ کی تھی۔

عبداللہ کی کم سنی کے زمانے میں اکابر ملک کی ایک مجلس تولیت، امور سلطنت انجام دیتی تھی، لیکن حیات بخش بیگم اس مجلس کی روح رواں دراصل عبداللہ کی ماں حیات بخش بیگم تھی۔ تمام امور اسی کے مشورے سے انجام

۱۔ حدیقۃ السلاطین ص ۲۰۔ ۲۔ حدیقۃ السلاطین ص ۲۶۔

سے بعض اوقات عبداللہ کی دادی خانم آغا کا بھی حکومت میں اثر محسوس ہوتا ہے، لیکن حیات بخش بیگم تمام امور سلطنت کی ذمہ دار تھی یہ قانون اس وقت پیدا ہوئی تھی جبکہ گولکنڈہ کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی اور حیدر آباد کا شہر آباد ہو رہا تھا، یہ نقوش اس کے دل و دماغ پر ضرور ثبت ہونگے اور نیز اس کی تعلیم بھی اچھے پیمانے پر ہوئی تھی جس کی بہ دولت وہ بڑی مدبر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کے عہد میں بھی حکومت میں ضرور حصہ لیا تھا۔ اور خانی خاں کے اس فقرے سے کہ والدہ عبداللہ قطب شاہ کہ در کل امور ملکی و مالی دخیل مستقل گردیدہ بود (منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۹۲)

۱۰۲۲ھ میں شاہ عباس نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد کو اپنے ساتھ لے کر ایران کی طرف روانہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ محمد خاتم آغا کا داماد تھا، مگر وہ اس خدمت کا اہل ثابت نہ پایا ہوا، اس لیے چند روز کے بعد جب شیخ محمد ایران کی سفارت سے واپس ہوا تو اس کو نائب پیشوا بنایا گیا۔ شیخ محمد جس کے باپ کا نام علی ہے، طوس کا رہنے والا، اور بڑا ذی علم آدمی تھا، اس نے علما و شعرا کی بڑی سز پرستی کی تھی، اور اس کا گھرانہ بھرا رہتا تھا، غالباً اس کی علمیت اور تدبیر کا صحافا کرتے قطب شاہی تاریخ میں حضرت میر مومن کے بعد ہی کا درجہ ہے، لیکن اس نے سلطنت کی ایسی وفاداری نہیں کی جیسے حضرت میر مومن نے کی تھی یہ غالباً سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں ہو گیا ہو گا، اور قطب شاہی ملازمت اختیار کی۔ بادشاہ نے اس کو ۱۰۲۲ھ میں شاہ عباس صفوی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ سفارت سے واپس آئے کہ بعد اس کے پیشوا بنایا جائیگا، لیکن شیخ محمد بادشاہ کے مرنے کے بعد

محمد رضا فایز تھا۔ منصور خاں حبشی میر جملہ بنایا گیا جو ایک زمانے میں حوالدار اور بعد کو عین الملک کی خدمت پر فایز تھا۔ قاسم بیگ کو تو ال اور حسن بیگ نایب کو تو ال کی خدمت پر مامور تھے۔ میر قاسم اظہار الملک تھا جو احمد نیک شریل کی خدمت انجام دیتا تھا۔ اعتماد راؤ ہندی فرامین کے لیے مقرر تھا۔ اراہن راؤ مجموعہ دار تھا، اور سرور راؤ ذریعہ نویسی کا کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ محل کے دوسرے عہدہ داروں کا بھی رد و بدل ہوا۔

لیکن یہ انتظام ہمیشہ قائم نہیں رہا۔ نئے عہدہ دار خود غرض اور نا اہل ثابت ہوئے اور آپس میں لڑنے لگے پہلے تو منصور خاں حبشی کی وجہ سے جو میر جملہ کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا، کام خراب ہوا کیونکہ یہ انپڑ تھا، حساب کتاب کا تمام کام برہمنوں سے لیتا تھا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تمام برہمن جیلہ الملکی کے محکمے پر قابض ہو گئے۔ یہ بہت جلد بادشاہ کا مقرب ہو گیا، اور اس اعزاز سے فائدہ اٹھا کر تمام اکابر ملک کے ساتھ بیجا بد سلوکی کرنے لگا، اور بادشاہ کی طبیعت پر اس قدر حاوی تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہنشاہی نہیں ہوتی تھی، اکثر عہدہ دار اس کے مخالفت ہو گئے جو خود شاہ محمد شہزادے اس کی ان بن ہو گئی اس کو نیچا دکھانے کے لیے منصور خاں نے سید محمد اسفندی کو ہندوستان سے بلانے کی کوشش کی تاکہ وہ شاہ محمد کی جگہ پیشوا ہو جائے۔ دوسری طرف قاسم بیگ کو تو ال سے مخالفت ہوئی تو اس کو معزول کرنے کی کوشش کی اور اس کی جگہ پر مچھلی بند کے حوالدار ملا محمد تقی کو گوگنڈہ بلایا جو اس کا دوست تھا قاسم بیگ کو علیحدہ کرنے کی یہ صورت نکالی کہ اس کے ساتھ بعض حبشیوں کی جھڑپ کرادی، حبشیوں کی کھلی گستاخی تہ تھی لیکن ان کو کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ قاسم بیگ یہ گستاخی برداشت نہیں کرتا تھا۔ آخر اپنی خدمت سے مستعفی ہو گیا، لیکن جب منصور خاں کے منصوبے کے خلاف بادشاہ نے قاسم بیگ کے نایب حسن بیگ کو مستقل کو تو ال کر دیا تو اس نے اپنے دوست کی اس طرح تلافی کی کہ اس کو اپنا نایب بنا دیا، اور

واپس آیا، اور عبداللہ نے مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق اس کی عزت کی۔ حقیقۃ السلاطین ص ۲۹۔

۱۔ سید محمد اسفندی سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں گوگنڈہ کے ملازم تھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر نوکری

اور مغل سلطنت کا ملازم ہو گیا۔

میر جملہ کے تمام فرائض اس کے سپرد کر دیے مگر ۱۰۴۱ھ میں خود منصور خاں کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے اس کی جگہ محمد تقی کو میر جملہ بنا دیا جو بہت اہل ثابت ہوا، اس نے چند ہی روز میں سرکاری آمد و خرچ کی تنقیح کی جن لوگوں نے سرکاری رقم غبن کی تھی ان کا محاسبہ کیا، چنانچہ اس جرم میں بہت سے چودھری قتل کیے گئے، خود ناراین راؤ مجموعہ دار سے ایک لاکھ تیس ہزار ہوں وصول کیے گئے، اس صلے میں محمد تقی کو شریف الملک کا خطاب ملا تھا چند روز کے بعد پیشوائی کی خدمت بھی معروض بحث میں آگئی، شاہ نے صرف نا اہل ثابت ہوا بلکہ اس نے سلطنت کے خلاف غداری بھی کی اس کے بہت سے خطوط جو محمد عادل شاہ کے نام لکھے تھے پکڑے گئے، اور خارجی معاملات میں جو اس زمانے میں مغل سلطنت کے ساتھ بہت پیچیدہ ہو گئے تھے، یہ ناقص ثابت ہوا چنانچہ جب شاہجہاں کی طرف سے مغل سفیر شیخ محی الدین آیا تو اس کے ساتھ خاطر خواہ گفتگو نہ ہو سکی، بلکہ ایک ٹھن پیدا ہو گئی، ان حالات کے بد نظر عبداللہ قطب شاہ نے شاہ محمد کو پیشوائی سے معزول کر کے شیخ محمد کو مستقل پیشوا بنا دیا، اور اس کو اس قدر عزت دی کہ وہ پاکی میں بیٹھ کر محل میں آتا تھا، اور اس کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی اس تقرر سے شیخ محمد کے حاشیے کے لوگ بہت خوش ہوئے۔

۱۔ حدیقۃ السلاطین ص ۶۴۔

۲۔ تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان خطوط میں کیا لکھا گیا تھا، اور ان میں کیا غداری تھی قیاس یہ ہے کہ یہ تمام خطوط شیخ محمد کے بنائے ہوئے جعلی تھے، کیونکہ شیخ خود پیشوائی چاہتا، اور شاہ محمد کا نایب ہونے کی وجہ سے دونوں میں پہلے سے ان بن بھی تھی بعض خطوط تو شاہ محمد کے نہ تھے، شاہ قاضی ہاتھ کے لکھے ہوئے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے اور نظام الدین اس کی توثیق یہ کرتا ہے کہ شاہ محمد کا خط اچھا نہیں تھا، اس لیے یہ خط شاہ قاضی سے لکھائے گئے تھے، لیکن یہ یاد رہے کہ نظام الدین شیخ محمد کا متوسل اور ہمدرد تھا، قریبی قیاس یہ ہے کہ وہ شاہ محمد کے مقابلے میں شیخ محمد کی تائید کرتا ہے۔

۳۔ مولانا عرب خوشنویس شیرازی نے: محمد ابن علی پیشوائے سلطان شد کے مصیبت سے اس تقرر کی تاریخ اند کی تھی، اور حدیقۃ السلاطین کے موقع نظام الدین نے حسب ذیل قطعے لکھے تھے: نظام الدین شیخ محمد کا بہت مداح ہے اور اپنے کو گولکنڈہ میں حال نشین آن مجلس بہشت آمین کہتا ہے، غالباً اس کی ترقی شیخ محمد کے توسط سے ہوئی تھی۔

اور ان لوگوں کو جو اکثر باہر سے آئے تھے شیخ محمد نے بڑی ترقی دی چنانچہ پیشوائی کے انتظام کے بعد جب دبیر کی خدمت شیخ محمد سے واپس لے لی گئی تو اسی کے مشورے سے مولانا ادیس اس عہد پر فائز کیا گیا، یہ شیخ محمد کا آوردہ تھا۔ اس کے علاوہ مرزا قاسم حکیم نظام الدین احمد حکیم جہیل۔ اخلاص خاں وغیرہ کئی لوگ شیخ محمد کے توسط سے گولکنڈہ آئے اور مختلف خدمات پر فائز ہوئے۔ خود غرض وزراء کی بے اعتمادی کے علاوہ بادشاہ وقت بھی اپنے مشیروں کے خلاف بہت تن آساں اور سہل انگار ثابت ہوا اگرچہ تخت نشینی کے بعد پانچ چھ سال تو اس کی کم سنی گزری جبکہ سلطنت میں ایک مجلس توبیت کام کرتی تھی لیکن اس کے بعد جب وہ سن شعور کو پہنچا اور عنان حکومت خود اپنے ہاتھ میں لی تو اس سے وہ قابلیت ظاہر نہیں ہوئی جو اس کے پیشرووں میں تھی۔ عبداللہ سن شعور کو پہنچنے تک اپنی ماں جیات بخشی بیگم کی سخت نگرانی میں رہا تھا۔ اس کے بعد بھی جب تک جیات بخشی بیگم زندہ رہی اس کا ضرور اثر پڑتا رہا، لیکن یہ محل کا درپردہ اثر تھا، اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ نیز عبداللہ میں فطرتاً سیاسی تدبیر اور بیدار مغزی کے وہ جوہر نہ تھے جو ایک سلطنت کے ناخداۓ سیاست میں

شہے یوسف رخ جمشید حشمت	کہ حاتم میکند از دے گدانی	قطعہ (۱)
نہ فرجام جہت کردہ تمکن	محمد را بہ صدر پیشوائی	
بہ سامان شد مہام لک و ملت	کہ بود اتر ز آفات سمائی	
متاع فضل و دانش بود کاسد	کنون گرفت در عہدش سوائی	
جہاں محمود گردیدہ بدان سان	کہ شد محو از خلایق بے نوائی	
بہ الہام آمد این مصراع تاریخ	محمد یافت از حق پیشوائی (حدیقہ اسلاطین ص ۶۶)	
چو نور و راست این عہد ترقی	کہ گیتی شد بعیش و عشق دمساز	قطعہ (۲)
محمد پیشوائے شاہ چون شد	جہاں را خرمی گردیدہ آقا ز حدیقہ اسلاطین ص	

ہونے چاہئیں! نے کبھی سیاسی امور پر تنقید کی سے غور نہیں کیا بلکہ پیچیدہ صورت حال سے دامن چھڑانے کی کوشش کی جنگ کے نام سے وہ دور بھاگتا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی حقیقی رہنمائی تمام وزراء کے ہاتھ میں تھی جو اکثر اہل اعتماد نہ تھے اور خود غرنسی سے فیصلے کرتے تھے ہمیشہ جنگ سے گریز کیا گیا اڑے وقت میں احمد نگر کی کوئی مدد نہیں کی گئی، حالانکہ یہ گولکنڈے کا پرانا مسلک تھا۔ ان کمزوریوں سے مغل سلطنت کو گولکنڈے میں قدم جانے کا موقع مل گیا۔

عبداللہ کی تمام عمر عیش و عشرت اور سیر و تفریح میں گزری۔ ہر برسات کے موسم میں یہ تفریح کے لیے دارالسلطنت سے باہر جاتا تھا تخت نشینی کے پہلے سال باغ لنکم پل اور بنات گھاٹ کی سیر ہوئی اور وہاں عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا کیے گئے تھے اس میں کئی مہینے صرف ہوئے۔ دوسرے سال سالگرہ کی رسم اس تزک و احتشام سے منائی گئی کہ اس میں ہزاروں روپیے صرف ہوئے اور رقص و سرود اور تراش و زیبائش کا پورا انتظام ہوا، تمام عمارات اور باغات میں روشنی کی گنج۔ دو سال کے بعد ۱۰۳۷ھ میں کوہ طور کی سیر ہوئی اور یہاں ایک مہینہ بسر ہوا۔ ۱۰۳۸ھ میں برسات کا موسم شروع ہوا تو پھر باغوں کی تفریح شروع ہوئی اور اس میں بھی کئی مہینے صرف ہوئے۔ ۱۰۳۹ھ میں ایک اور بہت بڑی رسم مو تراشی وغیرہ کی رچائی گئی جس کا انتظام اور خرچ حیات بخشی بیگم نے برداشت کیا تھا، اس کا انتظام حیات آباد میں ہوا، حیدر آباد سے حیات آباد کو جلوس گیا، اور یہاں کئی مہینے دربار جلوس رقص اور سرود کی محفلیں منعقد ہوئیں اور اہل ملک کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ انعامات دیے گئے چنانچہ اس قلعہ سے اس عظیم الشان رسم کی یاد تازہ ہوتی ہے:-

چونور و راست این عید طرب خیر  
شگفتہ غنچہ شادی ز بہر دل  
گلستان ارم گردیدہ عالم  
گل بے خار گشتہ عیش بے غم  
شدہ در بزم عشتہ جام بہرینہ  
نوک نغمہ چو سخن عنادل

غرض اسی قسم کے عیش و طرب سے یہ عہد بھرا ہوا ہے اس سے فارغ ہوتے تھے تو مذہبی رسوم میں بکسپی لاجاتی تھی مذہبی رسوم میں بجا بے حد مبالغہ کیا گیا محرم اور ربیع الاول کے مقدس ایام میں غیر معمولی اہتمام کیا جاتا تھا، اور خود بادشاہ ان تمام رسوم میں حصہ لیتے تھے۔ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور تمام شہر و عمارات میں روشنی کی جاتی تھی اور غرباء و مستحقین کی امداد کی جاتی تھی۔



٦) سلطان عبداللہ قطب شاہ

# چودھواں باب

## احمد نگر کا خاتمہ اور گولکنڈے کی حکمرانی

سلطان محمد قطب شاہ کی وفات جو ۱۰۳۵ھ میں واقع ہوئی گولکنڈے کے لیے پیام موت تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سلطان محمد کے ساتھ دکن کے دوسرے رہنمایان سیاست یعنی ملک عبید اللہ اور ابراہیم عادل شاہ بھی راہی عدم ہو گئے اور ان سب کا ایک ساتھ مرنا دکن کی تاریخ کے لیے ایک عجیب و غریب سانحہ تھا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تینوں ناخدا یا سیاست آزادی دکن کے رکھوال تھے جب تک یہ زندہ رہے انہوں نے مقدر بھر دکن کا اقتدار قائم رکھا۔ ملک عبید اللہ دکن کی تینوں طاقتوں کو ملا کر ایک ایسا متحدہ محاذ بنایا تھا کہ اپنی عظیم الشان طاقت کے باوجود مغل سلطنت اس کو نہیں توڑ سکی لیکن جو بھی یہ علمبردار دنیا سے خست ہو گئے دکن کی آزادی مترازل ہو گئی۔ احمد نگر کا تو ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اب رہی گولکنڈے اور بیجا پور کی سلطنتیں تو مغل سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو گئیں کیونکہ شمال میں احمد نگر کی سلطنت ان کے لیے فحشیل کا کام دیتی تھی جب احمد نگر کا خاتمہ ہو گیا تو یہ بالکل بے پناہ ہو گئیں اور مغل سلطنت کے سیلاب کو نہیں روک سکیں جو اب بغیر مزاحمت کے سیدھے گولکنڈے اور بیجا پور پر اُمڈ آتا تھا گولکنڈے میں سلطان محمد کا جانشین ایک کم سن بچہ تھا جو سن مشور کو پہنچنے کے بعد ہی حکومت کے بارگراں کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

۱۔ سلطان محمد قطب شاہ ۱۳ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ میں اور ملک عبید اللہ ۲۴ شعبان ۱۰۳۵ھ میں راہی عدم ہوئے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ۱۰۳۶ھ کو فوت ہوا۔



گولکنڈے کو بھی دکن کی تمام رفتار سیاست کا ساتھ دینا پڑا اس طریقے سے ۱۰۳۵ھ کو تاریخ دکن کی ایک حد فاصل سمجھنا چاہیے جہاں دکن کا پچھلا خوشگوار اور اقبال مندرمانہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ سلطنتیں نہ صرف مقتدر تھیں بلکہ اپنے اقتدار کے زور سے اپنے تمدن کو آگے بڑھائی تھیں اور اب ایسا زمانہ آیا کہ نہ صرف یہ حلقہ گوش ہو گئیں بلکہ شمالی طاقت کے ساتھ ابھکر زوال کے گڑھے میں گرنے لگیں۔

احمد نگر کی سلطنت میں فوری زوال کے اسباب پیدا ہو گئے۔ احمد نگر تو گجپور سے دکن میں ملک عبز کا کوئی صحیح بانی نہیں پیدا ہوا۔ گو اس کا بیٹا فتح خاں تھا جو باپ کی جگہ اس بد نصیب سلطنت کا پیشوا ہوا تھا مگر وہ نہ صرف نا اہل بلکہ بے وفا ثابت ہوا۔ مرتضیٰ نظام شاہ ثانی سے اس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہو سکے اور کشیدگی یہاں تک پہنچی کہ چند روز کے بعد ہی مرتضیٰ نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اگرچہ بہت جلد یہ قید سے فرار ہو گیا، اور احمد نگر کے مغل قلعہ دار سپہ دار خاں سے مل کر مرتضیٰ سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن احمد نگر کی فوجوں نے اس کو زیر کر کے گرفتار کر لیا، اور یہ پھر دولت آباد کے قلعے میں مقید کر دیا گیا۔ مقرب خاں سلطنت کے سر لشکر، اور اخلاص خاں پیشوا مقرر ہوئے ایک اتفاق یہ ہوا کہ احمد نگر کی خوش قسمتی سے دکن کے مغل گورنر خان جہاں نے مرتضیٰ نظام شاہ سے ساندہ باز کر لی اور اس کی بے وفائی کی وجہ سے مغل سلطنت کے خلاف قحطی مرتضیٰ کو بالاکھاٹ کے بہت سے مغل مقبوضات حاصل ہو گئے اسی دوران میں شہنشاہ جہانگیر کا بھی انتقال ہو گیا، اور کچھ وقفے کے بعد ۱۰۳۸ھ میں شارجہاں شہنشاہ ہو گئے۔ شہنشاہ خاں جہاں لودی کی چھٹی بے وفائی سے واقف نہیں تھے، انھوں نے خان جہاں کی گورنری بحال رکھی، لیکن یہ احکام چھوڑے ہوئے مغل علاقے حاصل کیے جائیں جب ان احکام کی پابندی نہیں ہوئی تو شہنشاہ نے خان جہاں کو گورنری سے معزول کر کے مہابت خاں کے بیٹے زماں خاں کو دکن کا جائزہ دے دیا لیکن خان جہاں نے شہنشاہ کے فدا ان کھلم بغاوت کر دی جو معزولی کے بعد یہ شمالی ہند گیا، اور دربار میں آمد و رفت کی، لیکن شہنشاہ کے دل میں اس کی طرف سے بے اعتمادی برابر بڑھتی گئی بالآخر اگر سے سے بھاگ کر اس نے مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس پناہ لی۔ مرتضیٰ نے اس کی بڑی آؤٹنگ کے بعد مغل سلطنت کے غلاموں کا اعلان جنگ کیا تھا! احمد نگر کے اس مخالفانہ طرز عمل سے جنگ کے فوری اسباب

پیدا ہو گئے۔

اس سے پہلے احمد نگر نے بالا گھاٹ کے اکثر مغل علاقے دبا لیے تھے اور اس پر بگڑہ یہ کہ اس وقت احمد نگر مغل حملے

مغل سلطنت کے ایک، باغی خان جہاں کو پناہ دے دی اس سے نہ صرف شہنشاہت کو جنوب سے نون ہوا بلکہ مغل سلطنت کا وقار بھی بہت خطرے میں پڑ گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کو دکن میں اپنا شہنشاہی رعب و داب بھی قائم کرنا تھا، کیونکہ گذشتہ بغاوت کے زمانے میں جو اس نے اپنے باپ کے خلاف کی تھی دکن میں اس کی بہت کچھ رسوائی ہو چکی تھی ایسی شہنشاہی افواج سے بڑنے کے لیے اس کو سلاطین دکن سے درپوزہ گری کرنی پڑی تھی، اس کی تلافی کے لیے خود شہنشاہ بہان پور آ گئے اور دکن پر حملہ کرنے کے لیے اعظم خاں کے تحت تین فوجیں بھیج دیں ایک بالا گھاٹ پر حملہ کرنے اور خان جہاں کو گرفتار کرنے کے لیے، دوسرے خواجہ ابوالحسن کے تحت ناسک اور سنگم کے لیے اور تیسری ناصری خاں کے تحت مشرق میں تلنگانہ کے لیے بھیجی گئی یہ فوجیں بہت کامیاب ہوئیں، باجوہ بیجا پور تک امداد کے اعظم خاں نے خان جہاں کو شکست فاش دی قلعہ دہارور اور قلعہ صابر پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف خواجہ ابوالحسن نے ناسک اور سنگم سخر کر لیے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ خود احمد نگر کی مرکزی حکومت میں ایک نیا سیاسی انتشار پیدا ہو گیا، یعنی اس اثنا میں مرتضیٰ نے یہ غلطی کی کہ فتح خاں کو قلعے سے رہا کر دیا اس کا سبب یہ تھا کہ مرتضیٰ کی بیوی جو فتح خاں کی بہن تھی بادشاہ کو مجبور کرتی تھی کہ اس کے بھائی کو قید سے رہا کرے۔ یہ رہائی بالکل بے موقعہ ثابت ہوئی فتح خاں پھر پیشوا بنا دیا گیا جس سے مقرب خاں ناراض ہو کر مغلوں سے مل گیا اور وہاں وہ رستم خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور ادھر فتح خاں نے اپنا پیرانا انتقام لینے کے لیے بادشاہ کو قتل کر دیا اور مقتول کے بیٹے حسین نظام شاہ سوم کو جس کی عمر صرف دس سال کی تھی تخت نشین کر دیا۔ بادشاہ کے

یہ اس اڑے وقت میں بیجا پور نے احمد نگر کی مدد کی تھی کیونکہ احمد نگر کے علاقے سے دوسری دکنی سلطنتوں کو بھی ڈر لگتا تھا۔ بیجا پور سے رعد و لہ خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ مقرب خاں کی امداد کے لیے بھیجا گیا تھا۔

قتل کی وجہ سے فتح خاں کے خلائق ملک میں ایسی سخت بے چینی پیدا ہو گئی کہ اس کا ملک میں ٹھیکرنا مشکل ہو گیا، اور اس کا بچاؤ صرف اسی بات میں تھا کہ شاہجہاں کی اطاعت اختیار کر لے۔ شاہجہاں نے فتح خاں سے نظام شاہی خاندان کے تمام ہاتھی اور حواہر طلب کیے۔ اس نے کچھ لیت و حل کیا تو وزیر خاں اور رستم خاں دولت آباد کی تسخیر کے لیے بھیجے گئے، فتح خاں بہت ڈر گیا، اور مجبوراً ملک میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا دیا، اور سکے ڈھلوائے (۱۶۳۲ء)۔

یہ واقعات ایک حد تک مغل سلطنت کے لیے اطمینان بخش تو تھے لیکن ان سے پوری یکسوئی دولت آباد کا خاتمہ نہیں ہو سکی کیونکہ فتح خاں کی اطاعت مغل سلطنت کے لیے قابل اعتماد نہیں تھی۔ دوسرے بجا پور نظام شاہی سلطنت کی امداد کے لیے تیار تھا ایک اور دقت تھی کہ شاہجی جو اس وقت مغلوں کی ملازمت میں جنیرا اور آس پاس کے اضلاع پر قابض تھا مغلوں کا مخالف ہو گیا، اور بجا پور سے اتحاد کر کے مغل سلطنت کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی۔ پہلے فتح خاں اور شاہجی میں ان بن تھی لیکن بجا پور کے سپہ سالار رندولہ خان بیچ بچاؤ سے تینوں طاقتیں متحد ہو گئیں۔ جب شاہجہاں کو یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے مہابت خاں کو دکن کی کمان دی۔ پہلی مارچ ۱۶۳۳ء کو مہابت خاں کی فوجوں نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کیا۔ شاہجی رندولہ خاں اور مرادی راؤ نے باہر سے مغل فوجوں کو پریشان کرنے کے لیے بہتری کوشش کی لیکن سب بے سود ہوا، مہابت نے قلعہ مہا کوٹھ کی فصیل اڑادی تو فتح خاں نے ڈر کر ہتھیار ڈال دیے اور اپنے بیٹے عبدالرسول کو مہابت خاں کے پاس بھیج دیا۔ اس طریقے سے مغل فوجیں قلعہ دولت آباد پر قابض

۱۔ شاہجی سیواجی کا باپ ہے، یہ اور اس کے باپ دادا احمد نگر کے ملازم اور جاگیر دار تھے۔ جس زمانے میں شاہجہاں برہان پور آئے تھے، یہ مرتفعی نظام شاہ سے ناراض ہو کر شہنشاہ کے پاس چلا گیا، اور پنجہزاری منصب پایا۔ مرتفعی سے ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ مرتفعی نے اس کے خسر لکھوجی جادو رائے کو قتل کر دیا تھا، لیکن چند روز کے بعد وہ شاہجہاں سے بھی ناراض ہو گیا، کیونکہ شاہجہاں نے احمد نگر کے چند موضع جو فتح خاں کی جاگیر تھی اس کو دیے تھے، لیکن فتح خاں نے اطاعت اختیار نہ کر لی تو اس کی جاگیریں بحال کرنا پڑا، اس طرح شاہجی محروم ہو گیا۔

ہو گئیں۔ فتح خاں اور حسین نظام شاہ سوم شاہجہاں کے ہاں اگر بھیجے گئے (۲۱ ستمبر ۱۶۳۳ء)۔

اگرچہ دولت آباد کی تسخیر سے سلطنت احمد نگر کے تمام دست بازو بھڑ گئے اور اس کے تمام اعضاء سیاسی کا خاتمہ ہو چکا تھا، لیکن یہ سلطنت کچھ ایسی سخت جان تھی کہ اس کے باوجود اس کا کچھ نہ کچھ شہ لگا رہا۔ پونا، چالن وغیرہ کے اقطاع ابھی نظام شاہی افسروں کے ہاتھ میں تھے اور پرہیزگار جو اب نظام شاہی طاقت کا مرکز بن گیا تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود تھا۔ شاہجی نے نظام شاہی خاندان کے ایک اور لڑکے کو بادشاہ بنا کر پرہیزگار میں قدم جمایا اور مغل علاقوں میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ اس وقت دکن کے حالات بھی اس کے لیے بڑے خوشگوار ثابت ہوئے۔ شاہجہاں دکن میں نہیں تھے اور مغل سپہ سالار مہابت خاں جس نے دولت آباد کی تسخیر کی تھی راہی عدم ہو چکا تھا۔ اس صورت حال کے مقابلے کے لیے مغل سلطنت نے پھر جنبش کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ شاہجہاں پھر ۱۶۳۵ء میں دکن آگئے، پہلے برہان پور آئے اور اس کے بعد دولت آباد میں آکر قیام کیا چونکہ بیجا پور اور گولکنڈے کی سلطنتیں درپردہ احمد نگر کی مدد کرتی تھیں اس لیے پہلے ان سلطنتوں کو حاصیوں کے ذریعے تنبیہ کر دی گئی کہ وہ اس طرز عمل سے باز آئیں، اور دولت آباد میں آنے کے بعد شاہجہاں نے اپنی فوج کے تین حصے کر کے ایک حصہ خاں دوراں کے تحت قندھار، اور ناندیڑ بھیجا کہ بیجا پور اور گولکنڈے کی پیش قدمی روکے۔ دوسرا حصہ خاں زماں خاں کے تحت احمد نگر بھیجا گیا کہ آٹھٹی، اور کوکن پر وار کرے اور تیسرا حصہ شامیستہ خاں کے تحت جفر، اور ناسک کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا۔ اگرچہ مغلوں کی فوجیں بہت کافی تھیں اور اس اثنا میں محمد عادل شاہ والی بیجا پور نے بھی مغلوں کی اطاعت کر لی تھی اور بیجا پور کا مشہور جنرل رندولہ خاں مغلوں کے ساتھ لڑ رہا تھا، تاہم جنگ کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکا کئی مہینوں کی لڑائیوں کے بعد شاہجی نے ہتھیار ڈالے اور اس کو بیجا پور میں ملازمت کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس طریقے سے ۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا جس کے لیے مغل سلطنت کو چالیس سال لڑنا پڑا تھا۔

احمد نگر کے خاتمے کے بعد بیجا پور اور گولکنڈے پر اثر پڑنا ضروری تھا، لہذا بیجا پور اور گولکنڈے کی آزادی بھی سلب ہو گئی اور ان کو مغلوں کا حکم بردار بننا پڑا۔ گو شہنشاہ ہونے سے پہلے شاہجہاں نے

قطب شاہی سلطنت سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کی گولکنڈے کے نئے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کو تخت نشینی کی مبارک باد دی جس طرح ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے شاہ ابن الحسن اور مرقعہ نظام شاہ کی جانب سے شاہ میر جعفر نے رواج کے مطابق مبارک باد کے لیے آئے، اسی طرح شہزادہ خرم شاہ جہاں کی طرف سے اخلاص خاں قزوینی آیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ جہاں گولکنڈے کا پہلے سے بہت ممنون تھا، کیونکہ اس کی بغاوت کے زمانے میں سلطان محمد قطب شاہ نے اس کی بہت مدد کی تھی، اور اب بھی وہ حصول تخت و تاج کے لیے گولکنڈے کی مدد کا محتاج تھا، لیکن جب وہ ۱۶۲۹ء میں شہنشاہ ہو گیا تو اس نے اپنے پرانے رشتے توڑ دیے اور حاکمانہ مطالبات شروع کیے، اور عبداللہ کی کمزور حکومت جو ہمیشہ جنگ و جدل سے گزرتی رہی مہر تسلیم خم کرنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ گولکنڈے کی کمزوری سے مغل شہنشاہت کو بہت فائدہ پہنچا۔

تخت نشیں ہونے کے بعد شاہ جہاں نے شیخ محی الدین پیرزادہ جین کو سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا گو یہ سفارت دوستانہ تھی لیکن اس کا رنگ بالکل وہ نہیں تھا جو اس سے پہلے اخلاص خاں قزوینی کے تخت آئی تھی۔ بات یہ ہے کہ اس وقت خانہ جہاں نے بغاوت کی تھی اس لیے شاہ جہاں کو اس بغاوت کا سد بار کرنے کے لیے پورا اور گولکنڈے سے اتحاد عمل کی ضرورت تھی کہ یہ سلطنتیں احمد نگر کی مدد نہ کریں اور باغی کو اپنے ہاں پناہ نہ دیں لیکن ایک طرف قطب شاہی حکومت کی کمزوری سے سیاسی معاملات خراب ہونے لگے، یعنی یہ مغلوں سے ایسی ڈر گئی کہ اس سفیر کی ضرورت سے زیادہ آؤ بھگت کرنے لگی جو سلطنت کے وقار کے منافی تھا۔ دوسرے خود عاجب شہنشاہی رعب سے کام لیکر سلطنت سے ناجائز فائدے حاصل

۱۔ حدیقۃ السلاطین (مطبوعہ) ص ۲۷-۲۸-۲۹۔ حدیقۃ السلاطین ص ۶۲۔

۲۔ ایک روایت یہ ہے کہ شاہ جہاں کی جانب سے ہر پہینے سفارت آنے لگی (حدیقۃ السلاطین ص ۷۸)۔

۳۔ حدود سلطنت میں داخل ہونے سے پہلے سید عبداللہ شاہ نے سفیر کا استقبال کیا، اور جب سفیر مہر حد کے اندر آیا تو میر قاسم ناظر نے خیر مقدم کیا، اور قلعہ درگ تیک لایا، اور ہر منزل پر اس کی شاہی ضیافتیں ہوتی رہیں جو محض درگ میں

کرنے لگا، اور بہترے مطالبات پیش کیے۔ بادشاہ اور اس کے پیشوا شاہ محمد ایسے کمزور تھے کہ سفیر کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے تھے، اس لیے عبداللہ قطب شاہ نے شاہ محمد کو خدمت سے علیحدہ کر کے شیخ محمد کو جواب تک صرف نایب پیشوا کے فرائض انجام دیتا تھا، پیشوا بنا دیا۔ شیخ نے پوری قوت سے مغل سفیر کے جواب دیے اور گولکنڈے کے آداب شاہی کی پابندی کروائی اور جب سفیر نے مزاحمت کی تو آصف خاں سے جو اس زمانے میں مغل افواج دکن کا سپہ سالار تھا، سفیر کی سخت شکایت کی گئی اور اس کا اچھا اثر ہوا، یعنی مغل حکومت نے اپنے سفیر کی پوری گوشمالی کی اور ۱۶۴۳ء میں جبکہ شاہجہاں برہان پور آگئے تھے شیخ محی الدین کو واپس کر دیا گیا۔ جاتے ہوئے اس کو چند گھوڑے، ہاتھی اور بیس ہزار ہون نقد دیے گئے اور اس کے ساتھ گولکنڈے کی طرف سے دفا خاں جس کا اصل نام یوسف تھا اگر انہما تحفوں کے ساتھ جن میں ہاتھی، گھوڑے خالص سونا، اور مرصع آلات شامل تھے، شاہجہاں کے پاس بھیجا گیا۔ شاہجہاں ان تحفوں سے بہت خوش ہوئے دفا خاں کو خلعت وغیرہ دی اور شیخ محی الدین کی سرزنش کی۔

اس زمانے میں شاہجہانی افواج احمد نگر کے خلاف سرگرم کار تھیں۔ بالا گھاٹ کے مختلف اقطاع میں پیشقدمی ہونے لگی، اسی اثنا میں مغل افسر ناصری خاں قندھار پہنچ گیا جو گولکنڈے کے حدود سے قریب پڑتا تھا۔ یہ دیکھ کر قطب شاہی حکومت نے مدافعت کا انتظام کیا۔ چنانچہ آدم خاں حبشی کو جو عین الملکی کی عاقبت پر مامور تھا اللہ قلی بیگ

خود بادشاہ آکر ملے، پھر شہر میں اس کو مرزا محمد امین کے باغ میں ٹھیرا گیا، اس کے بعد محل میں بلا کر بادشاہ نے ایک ہاتھی دو گھوڑے، خلعت، انعام وغیرہ دیے اس کے ساتھ ہیوں کو بہت رقم دی گئی، اودھ کے بعد جب کبھی بادشاہ سے ملاقات ہوتی تھی ایک ہاتھی اور دو گھوڑے دیے جاتے تھے چنانچہ اسی طرح اپنے قیام کے زمانے میں اس صاحب نے ایک لاکھ پچاس ہزار نقد، دس ہاتھی، پچاس گھوڑے اور بے شمار خلعتیں حاصل کر لیں (حدیقۃ السلاطین ص ۶۲-۶۳)۔

۱۷۔ شیخ محمد کی علمی و سیاسی قابلیت مسلمہ تھی مختلف شاہی دربار و شاہی حمایت کے فرائض انجام دے چکا تھا، اور سیاسی جوڑ توڑ سے ابھی طرح واقف تھا۔ ۱۸۔ حدیقۃ السلاطین ص ۶۷۔ ۱۹۔ حدیقۃ السلاطین ص ۷۸۔

اور دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ کولاس بھیجا گیا، اور ضروری فوج جمع کی گئی تاکہ اگر مغل آگے بڑھیں تو ان کی مزاحمت ہو۔ لیکن یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ تاہم سلطنت کے شمال مشرقی حدود جو اڑیسہ کے ہمکنار تھے مغلوں کی پیشقدمی کی وجہ سے مخدوش ہو گئے، کیونکہ باقر خاں نجم ثانی جو اڑیسہ کا مغل گورنر تھا، قاسم کوٹھ میں گھس گیا، اور کالپہار میں ٹوٹ مار شروع کر دی اور اس سے آگے بڑھ کر راج مندیری میں پیشقدمی کرنا چاہتا تھا۔ سید محمد مصطفیٰ خاں نے جو قاسم کوٹھ میں قطب شاہی افواج کا سپہ سالار تھا مرکزی حکومت کو ۲۱ پیشقدمی کی اطلاع کر دی۔ مرکز سے سید عبداللہ خاں اور شاہ علی مدافعت کے واسطے بھیجے گئے، ان دونوں نے قطب شاہی حدود میں اپنے قدم جما دیے، لیکن اسی اثنا میں سید محمد مصطفیٰ فوت ہو گیا، اور اس کی جگہ سید عبداللہ خاں کو سر لشکری دی گئی جب شمال سے باقر خاں نے حملہ کیا تو قطب شاہی فوج تاب نہیں آسکی، شاہ علی کھیت ہو گیا، اور قطب شاہی فوج منہزم ہو گئی عبداللہ قطب شاہ نے خواجہ افضل ترکہ کو جو اس زمانے میں مرتضیٰ نگر میں تھا مغلوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیا، اس نے قاسم کوٹھ میں باقر خاں کا مقابلہ کیا لیکن یہ لڑائی کسے نہیں بڑھی بلکہ مغل حکومت نے اس کا سد باب کر دیا۔ کیونکہ اول تو اس لڑائی میں مغل حکومت کا کوئی ارادہ شامل نہ تھا دوسرے ابھی شاہجہاں قطب شاہی سلطنت سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاہنشاہی احکام کے مطابق باقر خاں نے قطب شاہی حدود سے اپنی فوجیں ہٹالیں۔

لیکن فتح خاں کی چند روزہ اطاعت سے جو ۱۶۴۳ء میں ہوئی شاہجہاں کو اس قدر اطمینان ہو گیا کہ اب وہ دکن کی دوسری سلطنتوں کو زیر کرنا آسان سمجھنے لگا چنانچہ جب قطب شاہی سفیر و فاخاں، شاہجہانی دربار میں پہنچا تو اس کی عرض افزائی کی گئی لیکن اس کے ساتھ مغل سفیر شاہ علی بیگ کو گولکنڈہ بھیجا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ گولکنڈے کی سلطنت پر اپنا اثر ڈالے اس لیے قطب شاہی دربار سے کثیر رقم اور جواہر طلب کیے جو گذشتہ تعلقات کے منافی تھا۔

۱۔ یہ امیر زنبیل مصطفیٰ خاں کا بیٹا ہے۔

۲۔ حریقتہ السلاطین ص ۸۲-۸۳۔



عبداللہ قطب شاہ اور شیخ محمد ان مطالبات کے پورا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے کیونکہ دکن کے نئے حالات سے جو اس وقت مغلوں کے خلاف پیدا ہو گئے انہیں اپنے پہلو پچانے کا ابھی موقعہ تھا۔ بیجاپور کی سلطنت نے اس زمانے میں مغلوں سے اپنے پرانے تعلقات توڑ دیے اور احمد نگر کی تائید میں مغلوں سے برسرِ پیکار تھی، چنانچہ اس وقت آصف خاں کی بیجاپوری فوجوں سے لڑائی ہو رہی تھی، اگرچہ قطب شاہی حکومت نے اپنی پرانی روایت کے خلاف احمد نگر اور بیجاپور کا اس اڑے وقت میں کوئی ساتھ نہیں دیا، اور خاموشی اختیار کی، مگر اس خوشگوار موقع کی منتظر تھی کہ شاید مغل سلطنت کا ستارہ ڈوب جائے۔ اس لیے شیخ محمد نے مغل سفیر کو بہت روز تک دھوکے میں رکھا، اس کی ضیافتیں تو بہت کی گئیں لیکن شاہجہاں کے مطالبات پورے نہیں کیے، کیونکہ گولکنڈے کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بیجاپور کے مقابلے میں مغل فوجوں کو شکست ہو گئی، بالآخر سفیر کو بے نیل مرام واپس کر دیا گیا نیز شاہجہاں اس زمانے میں برہان پور میں نہیں تھے، بلکہ شمال چلے گئے تھے۔

لیکن جب ۱۶۳۳ء میں مہابت خاں نے دولت آباد پر قبضہ کر لیا تو دکن کے حالات پھر بدل گئے اور شاہجہاں بھی ۱۶۳۳ء میں پھر دکن آگیا کیونکہ شاہجی کی مزاحمت کی وجہ سے ابھی دکن کا مطلع صاف نہیں ہوا تھا، لیکن اب گولکنڈے اور بیجاپور کے لیے مزاحمت کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تھا، چنانچہ جب شہنشاہ دریائے نربدا پر پہنچ گئے تو ہندیا کے مقام سے بیجاپور اور گولکنڈے کے نام ان ہدایات کے ساتھ شاہی فرمان اور سفیر بھیج دیے کہ دو

---

۱۔ محمد عادل شاہ نے احمد نگر کو بچانے کے لیے جبکہ مہابت خاں نے دولت آباد کا محاصرہ کیا تھا تو گولکنڈے سے بھی امداد طلب کی تھی، لیکن قطب شاہی حکومت نے مغلوں سے ڈر کر کوئی مدد نہیں کی بلکہ خواص خاں کے فریق کو جو بیجاپور میں مغلوں کے خلاف تھا نیچا دکھانے کی کوشش کی، اور اس پر طرہ یہ کہ جب مغل سفیر شیخ معین الدین بیدر میں گرفتار ہو گیا تو گولکنڈے سے اس کو مدد دی گئی، اور چھار سنگھ جو مغل سلطنت سے بغاوت کر کے گولکنڈے کی سلطنت میں آیا تو فوراً اس کو مغلوں کے حوالے کر دیا گیا (حدیقۃ السلاطین ص ۱۰۲)۔ ظاہر ہے کہ اس کمزوری سے نہ صرف گولکنڈہ بلکہ پورے دکن کو نقصان پہنچا۔



مغل فوجوں کی مزاحمت نہ کریں، بلکہ دکن کے امن و امان کے لیے مغل سلطنت کے ساتھ اتحاد عمل کریں گولکنڈہ کو عبداللطیف گجراتی بھیجا گیا اس سفارت کا اندازہ اور شاہی فرمان کا لہجہ بالکل ماکانہ تھا، اور اس میں مزید جھڑیل مطالبات کیے گئے کہ تحفے کی تکمیل عین حکم برداری تھی اس میں تین قسم کی تہدیدیں تھیں:-

(۱) ایک یہ کہ اصحاب کبار پر ہرا نہ پڑھا جائے:-

”از روئے ارشاد حکم می فرمایم کہ از ملک خویش این امر قبیح و فعل شنیع بر طرف گرداند ورنہ۔۔۔

برالازم است کہ در مقام تسخیر آن ملک شویم۔“

(۲) دوسرے شاہ ایران کا نام خطبے میں نہ پڑھایا جائے بلکہ:-

در آن ملک خطبہ بہ نام نامی و القاب سامی مازین باشد۔“

(۳) تیسرے شہنشاہ کی خدمت میں گرانہوا پیشکش ارسال کرے جس میں ہاتھی، آلات و جواہر ہوں اور اس میں وضاحت

کروی گئی تھی کہ یہ سب چیزیں اچھی قسم کی ہوں اور مقررہ اوقات پر پہنچنی چاہئیں ورنہ:-

”اخراج قاہرہ و مسا کر منصورہ بہ آن ملک خواہند آمد۔“

اس فرمان میں سلطان محمد قطب شاہ کی تعریف بھی تھی اور اس صلیے میں کہ خدمت کے ازان مرحوم و قورما آمد یہ سلطنت مرحوم کے بیٹے پر بحال کی جا رہی تھی۔

شارجہاں کے دوبارہ دکن آنے سے عباد اللہ، اس قدر سہم گیا کہ عبداللطیف گجراتی کے گولکنڈہ

پہنچنے سے قبل ہی اس نے اپنے سفیر لائقا کویش یہاں تحفوں کے ساتھ شہنشاہ کے پاس بھیج دیا۔ اب شہنشاہ کے تہیدی احکام

کے خلاف چون و چرا نا ممکن تھا عبداللطیف کا بڑا استقبال ہوا، اور جگہ جگہ پر اس کی ضیافتیں ہوئیں اور جب

لے۔ بادشاہ نے عبدالحمید لاہوری جلد ۲ ص ۱۲۲-۱۲۳ کہ اس وقت شاہجہاں دوت آباد آگئے تھے، لائقا یہیں باریاب ہوا۔

کہ جب سفیر حدود سلطنت میں داخل ہوا تو کرم خاں اور اس کے بعد میر معز الدین مشرف نے استقبال کیا، اور عید رآباد کے

۲۔ شہنشاہ نے ظاہر فرمایا کہ اس کو میر جلد ماضی کی حویلی میں ٹھہرایا گیا۔

بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو اس کو بے شمار انعامات دیے گئے لیکن شہنشاہ نے مزید بادشاہ کے لیے خاں دوراں کو گولکنڈہ کے لیے اور خاں دہاں کو بیجا پور کے لیے روانہ کیا کہ یہ سلاطین کوئی جہش نہ کر سکیں۔ خاں دوراں کی فوج ناندی پور تک پہنچی جو گولکنڈہ کی سرحد سے بہت قریب تھا۔ سرحد کے لوگ سخت پریشان ہوئے۔ عبداللہ قطب شاہ نے نصیر الملک عین الملک یوچی بیگ اور شجاع الملک کو مدافعت کے لیے بھیجا اور خود مرکز میں قلعہ گولکنڈہ کی مرمت کروائی اور قلعے میں تھیلہ اور توپیں اور ضروری غلہ جمع کر دیا لیکن یہ تمام مدافعتی تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں کیونکہ شہنشاہ نے جو مطالبات پیش کیے تھے ان کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ شیخ محمد پیشوا نے عبداللطیف کی اپنے گھر میں پر تکلف ضیافت کی اور گرفت شدید کے بعد ۱۶۳۵ء میں ایک صلح نامہ یا اقیاد نامہ لکھا گیا جس میں شہنشاہ کی تمام شرطیں تسلیم کی گئیں۔ حتیٰ کہ خلیفہ میں چار خلفائے راشدین کو شاہجہاں کا نام لیا جائیگا، اور سکے پر

لے گولکنڈہ کا مورخ کہتا ہے کہ شاہجہاں کو عبداللطیف سے متعلق کہ اس کا کس طرح خیر مقدم ہوا تھا، کوئی اطلاع نہ تھی۔ غالباً شہنشاہ نے یہ سمجھا تھا کہ اس کی شرطیں تسلیم نہیں کی گئیں (حدیقۃ السلاطین)۔ مگر نظام الدین کہتا ہے کہ اس مدافعتی انتظام سے عبداللطیف بہت گھبرایا اور اس نے شاہجہاں کو اطلاع دی کہ عبداللہ قطب شاہ جو تیس دن اس کو قبول کر لینا چاہیئے (حدیقۃ السلاطین)۔

لی خلیفہ سے متعلق عبداللہ قطب شاہ نے اپنے ملک کے علماء سے اس کی تلقین کرنا شروع کر دی تھی کہ آیا یہ شرط تسلیم کرنی چاہیئے؟ انہوں نے غور و خیر سے یہ سمجھ کر کہ اس کے متعلق اپنا فرائض ادا کر دی (حدیقۃ السلاطین)۔

گولکنڈہ کے سلاطین بہت زمانے سے ایرانی صفوی فائدہ ان سے متحد تھے اور اس کا محرک ایشیا کی خاص سیاسی تھی یعنی ایران کی صفوی سلطنت خلیفہ مذہب کی

پیروی تھی اور اس کے مغرب میں سلطنت عثمانیہ اور مشرق میں سلطنت مغلیہ مبنی مذہب کی پیروی تھیں۔ صفویوں کی ان دو طاقتوں سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا کہ اگر یہ دو طاقتیں متحد

ہو جائیں تو ایران کو بہت کم نقصان پہنچا۔ اس لیے شاہان صفویوں کی شیعہ سلطنتوں کو جن میں قطب شاہی سلطنت بھی تھی اپنے ساتھ بھرت رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کی مراد

مغل سلطنت پر نہ اٹھی رہے اور ان کی شیعہ سلطنتیں بھی اپنے مذہبی اور سیاسی مصلحت کی بنا پر ایران سے علی ہوئی تھیں (مقدمت رقعات عالمگیری خیر بشارت)۔

اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ نے شروع سے سلطنت کا مذہب شیعوہ قرار دیا تھا لیکن اس سلطنت کا تعلق ایران سے محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں ہوا۔

چنانچہ ۱۶۱۶ء میں شاہ عباس کا مشہور سفیر انور سلطان گولکنڈہ آیا اور ایک مرصع تاج، خنجر، اور چالیس مرقا گھوڑے پیش کیے۔ اس کے

جواب میں حاجی قلی ۱۶۱۷ء میں اس کے بعد ہمدانی قلی سلطان گولکنڈہ سے روانہ کیے گئے، اور جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو ۱۶۳۳ء میں مبارکباد کے لیے

ایران بھیجے۔ بلکہ قلی ۱۶۱۸ء میں اس کے پوتے پر بھی تاج و خنجر اور پچاس مرقا گھوڑے پیش کیے اور یہاں سے ۱۶۱۹ء میں شیخ محمد ابوبکر خان ایران بھیجا گیا عبداللہ قطب شاہ کے

عہد میں شیخ محمد ابوبکر کے ساتھ ایرانی حکمرانوں کا بھی کیا بار بار مذاکرات پیش کیے لیکن قسمی سے ان کے کھیل میں اعتدال ہو گیا۔ ان کے بیٹے محمد قلی بیگ گولکنڈہ کے سربراہیت

خیرات خان کے ساتھ یہاں بھیجا گیا ایرانی سفیر گولکنڈہ میں رہنے لگے اور ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی تھی۔ یہ آمد و رفت برابر جاری رہی اور خلیفہ میں

شاہ ایران کا نام لیا جاتا تھا جس پر مغل حکومت کو بہت اعتراض تھا

شاہجہاں کا نام ضرب کیا جائیگا نیز شاہجہاں کے نوں جلوس سے دو لاکھ ہون جن کی مالیت آٹھ لاکھ روپیے ہوتی ہے ہر سال شہنشاہ کے پاس یا صوبہ داروں کے پاس بھیجے جائیگا۔ اور یہ وعدہ ہوا کہ تیس لاکھ روپیے جو گذشتہ بقایا ہے وہ بہ اقساط ادا کیے جائیگا، چنانچہ اس وقت ایک لاکھ روپیے کی ایک قسط ادا کی گئی نیز ہون اور مل سکے کی قدر میں جو فرق پڑیگا، اس کی بھی تکمیل کی جائیگی، اگر کبھی بیجا پور کی سلطنت دست درازی کر بیٹھے تو منحل حکومت گولکنڈہ کی مدد کریں، اور آخر میں عبداللہ قطب شاہ نے لکھا کہ۔

”در حضور... مولانا عبداللطیف برقرآن مجید دست گذشتہ قسم یاد کروم کہ خلافت آنچہ

بہد کروم از من سر نہ زند و اگر خدا نخواستہ باشد مصدر خلافت آن گردم اولیائے دولت

قاہرہ در اتزع ملک من محتق خواہند بود“

اس اقتیاد نامے کی تکمیل کے بعد عبداللطیف نے کئی مہینے حیدر آباد میں رہ کر اپنے سامنے معاہدے کی تکمیل کروائی، آخر میں حیات آباد میں اس کی پُر تکلف ضیافت ہوئی اور ۱۶۴۳ء میں یہ قیمتی تحفوں کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت میں واپس کیا گیا، ان تحفوں میں جواہر کئی ہزار اشرفی، ایک سو ہاتھی، پچاس گھوڑے تھے جن کی جملہ مالیت چھ لاکھ روپیے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ قطب شاہی سفیر شیخ محمد طاہر بھی بھیجا گیا جب یہ لوگ دولت آباد کے قریب پہنچے تو شاہ علی بیگ۔ مرزا خاں قلی اور افضل خاں نے ان کا خیر مقدم کیا، اور یہ شہنشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو ان کی غیر معمولی عزت ہوئی اور شہنشاہ نے قطب شاہی سفیر کو اپنے سفیر خواجہ طاہر کے ساتھ گولکنڈہ واپس کرتے وقت اپنی ایک تصویر جو طلائی فریم میں نصب تھی، نیز ہاتھی اور قیمتی کپڑوں کے کئی تھان عنایت کیے اور اقتیاد نامے کے جواب میں اپنی طرف سے ایک ہمد نامہ لکھ دیا جو طلائی تختی پر ماہ ربیع الثانی ۱۰۳۱ھ میں کندہ کیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ”بادشاہ نامہ“ عبدالحمید لاہوری، جلد اول حصہ دوم ص ۱۸۱-۱۸۲۔ یہی دو لاکھ ہون گولکنڈہ کی طرف سے

نظام شاہی سلطنت کو یہ طور امداد دیے جاتے تھے، سالانہ خراج و بقائے سے متعلق شہری مکتوب میں اس کی وضاحت نہیں تھی

بلکہ حاجب نے زبانی کہا تھا کہ اس کی پابجائی ہونی چاہیئے۔ ۲۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری ص ۱۸۰-۱۸۱۔

”چونکہ قطب الملک نے ہماری شرطیں تسلیم کر لی ہیں، یعنی خطبے میں خلفائے راشدینؑ اور ہمارا نام لیا جا رہا ہے اور سکتے پر ہمارا نام مضروب ہو چکا ہے اور مقررہ پیشکش بھیج دی ہے اس لیے تقصیرات گزشتہ اور اعفو فرمودیم و ملکہ کہ در تصرف آن عمدہ ارباب دول است برو مقررہ مسلم دشتیم“ اور جب تک ان شرطوں کی پابندی ہوگی ہم بھی اپنے وعدے کی پابندی کریں گے اور گولکنڈے کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔<sup>۱</sup>

جب یہ شہنشاہی عطیات گولکنڈہ پہنچے تو عبداللہ قطب شاہ نے بڑے انکسار کے ساتھ شکریہ ادا کیا جس میں انتہائی خوشامدھی اور شکرانے کے طور پر ایک قیمتی ہاتھی جس کا نام گجوتی تھا، اور ایک قیمتی الماس شہنشاہ کے پاس روانہ کیے۔<sup>۲</sup>

اس معاہدے سے جو ۱۶۳۶ء میں ہوا، قطب شاہی سلطنت کی ہمیشہ کے لیے آزادی سلب ہو گئی اور اب یہ مغل سلطنت کے زیر حمایت ایک ریاست یا محمیت ہو کر رہ گئی جس کا سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد سے برابر ڈرلگ رہا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سلطنت بیجاپور پر یہ شرطیں عائد نہیں کی گئیں بحال انکا اسی زمانے میں بیجاپور کی قسمت کا بھی یہی فیصلہ ہوا، اور گولکنڈے کی طرح اس کو بھی ریاست بنادیا گیا، لیکن اس پر کوئی مذہبی<sup>۳</sup> نہ خراج عائد کیا گیا غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپور کی حکومت گولکنڈے کی طرح کمزور نہ تھی۔

۱۔ بادشاہ نامہ ”عبد الحمید لاہوری“ جلد اول حصہ دوم ص ۲۱۰-۲۱۱۔

۲۔ بادشاہ نامہ ”عبد الحمید لاہوری“ جلد اول حصہ دوم ص ۲۱۴-۲۱۵۔

# پندرھواں باب

## کرناٹک کی فتوحات اور ان کا بڑبڑست

جنگ تالیکوٹ سے بیجاپور اور گولکنڈے کو بہت فائدے پہنچے یعنی ان کو کرناٹک میں کئی فتوحات حاصل ہوئیں جن کی یہ دولت یہ سلطنتیں جنوب میں بہت پھیل گئیں اور ان کی دولت میں اضافہ ہوا جو ان سلطنتوں کی تاریخ کا بڑا باب ہے، لیکن ان فتوحات کو سب کچھ جنگ تالیکوٹ کا نتیجہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ تالیکوٹ کی ایک جنگ سے ویجا نگر کی تمام طاقتوں کا یک نخت خاتمہ نہیں ہو سکا بلکہ اس سلطنت کے کئی اجزا باقی رہ گئے اور ان کو مغلوب کرنے کے لیے اور بے شمار لڑائیوں کی ضرورت تھی۔ رام راج کے خانے کے بعد اس کے بھائی ملہتم لچ اور ویکٹ ہٹی کئی علاقوں پر قابض رہے، انھی کے جانشین جو رائل کہلاتے ہیں مشرقی کرناٹک کے حکمران تھے ان لوگوں نے ۱۶۷۰ء میں نیپکنڈے کو اپنا پائے تخت بنالیا تھا جو ویجا نگر سے ایک سو چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے لیکن جب سلطنت بیجاپور اور گولکنڈے سے یہاں حملے شروع کر دیے تو ۱۶۸۳ء میں تھاراجو فالٹا ویکٹ ہٹی کا جانشین تھا نیپکنڈے کو چھوڑ کر چندرگری میں آ بسا اور اس کو اپنا پائے تخت بنالیا لیکن اس کے آس پاس ویجا نگر کے جتنے صوبہ دار اور زمیندار تھے وہ بھی خود مختار ہو گئے اور ان لوگوں نے اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں یہ نیپکنڈے کے رائل، تنجور، مدور، اپنا پٹم کے نائک، اور سری رنگ پٹن کے ویدتھے جو برائے نام چندرگری کے ماتحت تھے اور اصل میں

۱۔ تاریخ جنوب ہند جلد اول، دیکس میں ۶۱۔

۲۔ یہ رائل راج چندرگری کے رشتہ دار تھے جب انھوں نے بیجاپور کے حملے کا نامزعاہ مقابل کیا تو اس کے حملے میں نیپکنڈے کو ویا گیا تھا۔

خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف یہ آپس میں لڑتے بھڑتے تھے بلکہ خود چندرگری کے راجہ سے دست بہ گریباں ہو جاتے تھے چنانچہ مدورا کے ناگوں نے بارہا چندرگری پر حملہ کیا، اور اپنے قایدے کے لیے دکن کے مسلمان جنگاوروں کو دعوت دی! اسی وجہ سے بیجاپور اور گولکنڈہ کے حملہ آوروں کے لیے خوشگوار مواقع ہاتھ آ گئے۔

جنگ تالیکوٹ کے بعد احمد نگر اور بیجاپور کی سلطنتوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اول الذکر سلطنت شمال میں پیش قدمی کرے چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اس نے برابر قبضہ کر لیا۔ اس کو جنوب میں حملہ کرنے کے مواقع نہ تھے، لیکن بیجاپور، اور گولکنڈہ کی سلطنتیں جن کی حدود کرناٹک سے ملتی تھیں جنوب میں پیش قدمی کرنے لگیں چونکہ مغلوں کے تسلط کی وجہ سے شمال کے راستے بند ہو گئے تھے اس وجہ سے بھی سلطنتیں کرناٹک میں نفوذ کرنے کے لیے مجبور تھیں۔ بیجاپور کے مشہور جنرل ندولہ خاں نے ۱۶۳۶ء میں کرناٹک کے بہت سے علاقے مثلاً بنگاپور، ہری ہری، بسواپٹن فتح کر لیے، اور بد فور تک بڑھ آیا۔ ۱۶۳۶ء میں سیرا مسخر ہوا، اور اس کے بعد ویلور، اور جنجی فتح ہو گئے۔ رندولہ خاں کے بعد بیجاپور کے دوسرے جنرل شاہ مجاہد نے فتوحات جاری رکھیں، بنگلور، اور جنجی مسخر کر لیے۔ گولکنڈہ کی فتوحات ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہو چکی تھیں۔ جنگ تالیکوٹ کے بعد اس سلطنت نے اپنے بہت سے کھوئے ہوئے علاقے جن پر رام راج قابض ہو گیا تھا، حاصل کر لیے۔ ابراہیم کے جانشین محمد قلی قطب شاہ نے نہ صرف ملیم راج، اور وینگٹ پٹی کے محلوں کو مسترد کر دیا، بلکہ کرناٹک کے مشہور قلعے ندیاں، بنگلور، اور موسلورک فتح کیے۔ اس کے بعد کدی کوٹہ، اور ٹیکنڈے پر جہاں وینگٹ پٹی نے اپنا پاسے تخت بنالیا تھا، حملہ کر کے فتح کر لیے۔ ان محلوں اور فتوحات کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کی بیرونی حدود مستحکم ہو جائیں تاکہ بیجاپور کی کوئی طاقت سر نہ اٹھاسکے چنانچہ اس انتظام سے جنوب مشرقی حدود اس قدر قابل اطمینان ہو گئے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں ان علاقوں میں کوئی فوجی نقل و حرکت کی ضرورت داعی نہیں ہوئی۔

جب عبداللہ قطب شاہ کا عہد آیا تو اس میں اس زمانے کے حالات کے مد نظر قطب شاہی سلطنت نے پھر

کرناٹک کی طرف توجہ کی۔ غالباً اس توجہ کا محرک یہ تھا کہ بیجاپور کی طرف سے رندولہ خاں اور شاہ جی کرناٹک میں پیش قدمی کر رہے تھے اور ان کی فتوحات سے ہر روز عادل شاہی سلطنت وسیع ہو رہی تھی۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ قطب شاہی سلطنت کو بھی توسیع سلطنت کا شوق ہوا لیکن جب تک مغل سلطنت سے معاملات کی کیسوئی نہیں ہوئی کرناٹک کی طرف توجہ کرنا ممکن نہیں تھا جب ۱۶۴۶ء میں مغلوں کے معاہدے سے اطمینان ہو گیا تو پھر فوجی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سلطنت کے لیے صرف کرناٹک ہی ایک ایسا میدان تھا جہاں یہ اپنی جولانیاں دکھا سکتی تھی، کیونکہ مغلوں کے تسلط کی وجہ سے شمالی راستے مسدود تھے، البتہ شمال مشرق میں جہاں تسخیر کی ضرورت تھی حلے ہو سکتے تھے چنانچہ ۱۶۵۲ء میں وزیر کا پٹم پر قبضہ کیا گیا، اور قطب شاہی سلطنت تلنگانہ کے آخری حدود تک پہنچ گئی۔ سکاکول، کو شمالی فوج کی چھاؤنی بنایا گیا، اتفاق سے عبداللہ قطب شاہ کے لیے محمد سعید جوار دستاں سے ایک تلجو کی حیثیت میں آیا تھا، کرناٹک کی فتوحات کے لیے بہت موزوں ثابت ہوا۔ یہ پہلے سلطنت میں میر جملہ بنایا گیا، اور اس کے بعد اس کو کرناٹک کی طرف داری دی گئی، کرناٹک کی تسخیر اسی کے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں جبکہ محمد سعید طرفدار بنایا گیا تھا کرناٹک میں قطب شاہی حدود دکنم سے جو کرپہ کے شمال مشرق میں واقع ہے، آگے نہیں تھے اس سے آگے کرناٹک کی سطح مرتفع کو مسخر کرنے کی بہتری کوششیں ہوئی تھیں، لیکن وہ سب ناکام ہو چکی تھیں، کیونکہ چندر گری کا راجہ سری رنگ رائٹ، یہاں کافی طاقتور تھا۔ کرناٹک کا طرفدار ہونے کے بعد میر جملہ نے یہاں اپنی طاقت بہت بڑھائی۔ یعنی اس کی فوج پانچ ہزار سوار، اور بیس ہزار پیدل، انہیں سوا تھی، چار پانچ سواؤنٹ پر مشتمل تھی اور ان کے علاوہ بیس ہزار بیل تھے جو سامان حرب لیجا کرتے تھے۔ ان فوجوں میں اس نے ہاتھ اعلیٰ پیدا کی، اور مغربی فوجوں سے بھی کام لیا۔ چنانچہ اس کی فوج میں فرانسیسی سپاہی، انگریزی، ولندیزی اور اطالوی پسند و قہا اور توپچی بھی تھے،

جن سے اس کو بہت مدد ملتی تھی۔ ۱۰۸۶ھ سے میر جملہ کے حملے شروع ہو گئے اور بہت جلد اس نے کڑپا۔ سدھوٹ فتح کر لیا، لیکن اس کی سب سے بڑی فتح گندی کوٹ کی تسخیر تھی جو ۱۰۵۶ھ میں علی میں آئی۔ گندی کوٹ کڑپہ کے قریب یرملائی پہاڑوں میں واقع ہے، ٹیورنیر کے الفاظ میں ”یہ بڑا قلعہ تھا۔“ اس کی تسخیر سے مشرقی کرناٹک کے بڑے اور اہم حصے بر قطب شاہی قبضہ ہو گیا چنانچہ اس سے ڈر کر راجہ چندر گری، سری رنگ رائے نے مغلوں سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن قطب شاہی سلطنت کی پیشقدمی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ برابر سال تک بڑھتی گئی۔ ۱۱۶۴ھ تک تمام مشرقی کرناٹک ساحل سمندر تک قطب شاہی عملداری میں آ گیا۔ سری رنگ رائے، تیور کی طرف بھاگ گیا ان جدید فتوحات کی وسعت کوئی تین سو میل سے زیادہ تھی اور ان کا محصول چالیس لاکھ ہون وصول ہوتا تھا۔

جب قطب شاہی حدود ساحل کارو منڈل تک پہنچ گئیں تو مغربی اقوام سے جو ان ساحلوں پر انگریزوں سے تعلقات قابض تھے، سیاسی تعلق ہونا ضروری تھا۔ پرتگالی تو بہت زمانے سے ساحل کارو منڈل پر قدم جمائے ہوئے تھے، چنانچہ یہ سان تھوم پر جو مدراس سے ساٹ میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے قابض تھے۔ لیکن جب ان کے پیچھے یورپ کی دوسری قومیں، یعنی انگریز، اور ولندیزی، ہندوستان آئے تو پرتگالیوں سے ان کی کشمکش شروع ہو گئی۔ آخر ان کے دونوں قوموں نے ۱۵۱۹ء میں ہندوستانی ساحلوں پر اپنا قدم جمایا۔ ولندیزی پٹی کٹ پر، انگریز مسولی ٹم پر اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر کے تجارت کرنے لگے۔ انگریزوں کا توطن مسولی ٹم میں قطب شاہی سلطنت کی منظوری سے ہوا تھا، کیونکہ یہ قطب شاہی بندرگاہ تھی۔ یہ لوگ اپنا اثر بڑھانے کے لیے پرتگالیوں کو ساحل کارو منڈل سے خارج کرنا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انگریزوں نے قطب شاہی اثر سے پہلے راجہ چندر گری سری رنگ رائے سے

۱۔ فرانسیسی سیاح ٹیورنیر کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس کی فوج میں نہ ہوتے تو وہ گندی کوٹ نہیں فتح کر سکتے،  
د سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۲۲۷۔

۲۔ کرناٹک کے علاقے جو عہد شاہ قطب شاہ کے عہد میں سخر ہوئے تھے وہ اصطلاح میں ”قبلیٹی“ کہلاتے ہیں۔



۱۶۳۳ء میں ایک "قول" کی تکمیل کر کے مدراس حاصل کر لیا تھا! اس قول کی رو سے انگریزوں کو قلعہ سینٹ جارج کی تعمیر کی اجازت اور محصول درآمد و برآمد سے استثناء حاصل ہو گیا، اور مدراس کے آس پاس کی تمام زمین مل گئی جس میں ان کو عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے، اور جب ۱۷۵۶ء میں یہاں قطب شاہی عملداری قائم ہو گئی اور میر جملہ بڑھتے بڑھتے سان تھوم تک پہنچ گیا تو انگریزوں نے پرنسپالوں کی مخالفت میں اس کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور پرنسپالوں کی لڑائی میں اس کی مدد کی اور اپنے توپچی اور سپاہی دیئے چونکہ اب کرناٹک میں قطب شاہی عملداری قائم ہو گئی تھی اس لیے سری رنگ رائل کا پرانا قول "جو مدراس کے بابت دیا گیا تھا، نسخ ہو گیا تھا، اس لیے انگریز کھیتی کے صدر ایوی نے میر جملہ سے تجدید قول کی درخواست کی۔ میر جملہ نے اپنی چند شرطیں منو کر اور انگریزوں سے ضروری توہین حاصل کر کے ۱۷۵۶ء میں پرانے قول کی توثیق کر دی۔ چنانچہ اس توثیق کی رو سے انگریزوں کو وہی "حقوق مل گئے جو ان کو سری رنگ رائل کے تحت حاصل تھے۔

آئندہ دس سال اطمینان سے گزرے، لیکن ۱۷۶۶ء میں یہ مشکل آپڑی کہ محمد سعید میر جملہ اپنے مرنی سلطنت کے خلاف بغاوت کر کے مغلوں سے مل گیا! اس بغاوت سے قطب شاہی کرناٹک میں افراتفری پیدا ہو گئی اور ممکن ہے کہ اس میں خود میر جملہ کا بھی ہاتھ ہو۔ سری رنگ رائل جو عیسوی بھاگ گیا تھا وہ پھر پلٹ کر اور پناہی پر حملہ آور ہو گیا، اور قطب شاہی حکومت کو پھر اس طرف توجہ کرنی پڑی لیکن مشکل یہ تھی کہ اسی زمانے میں میر جملہ کی بغاوت کی وجہ سے مغل سلطنت سے ایک لڑائی ہو گئی۔ جب اس لڑائی سے فراغت ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ نے نیک نام خاں کو جو میر جملہ کے تحت کرناٹک میں کام کر چکا تھا، اس صوبے کا سر لشکر اور طرفدار مقرر کیا۔ غالباً ۱۷۶۶ء میں نیک نام خاں

۱۔ اس قول کی تاریخ ۱۵ نومبر ۱۶۳۳ء ہے مدراس کے اوراق پارینہ جلد اول ص ۵۹۲۔

۲۔ مدراس کے اوراق پارینہ ص ۱۶۶۔

۳۔ اس کا اصل نام رفاقل ہے یہ پہلے ایران میں شاہ عباس صفوی کا ملازم تھا، غالباً عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں

کرناٹک آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کرناٹک کے کام کے لیے نیک نام خاں سے زیادہ موزوں آدمی نہیں تھا۔ پہلے تو اس نے ہندو طاقتوں کا مقابلہ کیا، اور شکستیں دیں اور چند ہی روز میں تمام قطب شاہی مقبوضات حاصل کر لیے۔ ۱۶۵۹ء میں اس کی فوجیں مدراس کے قریب پہنچ گئیں۔ سان تھوم پر جہاں پرتگالیوں کو خارج کر کے قطب شاہی عمارتیں قائم کی گئی تھیں، ولندیزی بڑے رہے تھے۔ ۱۶۶۲ء میں نیک نام خاں نے سان تھوم کا محاصرہ کر لیا، اور قطب شاہی قبضہ ہو گیا۔ اس طریقے سے میر جملہ کی غداری کے باعث جو سیاسی تلاطم برپا تھا، اس کا سد باب ہو گیا۔ نیک نام خاں نے کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ پیشقدمی کی تھی۔ ایڈورڈو نٹرجو اس زمانے میں انگریزی کمپنی کا صدر تھا، ایک خط

گولکنڈہ آیا، اور محمد سعید میر جملہ کے تحت کرناٹک میں مامور کیا گیا۔ پہلے اس کو رضا خاں کا خطاب ملا، اور جب میر جملہ کی بغاوت کے بعد کرناٹک میں اس سے اہم کام انجام پائے تو اس کو نیک نام خاں خطاب دیا گیا، اس نے محمد سعید سے زیادہ قابلیت کے ساتھ کرناٹک کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے وفادارانہ کام سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو ۱۶۸۱ء میں سلطنت کا دیوان بنا دیا، اور اس سے سلطنت کے دوسرے اہم کام لیے نیک نام خاں نے قطب شاہی سلطنت کی بڑی وفادارانہ خدمت کی۔ فوجی اور غیر فوجی بڑے کام کیے۔ وزارت کے فرائض اس خوبی سے انجام دیے کہ اس کا نام اب تک زباں زد ہے۔ یہ عالم و شاعر تھا، اس وجہ سے علماء کی بڑی سرپرستی بھی کی۔ محمد ابراہیم خادم نے جو نیک نام خاں سے بہت وابستہ تھا، اس کی تعریف میں ایک بڑی مثنوی لکھی ہے جس کا پہلا شعر ہے:-

رضا خان جم نور خورشید رائے      زمر تائبہ پامحض لطف خدائے

خود اس کا کلام بھی بہت دستیاب ہوتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی وفات (۲۱ اپریل ۱۶۸۳ء) کے چند دنوں کے بعد ۱۲ مئی ۱۶۸۳ء کو نیک نام خاں کا انتقال ہوا۔ اس کی وفاداری کی وجہ سے عبداللہ کے جانشین نے اس کی اس قدر کی کہ اس کو قطب شاہی مقبروں کے قریب دفن کیا، اور اس کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک موضع وقف کر دیا۔ قبر کے کتبے میں اس کو "مغفرت پناہ، جنت مکان" لکھا گیا ہے۔

مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۶۶۳ء میں کہتا ہے کہ نیک نام خاں چالیس ہزار فوج کے ساتھ مدراس کے قریب پڑا ہوا ہے، لیکن اس ضروری کام کے ساتھ اس نے مزید فتوحات بھی حاصل کر لیں، یعنی اگر حدیقتہ السلاطین کے الفاظ پر اعتماد کیا جائے تو تمام آن مملکت تسخیر نمودہ یعنی کرناٹک کے زرخیز اقطاع جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے مسخر کیے گئے، غالباً گوئی کرم کنڈہ اس نے فتح کیے تھے اور یہ کنڈی کوٹھ اور سدھوٹ کے ساتھ شامل ہو کر جو میر جملہ کے زمانے میں فتح ہوئے تھے ایک مستقل سلطنت ہو گئی تھی اس کو نیک نام خاں کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔

نیک نام خاں کی اس پیشقدمی سے انگریز کمپنی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی ایک تو اس وجہ سے کہ یہ چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ سینٹ طامس پر قبضہ کر بیٹھا تھا جو مدراس کے قلعہ سینٹ جارج سے بہت قریب ہے۔ تیرنیک نام خاں انگریز کمپنی کا بہت مخالف تھا، اس کو ۱۶۶۵ء کے قول "سے جو میر جملہ نے انگریز کمپنی کو عطا کیا تھا، اتفاق نہیں تھا، یہ انگریزوں سے جدید قول چاہتا تھا تاکہ ان سے زیادہ رقم وصول ہو، کیونکہ ۱۶۶۵ء کے قول کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ انگریز کمپنی کروڑ گیری کی آدھی رقم گولکنڈہ کی حکومت کو دیا کرے گی، اگر قول کے مطابق اس کی پابجائی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن ۱۶۶۹ء میں گرین ہل نے ایک اور شکل اختیار کر لی تھی یعنی بجائے آدھی کروڑ گیری ادا کرنے کے صرف تین سو اسی سو سالانہ ادا کرتا تھا، اور اس کو "شہر کا کرایہ" کہا جاتا تھا، یعنی یہ رقم کمپنی مدراس کی سکونت کے معاوضے میں قلعہ شاہی سلطنت کو ادا کرتی تھی لیکن انگریز کمپنی کے بیان کے مطابق جب نیک نام خاں ۱۶۶۳ء میں کرناٹک کا گورنر ہو کر آیا تو اس نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا، اور نہ صرف کروڑ گیری کی تمام رقم طلب کی بلکہ یہ بھی کہا کہ میں مدراس میں ایک جو اہلدار رکھوں گا جو سختی کے ساتھ تمام رساید کی تنقیح کیا کریگا۔ انگریز کمپنی اس سے بہت ڈر گئی۔ ونٹر نے رعایت چاہی، لیکن نیک نام خاں نے ایک نہ سنی، کمپنی کو اس کی شرائط ماننی پڑیں لیکن بد قسمتی سے کرناٹک کے نائکوں نے پھر شورش شروع کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیک نام خاں کی تمام فوجیں اس شورش کے سد باب کے لیے متوجہ ہو گئیں اور کمپنی کو چند روز کے لیے دم لینے کا موقع مل گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۶۹ء تک نیک نام خاں کوئی سال اس طسوف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ نائکوں کی شورش سے فراغت پا کر ۱۶۶۹ء میں

اس نے پھر انگریزوں کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں ونٹر کی جگہ فاکس کرافٹ کمپنی کا صدر ہو کر آیا تھا، نیک نام خاں نے اس سے مطالبات کیے، کرافٹ نے لیت و لعل کیا تو مدراس کے راستے بند کر دیے گئے اور ٹریڈ کیمن پر قبضہ ہو گیا جس سے اہل مدراس اور کمپنی کو بہت تکلیف ہوئی اور کمپنی ایسی مجبور ہوئی کہ بالآخر ۱۸۱۲ء میں نیک نام خاں کے تمام مطالبات منظور کر لیے۔ گذشتہ بقائے میں گیارہ ہزار ہون ادا کر دیے اور آئندہ شہر مدراس کا کرایہ سالانہ ایک ہزار دوسو ہون ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ قول فاکس کرافٹ کے جانشین لینگ ہارن سے طے ہوا۔

۱۸۱۳ء میں قطب شاہی سلطنت میں بڑی تبدیلی ہو گئی، یعنی اسی سنہ میں عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہو گیا، اور اس کی جگہ اس کے داماد ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی، لیکن اس تغیر سے حکومت کرنا ملک کے مسلک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے چند دنوں بعد ہی نیک نام خاں کا بھی انتقال ہو گیا، اور اس کی جگہ نئے بادشاہ نے موسیٰ خاں کو کرناٹک کا طرفدار مقرر کر دیا اس نئے طرفدار نے ۱۸۱۴ء میں نیک نام خاں کے قول کی توثیق کر دی، اور اسی سال بادشاہ نے رچرڈ موہن کو جو موسولی پٹم کا صدر تھا، بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت دے دی لیکن ایک سیاسی دشواری یہ پیدا ہوئی کہ عبداللہ قطب شاہ اور نیک نام خاں کے مرنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کو جو مدراس کے جنوبی ساحلوں پر قابض تھے پھر جرات ہو گئی اور انھوں نے میدان خالی دیکھ کر سان تھوم پر دھاوا بول دیا۔ فرانسیسی قطب شاہی سلطنت پر پہلے سے غار کھائے ہوئے تھے کیونکہ اس سلطنت نے موسولی پٹم میں انگریزوں کے مقابلے میں ان کی ایک نہیں چلنے دی تھی اس وقت فرانسیسی مقبوضات کے گورنر ڈی لاہے نے سید مظفر کو جو اس زمانے میں جملہ تھا، اپنے ساتھ ہمدار کر لیا۔ سید مظفر، اور موسیٰ خاں میں عداوت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت سے موسیٰ خاں کی کوئی مدد نہیں کی گئی اور اس کو پسپا ہونا پڑا۔ فرانسیسی سان تھوم پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کی کشتیوں اور جہازوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ سید مظفر کی طرفداری کی وجہ سے نہ صرف حکومت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بلکہ اس کے اشارے سے بادشاہ ان کو ایک لاکھ کراون کے معاوضے میں سان تھوم تقویٰ بخش کرنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن موسیٰ خاں خاموش نہیں رہا، بلکہ اس نے بابا صاحب کو فوج کی کمان دی اور اس کے بعد

چناپلی مرزا کو فرانسیسیوں کے مقابلے میں بھیجا، اور اس نئے حملے سے سان تھوم کی بازیافت چند دنوں کی بات رہ گئی تھی، لیکن سید مظفر نے پھر بے وفائی کی، اس خیال سے کہ مبادا موسیٰ خاں کا قاربڑہ جائیگا، اس کو مرکز میں واپس بلا لیا، اور اس کی جگہ نام دار خاں مامور کیا گیا لیکن اس تبدیلی سے لڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ چناپلی مرزا فرانسیسیوں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ چونکہ ولندیزی اور انگریز بھی ان کے مخالف تھے اس لیے ۱۷۹۶ء میں فرانسیسیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قطب شاہی فوجیں سان تھوم پر قابض ہو گئیں، اور اسی زمانہ میں بادشاہ نے سید مظفر کو خدمت سے علیحدہ کر کے مادنا کو وزیر بنادیا تھا جو نیک نام خاں کے مسلک کا پابند تھا۔

قطب شاہی فوجوں کی اس کامیابی سے انگریزوں پر غلط خواہ رعب بیٹھ گیا، چناپچہ انھوں نے حکومت کو خوش کرنے کے لیے مرکزی اور مقامی عہدہ داروں کو بے شمار نذرانے اور تحفے دیے۔ مرکزی حکومت میں بادشاہ اور اس کے دیوان مادنا، ویشکارا کتا تھے، اور کرناٹک میں نام دار خاں کے بعد مسکی میاں اور اس کے بعد محمد ابراہیم خلیل اللہ کرناٹک کے طرفدار مقرر ہوئے تھے۔ ان سب کو انگریز کھپنی نے بے شمار نذرانے اور تحفے دیے جن میں کپڑے، آلات ہتھیار وغیرہ شامل تھے۔ جو تحفے ابو الحسن قطب شاہ کو دیے گئے تھے ان کی مالیت چار سو پچاس نو ہون تھی اس کے علاوہ مادنا کو ایک سو چوہیرا سی ہون<sup>۱۸۲</sup> اور نواب مسکی میاں کو ساڑھے اٹھیا نو سو ہون<sup>۹۸۱</sup> اور اکٹا کو ساڑھے باون ہون کی مالیت کے تحفے دیے گئے۔ اس کے علاوہ جب کرناٹک کے طرفدار محمد ابراہیم کے بیٹے سکندر (جس کا خطاب سنجراں تھا) کی شادی مدراس میں ہوئی تو اس موقع پر بھی انگریزوں نے اس کو چار سو ہون نذرانہ دیا تھا جب کبھی بادشاہ نے ملک کا دورہ کیا، اور مسولی ٹیم کے معاینے کے لیے گیا تو تمام کھپنیوں نے اس کی خدمت میں گراں قدر نذرانے پیش کیے چناپچہ ۱۷۹۶ء کے دورے میں کافی نذرانے ملے، اور جب ۱۷۹۸ء کا دورہ ہوا تو ولندیزیوں نے بادشاہ کو دس ہزار ہون، اور انگریزوں نے تین ہزار ہون نذرانہ دیے۔ اس سنہ میں جب اکٹا اور مادنا کے بیٹوں کی شادی قرارپائی تو اس موقع پر بھی انگریز کھپنی نے اسی وزیر کو سو ہون نذرانہ دیا تھا اس زمانے میں انگریز کھپنی کا صدر لینگ ہارن کی جگہ اسٹرنہام ماسٹر تھا جو ۱۷۹۸ء میں صدر مقرر

ابو الحسن قطب شاہ کا عہد حکومت جس میں مادنا وزیر تھا، انگریز کھپنی کے لیے بہت سخت ثابت ہوا۔ انگریز کھپنی کو اپنے عرایض بادشاہ تک پہنچانے کے لیے مرکزی حکومت میں اپنا ایک سفیر رکھنا پڑتا تھا۔ مادنا کی ابتداء وزارت میں انگریز کھپنی نے چندا۔ رموضع کرایے پر لینے کی کوشش کی اور اجازت چاہی، لیکن مادنا دیوان نے یہ درخواستیں اس وجہ سے رد کر دیں کہ اس سے سلطنت کا بہت نقصان تھا۔ ۱۰۹۶ء میں جب اسٹرنہام ماسٹر کی جگہ کے فورڈ صدر ہو کر آیا، اور اس نے نہایت انکسار سے درخواست کی تو بڑی مشکل اور غور و خوض کے بعد اس کو مدراس میں صرف چاندی کے سکے بنانے کی اجازت دی گئی، لیکن شرط یہ تھی کہ وہ قطب شاہی سکے کے ہم وزن اور ہم قدر ہوں۔ تانبے کے سکوں کی اجازت نہیں ملی۔ مغربی قوام کے مقابلے میں دیسی تاجروں کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی تاکہ یہ لوگ پیچھے نہ رہیں۔ مقامی عہدہ دار بھی انگریزوں سے سختی کے ساتھ سلطنت کے وقار کی خاطر قاعدوں کی پوری پابندی کر دیتے تھے۔ چنانچہ پودلی لنگپا جو تقریباً ۱۰۸۶ء میں پونا ملی کا طرفدار مقرر ہوا تھا، اور بعد کو مسولی ٹیم کی نگرانی میں اس کے سپرد ہوئی، بہت سخت گیر آدمی تھا۔ اس نے انگریزوں سے قانون ملک کی پوری پابندی کروائی چنانچہ ۱۰۸۶ء کا واقعہ ہے کہ لنگپا نے ان علاقوں کا دورہ کیا جہاں انگریز کھپنی چٹکن تھی، اہل کھپنی نے اس کا استقبال نہیں کیا، اور بادشاہ کی طرف سے جو خلعتیں آئی تھیں وہ قبول نہیں کیں۔ اس کے علاوہ لنگپا کو یہ بھی شکایت تھی کہ کھپنی دیسی تاجروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی، یعنی انگریزوں کو تو بلا محصول درآمد و برآمد کی اجازت تھی لیکن جب دیسی تاجر اپنا سامان مدراس میں لاتے تھے تو ان پر انگریز کھپنی محصول لگاتی تھی چنانچہ اس کی پاداش میں لنگپا نے مدراس کو محصور کر لیا، اور درآمد و برآمد بند کر دی کھپنی بالآخر مجبور ہو گئی اور لنگپا کے شرائط تسلیم کر لیے۔ ۱۰۸۸ء میں جبکہ اسٹرنہام ماسٹر کھپنی کا صدر مقرر ہوا تو لنگپا نے ایک اور آویزش ہو گئی، یعنی کھپنی قلعہ سینٹ جارج کی مرمت کے لیے دیسی تاجروں پر محصول عاید کرنے لگی، اور دوسرے مدراس کا کرایہ بہ راہ راست مرکزی حکومت کو بھیجا جاتا تھا جس سے لنگپا کو اعتراض تھا جب کھپنی مخالفت پر آمگئی تو لنگپا نے ۱۰۸۹ء میں مدراس کا محاصرہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھپنی نے نذرانہ دے کر معافی مانگی۔ کھپنی نے لنگپا کو محاصرہ کے لیے بہتری کوششیں کیں کہ انعام کز سے قلعہ، جو حائے، لیکن مرکزی حکومت نے منظور نہیں کیا، برعکس اس کا پٹا

وقار بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ ۱۰۹۳ھ میں پورے کرناٹک کا گورنر ہو گیا۔ اور بھینی کی کوئی کاروائی لنگپا کے توسط کے بغیر مرکز میں نہیں آسکتی تھی جب ۱۰۹۶ھ میں لنگپا اپنی خدمت سے علیحدہ ہوا، اور اس کی جگہ عبدالبنی خاں مقرر ہوا تو اس نے بھی لنگپا کے مسلک کی پابندی کی، چنانچہ اس کے زمانے میں بھی انگریز اور ولندیزی، قانون شکنی کی جرات نہیں کر سکے جب ۱۰۹۷ھ میں جنگ لکھیٹر ہوئی اور قطب شاہی سلطنت مغلوں کے مقابلے میں منہزم ہو گئی تو اس سے فائدہ اٹھا کر انگریز اور ولندیزی حکمینیوں نے مسولی ٹیم پر قبضہ کرنا چاہا، اور ادائی کر ایے سے پہلے ہی کرنے لگیں، لیکن یہ ناممکن تھا، سلطنت نے ان سے سختی سے کرایہ وصول کر لیا۔ البتہ ۱۰۹۹ھ میں جب گولکنڈے کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو انگریز بھینی کی بالآخر مرادیں برائیں اور یہ ایسی مقتدر ہوئی کہ پورے دکن پر مسلط ہو گئی۔ اگر مغل، قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ نہ کرتے تو قرائن یہ ہیں کہ انگریز بھینی کو یہ ترقی نصیب نہ ہوتی۔

قطب شاہی سلطنت نے کرناٹک کی مزید فتوحات کے لیے مرہٹوں کے مشہور رہنما سیواجی سے بھی سیواجی سے تعلقات | کام لیا تھا۔ ۱۰۸۷ھ میں جبکہ بیجا پور اور صوبہ وار دکن بہادر خاں کو کلتاش میں لڑائی ہو رہی تھی خود سیواجی بھی کرناٹک میں لشکر کشی کر کے روپیہ اور علاقے حاصل کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اول تو سیواجی کا بھائی یکوجی کرناٹک کے اکثر علاقوں پر قابض تھا جو اس کے باپ شاہجی کے مفتوحہ تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں سیواجی نے مغل سلطنت سے صلح کر لی تھی اور اس صلح کی وجہ سے اب وہ شمال میں اپنا قدم نہیں بڑھا سکتا تھا، لیکن کرناٹک کی یہ فتوحات قطب شاہی امداد کے بغیر ممکن نہ تھیں، اس لیے سیواجی ۱۰۸۸ھ میں حیدر آباد آیا، اور قطب شاہی سلطنت سے ایک قرار داد لری گولکنڈے کے

۱۔ شاہجی نے بیجا پور کی طرف سے جنہی تک کرناٹک کو بہت سے علاقے فتح کیے تھے اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یکوجی، جو سیواجی کا بھائی تھا، ان علاقوں کا طرفدار تھا، اس زمانے میں یہ تنجور، اور مدوراکے ناٹکوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر تنجور پر قبضہ کر بیٹھا تھا۔ یکوجی کی یہ ترقی سیواجی کے لیے حد درجہ تکلیف دہ تھی، وہ یکوجی کو ہٹا کر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا۔



ارباب سیاست جن میں بادشاہ اور اس کا وزیر مانتا دونوں شامل ہیں، سیواجی کے اتحاد کو اس وجہ سے ضروری سمجھتے تھے کہ مغلوں کے ڈر سے وہ خود کرناٹک میں پیش قدمی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ مغل سلطنت محمد سعید میر جملہ کی عیاری کی وجہ سے کرناٹک پر آنکھ لگائے ہوئے تھی اور میر جملہ کے مفتوحہ علاقے طلب کر رہی تھی۔ سیواجی سے معاہدہ یہ ہوا کہ دونوں طاقتیں مغلوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ دوسرے سیواجی کی فوجی خدمات جو کرناٹک میں ہونے والی تھیں، اس کے معاوضے میں قطب شاہی سلطنت کی طرف سے ایک لاکھ ہون سیواجی کو دیے جائیں گے، اور جب تک وہ کرناٹک میں ٹھہرا رہے گا فوجی اخراجات کے لیے تین ہزار روپیے ہر روز دیے جائیں گے، اور کرناٹک میں جو فتوحات حاصل ہوں گی ان میں سے شاہ جی کے مقبوضات کو چھوڑ کر باقی قطب شاہی سلطنت کو ملینگے۔

یہ ظاہر یہ معاہدہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا، کیونکہ اس سے یہ توقع تھی کہ قطب شاہی سلطنت کے تمام منصوبے سیواجی کے توسط سے حاصل ہو جائیں گے لیکن سیواجی نے اس معاہدے کی ذرہ برابر پابندی نہیں کی اس نے گولکنڈے کو مہرباغ دکھا کر تمام فائدے تو حاصل کر لیے لیکن کرناٹک کی فتوحات میں سے اس سلطنت کو کچھ نہیں دیا، جو کھلی بد عہدی تھی۔ اس نے ایک طرف قلعہ جنجی فتح کر لیا، کیونکہ یہاں عادل شاہی عہدہ دار نذر محمد اور شمشیر خاں آپس میں لڑ رہے تھے اور ابوالحسن قطب شاہ سے مدد مانگتی تھی، دوسری طرف اس نے سطح مرتفع میسور کے بے شمار علاقے اور قلعے فتح کر لیے۔ مفتوحہ قلعوں کی تعداد سوتو بتائی جاتی ہے اور ان کی آمدنی چالیس لاکھ ہون تھی، کیونکہ یہاں سونے اور جواہر کے معدن بھی تھے، لیکن سیواجی ان فتوحات میں سے گولکنڈے کو کچھ نہیں دیا، بلکہ یہاں سے سیدھے بیجاپور چلا گیا۔ قطب شاہی حکومت سیواجی کے اس غلط طرز عمل سے بہت برا فروختہ ہو گئی۔ مادانے محمد براہیم سر لشکر کو جنجی اور دیور کے قلعوں پر وار کرنے کے لیے بھیجا، اور ادھر لنگپا کو حکم ہوا کہ میسور کے مفتوحہ علاقوں پر دھاوا کر کے مرہٹہ اقتدار سے سلب کر لیں۔ لیکن اس کے خاطر خواہ نتایج برآمد نہیں ہوئے۔

لہذا اس باب میں کرناٹک اور مغربی اقوام سے متعلق جو معلومات درج کیے گئے ہیں ان میں اکثر مدراس کے انگریزی وثائق سے حاصل ہوئے ہیں، اور مجھے بھومال رائے صاحب ام۔ اے کے توسط سے ملے، ان کے لیے میں موصوف کا بہت ممنون ہوں۔



# سولھواں باب

## مغل سلطنت سے پرچاش

نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ اور گولکنڈہ و بیجاپور کی حکم برداری، دونوں لازم و ملزوم تھے، اس  
واقعے کے بعد دکن کی فضا ایسی خاموش ہو گئی کہ آئندہ بیس سال تک کوئی تلاطم نہیں ہوا، اور مغل سلطنت کو اس طرف  
کوئی توجہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ۱۰۴۶ھ میں جب شاہجہاں نے دکن کے معاملات سے فراغت پائی تو شہزادہ اورنگزیب کو  
دکن کا صوبہ دار بنایا، اور خود شمال چلا گیا۔ یہ اورنگ زیب کی پہلی گورنری ہے جو ۱۰۴۶ھ سے ۱۰۵۴ھ تک  
جاری رہی اس دوران میں مغل علاقوں کی خاطر خواہ نگہداشت ہوئی اور گولکنڈہ و بیجاپور کی ریاستوں نے اپنے  
معاہدوں کی پوری پابندی کی اور شکایت کی کوئی وجہ نہیں پیدا ہوئی لیکن جب شمال کے ناگزیر حالات میں  
اورنگ زیب کو اس نظامت سے برخاست کیا گیا تو دکن کے حالات پھر خراب ہو گئے، کیونکہ اس کے بعد جو لوگ  
دکن کی نظامت پر مامور ہوئے تھے وہ اس کام کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ محان دوران۔ بے سنگھ اسلام خاں شہیدی،  
شاہ نواز خاں۔ مراد بخش، اور شایستہ خاں سب ناکام ہوئے ان لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے نہ صرف دکن کے  
چاروں صوبوں (جو راست مغلوں کی مملداری میں تھے) کی حالت خراب ہو گئی اور مالگزار سی میں بے حد خسارہ پڑ گیا،  
بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں سے بھی مغل سلطنت کے تعلقات کشیدہ ہو گئے کیونکہ مغل صوبہ داروں کی  
مزدوری سے فائدہ اٹھا کر ان سلطنتوں نے ۱۰۴۶ھ کے معاہدے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق یہ ہے کہ اسی  
زمانے میں مغلوں کو قندھار کے محاصرے میں شکست ہو گئی اور اس کا نفسیاتی اثر ملک کے دور دراز گوشوں میں

پڑنے لگا، اور دکنی سلاطین بھی اس سے بہت خوش ہوئے۔ یہ اپنے موجودہ خراج و پیش کش کی ادائی اور سیاسی و مذہبی بندشوں کی پابندی میں ہر روز ولایت و عمل کرنے لگے۔ ان حالات میں شہنشاہ نے پھر (۱۶۳۳ء) اورنگ زیب کو دکن کی نظامت سپرد کی۔ شہزادہ اورنگ زیب (۱۶۳۳ء) میں جب دوسری مرتبہ دکن کا ناظم بن کر آیا تو اس کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ اب دکن کے سیاسی اور معاشی حالات بے حد پیچیدہ ہو گئے تھے۔ شہزادے کو نہ صرف مغل صوبوں میں از سر نو اصلاحات اور نظم و نسق کر کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑی، بلکہ معاہدوں کی روشنی میں بیجاپور اور گولکنڈے کے سیاسی تعلقات کو پھر دوبارہ راہ کرنا پڑا، جیسے ۱۶۳۶ء میں تھے۔

اورنگ زیب کو قطب شاہی سلطنت سے سخت شکایتیں تھیں۔ سب سے پہلی شکایت یہ تھی کہ اس سلطنت نے ۱۶۳۶ء کے معاہدے کو بالکل پس پشت ڈال دیا تھا، یعنی اول تو یہ سلطنت اپنا سالانہ خراج جس کی مقدار دو لاکھ ہون تھی ادا نہیں کر رہی تھی۔ حالانکہ مغلوں کے نقطہ نظر سے یہ سلطنت ایسی سیر حاصل تھی کہ اس کو خراج کی ادائی میں کوئی حذر نہ ہونا چاہیے۔ اورنگ زیب نے صوبہ داری کا جائزہ لیتے ہی فوراً خراج اور پیش کش طلب کیے جو سلطنت کے ذمے کئی سال سے باقی تھے۔ نیز ہون کی قدر میں جو اضافہ ہو گیا تھا، یعنی اس کی قدر بجائے چار کے پانچ روپیے تک پہنچ گئی تھی، وہ بھی طلب کیا گیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے لکھا تھا کہ:-

”تتمہ پیش کش و سابق بز و دی رو بہا گشتہ . . . بہ حضور پرنور برسد و وصول وجوہ

پیکش مال از میعاد در نہ گذشتہ اہمالے در آن نہ رود“

گولکنڈے کی دوسری عہد شکنی یہ تھی کہ پھر سب صحابہ کبار کی مذموم رسم شروع ہو گئی تھی اور ایران سے وہی سیاسی تعلقات پیدا ہو گئے تھے جو معاہدے سے پہلے تھے چنانچہ اورنگ زیب کے الفاظ میں:-

”ترک سنت و اظہار بدعت شعار خود ساختہ . . . و خود را بہ قرآن والی ایران

بستہ ہمہ وقت پیش کش ہائے گراں بہ آدمی فرستد“

اس کے علاوہ ایک اور تازہ شکایت یہ تھی کہ راجہ چند رگری سری رنگ رائے نے گولکنڈے کی دست درازیوں سے بچنے کے لیے مغل سلطنت کا سہارا ڈھونڈنا چاہا، چنانچہ اس نے شہزادہ اورنگ زیب اور شہنشاہ کے پاس اپنے آدمی روانہ کیے اور امداد کے بدلے شہنشاہ کی خدمت میں پچاس لاکھ ہون۔ دو سو ہاتھی قیمتی جواہر اور سالانہ پیشکش و نذرانہ دینے کا وعدہ کیا، اور یہ بھی لالچ دی کہ اگر شہنشاہ چاہیں تو میں مسلمان ہونے کے لیے تیار ہوں۔ اس لالچ میں اورنگ زیب اور شاہجہاں دونوں، بیجا پور اور گولکنڈے کے مقابلے میں کرناٹک کے راجہ کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے پیر زور الفاظ میں شہنشاہ کو راجہ کی امداد کے لیے توجہ دلائی تھی۔

یہ تمام شکایتیں آسانی سے حل ہو جاتیں اور معاملات انتہائی حد کو نہیں پہنچتے، چنانچہ سری رنگ رائے کے میر جملہ کی غداری معاہدے میں سلاطین دکن نے بالا بالا شاہجہاں کی خدمت میں نذرانے پیش کر کے شہنشاہ کو راضی کر لیا کہ وہ اس میں دخل نہ دیں، اور شہنشاہ نے خاموشی اختیار کر لی اور اب رہا عہد شکنی، اس کی بھی انہوں نے تلافی شروع کر دی تھی، یعنی عبداللہ قطب شاہ نے اپنے بقائے میں اٹھائیس لاکھ روپیے ادا کر دیے اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد تو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے تھی، لیکن قطب شاہی سلطنت کی بد قسمتی سے محمد سعید میر جملہ کا ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا جس کا سلجھانا قطب شاہی سلطنت کے بس کی بات نہ تھی۔ محمد سعید وہ شخص ہے جو <sup>۱۶۶۰ء</sup> ۱۶۶۰ء میں بہت غصہ حالت میں گولکنڈہ آیا تھا۔

۱۔ محمد سعید کا ابتدائی خاندانی تعلق اردستان سے تھا، لیکن اس کی پیدائش اصفہان میں ہوئی تھی، کیونکہ اس کا باپ اصفہان میں آباد تھا، اور تیل بیچتا تھا، اس لیے اس کو از سادات اردستان اور اصفہان کہا گیا ہے۔ دائر الامرا جلد سوم ص ۵۳۰۔ چونکہ گولکنڈے کی سلطنت اپنے جواہر کی وجہ سے بہت مشہور تھی اس لیے محمد سعید اپنی قسمت آزمائی کے لیے <sup>۱۶۶۰ء</sup> ۱۶۶۰ء میں گولکنڈہ آ گیا، غالباً اس کا ورود گولکنڈے میں کسی بڑے تاجر کے ساتھ ہوا تھا جو یہاں جواہر کی تجارت کرتا تھا، اور محمد سعید اس تاجر کے کاروبار میں معمولی نوکری حیثیت میں شریک تھا (مداس کے اوراق پارہ جلد اول)

لیکن اپنے سیاسی متھکنڈوں سے کام لے کر جلد ترقی کر گیا، اور ۱۰۴۹ھ میں میر جملہ ہو گیا جو قطب شاہی سلطنت کا جلیل القدر عہدہ تھا چونکہ اس زمانے میں تیغ کرنا ٹک کی بہت رواروی تھی، بادشاہ نے محمد سعید ہی کو اس کام کے لیے موزوں سمجھا غالباً محمد سعید نے خود اس کی خواہش کی تھی کہ یہ کام اس کے سپرد کیا جائے ظاہر ہے کہ کرناٹک کے کمزور رائلوں اور ٹانگوں کو مغلوب کرنا کچھ مشکل نہیں تھا چنانچہ پچھلے باب میں ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ ۱۰۵۵ھ میں میر جملہ نے کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر جس کے حدود ساحل مدراس سے ملتے تھے ہمنگر کر لیا ان فتوحات کی وسعت جن میں کڑپا، سدھوٹ اور گندی کوٹہ شامل تھے تین سو میل طول اور پچاس میل عرض بتائی جاتی ہے اور چالیس لاکھ ان کا محاصل تھا۔ خود گندی کوٹہ ایک چھوٹی راجدھانی تھی زراعت اور جواہر کے معدنوں کی وجہ سے یہ خطہ اس قدر زرخیز تھا کہ میر جملہ نے یہاں اپنی جاگیریں پیدا کر لیں اور ہزاروں کی دولت جمع کر لی، اس کے علاوہ نئے معدن دریافت کر کے لاکھوں روپیے کے جواہر حاصل کر لیے سمندر میں اس کے جہاز چلتے تھے، قطب شاہی فرج کے علاوہ

منوچی کہتا ہے کہ محمد سعید ایران کے ایک بڑے تاجر کانوکر تھا، اور یہ تاجر گھوڑوں کی تجارت کے لیے گولکنڈہ آیا تھا۔ محمد سعید ان گھوڑوں کی نگرانی کیا کرتا تھا، لیکن جب یہ گولکنڈہ آیا ہے تو اس کی حالت یہ تھی کہ وہ راستوں میں جوئے بیچتا پھرتا تھا، لیکن چند ہی روز میں چھوٹے کاروبار سے بڑھ کر جواہر کی تجارت شروع کر دی اور ایک بڑی دولت جمع کر لی اور درباریوں کو فراہم کر کے بادشاہ کے پاس رسوخ پیدا کر لیا جب بادشاہ کے پاس پیش ہوا تو کئی عہدہ ہاتھی بلورپ اور چین کے نایاب کپڑے پیش کیے جن سے بادشاہ بہت خوش ہوا، اور اس کو نوکری دی، غالباً اس کو درجہ یہ درجہ ترقی دی گئی تھی، اور جب وہ اپنے کام میں اہل ثابت ہوا تو بالآخر بادشاہ نے اس کو کرناٹک کا طرفدار بنادیا (منوچی جلد اول ص ۲۳۲)۔

جو سلطنت نے اس کے سپرد کی تھی اپنے ذاتی خرچ سے ایک اور مستقل فوج جمع کر لی تھی جس میں فرانسیسی توپیں تھیں اور توپچی نوکر تھے۔ اس فوج کی تعداد کوئی پانچ ہزار سوار، اور بیس ہزار پیدل بتائی جاتی ہے۔ میر جملہ کے اس شاہانہ انداز سے آس پاس کے لوگ بہت ڈرتے تھے چنانچہ مغربی تاجرانہ یعنی پرتگالی اور فرانسیسی اس کے پاس تحفے اور نذرانے بھیجتے تھے۔ مدراس کے قول کے سلسلے میں اس نے انگریزوں سے توپیں وصول کی تھیں۔

ان حالات میں محمد سعید کرناٹک کا ایک مقتدر رئیس بن بیٹھا تھا، اور اس غیر معمولی اقتدار کے گھمنڈ میں وہ اپنے کو قطب شاہی سلطنت سے بے نیاز سمجھنے لگا، اور ایک خود مختار سلطنت کی ٹھان لی۔ اردھر بادشاہ اور اس کے درباری بھی اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بدگمان ہونے لگے اور بادشاہ کو لوگوں نے سمجھایا کہ وہ ایک روز باغی ہو جائیگا۔ یہ بدگمانی بے معنی نہیں تھی، کیونکہ کرناٹک کی فوج کشیوں میں میر جملہ کو جو مال غنیمت دست یاب ہوا تھا وہ مرکزی حکومت کے حوالے نہیں کیا گیا، اور جس وقت اس مال غنیمت کا مطالبہ ہوا تو اس کی پابجائی سے صاف انکار ہوسے لگا، اور اس کی یہ وجہ بتائی کہ کرناٹک کی تمام فتوحات اور ان کا مال غنیمت اسی کی کوششوں کا پھل ہے، اس سے سلطنت کو کوئی سروکار نہیں۔ حالانکہ یہ دعویٰ غلط تھا، میر جملہ آخر گولکنڈے کا ملازم تھا، یہ سب اس کے فرائض تھے۔ مرکزی حکومت کو ہر روز یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ اس کے پنجے سے باہر نہ نکل جائے، کیونکہ کرناٹک کے ایک دور دراز خطے میں جہاں مرکزی حکومت کی کوئی گرفت نہیں تھی، وہ ایسا قلعہ تھا کہ بادشاہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اب بادشاہ کے پاس صرف ایک ہی چارہ کار تھا کہ اس کو گولکنڈہ طلب کر کے پھانس لے۔ چنانچہ درباریوں کے کہنے سے بادشاہ نے اس کو

۱۔ منوچی، جلد اول ص ۲۳۲۔ نیورنبرگ جلد اول ص ۲۲۷۔

۲۔ منوچی جلد اول ص ۲۳۲۔ پرتگالی مقبوضات کا گورنر دام قلب سکرینہا نے، گو اسے میر جملہ کے پاس

بہت سے نایاب تحفے بھیجتے تھے۔

بار بار گولکنڈہ طلب کیا، پہلے تو اس نے بادشاہ کے ہاں آنے سے انکار کر دیا، لیکن جب مرکزی حکومت سے اصرار ہوا تو چند روز کے لیے گولکنڈہ آیا، اور غالباً دربار میں بھی باریاب ہوا تھا لیکن جب اہل دربار کے اشلایے بادشاہ نے اس کو پھانسیا چاہا، اور محمد سعید کو اس کی خبر لگی تو وہ پھر راتوں رات کرناٹک بھاگ گیا، اور قطب شاہی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی، قطب شاہی ٹمک کا تو اسے پاس و محاط نہیں تھا کہ وہ عبداللہ کی اطاعت کر لیتا لیکن اس کے ہاں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ سلطنت سے کھلی لڑائی مول لیتا اپنی فوجی طاقت کے باوجود جس میں اہل یورپ بھی نوکر تھے اس کا سربراہ ہونا مشکل تھا، اس لیے وہ ایران - بیجاپور اور مغل سلطنت کی حمایت ڈھونڈنے لگا کہ ان میں سے کوئی طاقت اس کو پناہ دیدے! اس غرض کے لیے اس نے ایک طرف شاہ ایران اور دہلی بیجاپور کو خطوط لکھے تو دوسری طرف مغل سفیر کو اپنے ارادے کی اطلاع دی جو گولکنڈے میں متعین تھا اول الذکر دو سلطنتوں نے اس کی درخواست فوراً منظور کر لی، اور ادھر جب گولکنڈے کے حاجب عبداللطیف کی رپورٹ اورنگ زیب کے ہاں پہنچی تو یہ محمد سعید کی مدد کے لیے تیار ہو گیا، اور شاہجہاں کے پاس سفارش کر دی کہ:-

”محمد سعید میر جملہ ہموارہ اظہار عقیدت و ارادت نسبت بہ درگاہ سلاطین پناہ

می نماید۔ درین وقت اورا یہ انواع نوازشات بادشاہی مستمال ساخته

بہ بندگی درگاہ والا جاہ رہنوں گرداند“

اور شاہنشاہ نے یہ سفارش منظور کر لی۔ اور محمد یومین کو جو سری رنگ رائل کے لیے مقرر ہوا تھا محمد سعید میر جملہ کے پاس

۱۔ ایک روایت یہ ہے کہ بادشاہ، محمد سعید کو گرفتار کر کے اندھا کرنا چاہتا تھا، یا ٹیورنیر کے الفاظ میں،

اس کو زہر دینا چاہتا تھا (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۴)۔

۲۔ ایک باغی سلطنت کی مدد کرنا نہ صرف بین اقوامی اصول بلکہ معاہدے کی رو سے بھی جائز نہ تھا بادشاہی سلطنت سے

اٹھارہ ہمدردی کرنے کے لیے کرناٹک بھیجا گیا۔

جب گولکنڈے اور بیجاپور کی حکومتوں کو یہ معلوم ہوا کہ مغل سلطنت محمد سعید کی تائید کرنا چاہتی ہے تو یہ دونوں بہت پریشان ہوئیں، اور ان کو یہ خیال ہوا کہ اگر محمد سعید سچ مچ شاہجہاں کے پاس چلا جائے تو اس کے ذریعے سے ان سلطنتوں کے تمام راز فاش ہو جائیں گے۔ اس لیے ان دونوں سلطنتوں نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے الفاظ سے کہ: ”قطب الملک نیز در مقام استمالت اوست“ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسری طرف خود میر جملہ بھی مغل سلطنت کو دھوکا دینے لگا، یہ دراصل مغلوں کی ملازمت نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ مغلوں کے اثر سے کام لے کر قطب شاہی سلطنت کو مرعوب کرے اور اس طریقے سے کرناٹک میں اپنی خود مختارانہ ہستی قائم رکھے چنانچہ محمد مومن کے بیان سے جو کرناٹک سے واپس آیا تھا اس کی تصدیق ہو گئی اور جب اورنگ زیب نے شہنشاہ کے اصرار پر میر جملہ کو بار بار ترغیب دی تو اس نے جواب دیا کہ:-

بہ انقضائے مدت دو سال یا بدیدن قطب الملک بیاید یا ترک توکری کردہ

عزیمت حرمین شریفین نماید“

واقعہ یہ ہے کہ اگر میر جملہ کو کئی طاقتوں سے نہ ڈرتا تو وہ غالباً مغلوں کی پناہ میں نہیں جاتا لیکن اب

جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اس کی صراحت تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے ہا فیوں کو پناہ نہ دیں گے (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری)

جلد اول حصہ دوم ص ۱۷۲) غالباً قطب شاہی سلطنت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔

۱۔ مقدمہ رقعات عالمگیری مولفہ نجیب اشرف صاحب۔

۲۔ لیکن اس کے بیٹے محمد امین نے جو گولکنڈے میں تھا مثل حاجب محمد امین کو یقین دلایا کہ اس کے باپ کا

بیان صرف ایک وقتی مصلحت پر مبنی ہے۔ دراصل ہم لوگ مغل ملازمت میں آنا چاہتے ہیں (مقدمہ رقعات عالمگیری

مولفہ نجیب اشرف صاحب)۔

اس کے لیے ایک خطرہ یہ تھا کہ اس کے دھوکے اور فریب سے گو لکنڈہ بیجا پور کی سلطنتیں اس کی تباہی کے درپے ہو گئیں کیونکہ اس نے بیجا پور کو بھی دھوکے میں رکھا تھا۔ ان خوفناک حالات سے مجبور ہو کر میر جملہ نے بالآخر مغل سلطنت کا دامن پکڑ لیا کیونکہ اس کے سوا اب اس کے پاس بچاؤ کی کوئی اور صورت نہ تھی، چنانچہ اس کی درخواست پر شہنشاہ <sup>شاہ</sup> نے ۱۶۶۷ء میں ۱۶ ستمبر ۱۶۶۷ء کو محمد عارف کشمیری کے ساتھ خلعت فاخرہ با منشور نوازش متضمن عنایت منصب پنج ہزاری پنج ہزار سوار بہ او دو ہزاری دو ہزار سوار بہ محمد امین پیرش بھیج دیئے۔ اس کے ساتھ عبداللہ قطب شاہ کو بھی دھمکی دی گئی کہ محمد سعید کے متعلقین پر کوئی دست درازی نہ کرے۔ کیونکہ محمد سعید کا بیٹا، اور دوسرے متعلقین گو لکنڈے میں تھے۔

لیکن ابھی شہنشاہی فرمان جو میر جملہ (محمد سعید) اور عبداللہ قطب شاہ کے نام تھے گو لکنڈہ نہیں پہنچے تھے کہ میر جملہ کے بیٹے محمد امین نے اپنی احمقانہ حرکات کی وجہ سے سیاسی فضا اور بھی ٹکڑ کر دی۔ یہ پہلے سے بے نشہ دو بالائے جوئی و دولت سرشار رعونے و سرمداشت "اب اپنے باپ کی روز افزوں طاقت اور مغل سلطنت کی حمایت سے اور بھی مغرور ہو گیا، یعنی "پا از حد خود فرو تر گذاشت"۔ ایک روز نشہ میں چور دربار میں آکر مسند پر سو گیا، اور قے کر دی،<sup>۳</sup> یہ ایسی گستاخانہ حرکت تھی کہ بادشاہ اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا بلکہ حکومت کا وقار قائم رکھنے کے لیے اس کا تدارک کرنا ضروری تھا چنانچہ بادشاہ نے اس کو گرفتار کر کے اس کا مال جائیداد ضبط کر لی۔ گو اس دوران میں محمد امین کے لیے

۱۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ میر جملہ نے بنگال کے گورنر شجاع کو بھی لکھا تھا کہ تم گو لکنڈے پر حملہ کرو اور میں تم کو مدد دیتا ہوں (ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۳۵)۔

۲۔ اس نے اپنی درخواست میں اپنے چالیس ہزار سوار مغل شہنشاہت کی خدمت کے لیے پیش کیے کہ اگر گو لکنڈے پر حملہ ہو تو اس کے لیے میں تیار ہوں، اور اورنگ زیب کو ترغیب دی کہ فوراً حملہ ہونا چاہیے

(منوچی، جلد اول ص ۲۳۳)۔

۳۔ تاثر الامراء، جلد سوم ص ۵۳۱۔



شہنشاہی احکام بھی پہنچ گئے تھے اور یہ عبداللہ کو دکھلائے گئے، لیکن اس نے ایک نہیں سنی اور بابر تدارک کیا۔ چونکہ یہ گولکنڈے کی طرف سے شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی تھی اس لیے مغل حکومت شہنشاہی وقار کی حفاظت کے لیے عبداللہ قطب شاہ کی سرکوبی پر تل گئی۔ پہلے تو عبداللہ کے نام احکام پہنچے کہ "باید کہ پیرش (محمد امین) راروانہ این جانب نماید والا شکر ظفر اثر را بہ گولکنڈہ رسیدہ داند" اور اس اثنا میں ہادی دادخاں نامی ایک مغل جنرل کو جو دلوگڈہ میں تھا، قندھار پر کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا، اور ۲۶ دسمبر ۱۵۶۱ء کو اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو تاندیڑ روانہ کر دیا گیا، اور اس شہزادے کو یہ حکم تھا کہ اگر قطب الملک پیر میر جملہ و متعلقان را خلاص سازد بے توقف بہ حیدر آباد و رآمدہ بہ موجب حکم اقدس کام و ناکام محبوسان را از قید برآورد۔ محمد سلطان ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ کو تاندیڑ پہنچ گیا، اور عبداللہ قطب شاہ کو شہنشاہی حکم کی اطلاع کر دی۔

یہاں گولکنڈے میں قطب شاہی حکومت عجیب کش مکش میں پڑ گئی، اگر شہنشاہی تہدید سے محمد امین گولکنڈے پر حملہ اور اس کے متعلقین رہا کر دیے جاتے تو اس سے نہ صرف سلطنت کا وقار غایب ہو جاتا بلکہ اس کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ تھا، اور اگر شہنشاہی احکام سے بے اعتنائی کی جاتی تو مغل فوج گولکنڈے پر دھاوا بولنے کے لیے تیار تھی۔ عبداللہ نے خلاف توقع بہت دنوں تک شہنشاہی احکام سے بے اعتنائی کہ اور وہ اس میں بہت کچھ حق بہ جانب تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ مغل سلطنت صرف اپنے وقار کی پجہ کرتی تھی اور قطب شاہی وقار کی اصلاح پر وا نہیں کی، حالانکہ یہ سلطنت مغلوں کی حمایت میں تھی اس عدول حکمی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ محمد سلطان کی فوج

۱۔ رقصات عالمگیری مولفہ نجیب اشرف صاحب ندوی۔

۲۔ نیوزیئر کہتا ہے کہ عبداللہ تو پہلے سے ہتھیار ڈالنے اور قلعہ مغلوں کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن اس کا داماد میر احمد اس کو روکتا رہا، اور ختمہ کو دمکی دی کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو مار ڈالا جائیگا (سیاحت نامہ نیوزیئر

۲۳ ربيع الاول کو نانڈیڑ سے روانہ ہوئی اور حیدرآباد میں داخل ہو گئی اس کے پیچھے اورنگ زیب نے بھی گولکنڈہ کی طرف کوچ کر دیا۔ اب عبداللہ جیسے ڈرپوک آدمی سے زیادہ استقامت کرنا ناممکن تھا اب تک جو کچھ استقامت ہوئی تھی وہ اس کے حوصلوں سے زیادہ تھی، اس نوبت پر اس نے مغل حملے سے ڈر کر فوراً محمد امین اور اس کے متعلقین کو رہا کر دیا۔ چنانچہ یہ باغی حیدرآباد سے چوگنیس میل کے فاصلے پر محمد سلطان سے آکر ملے۔ اگرچہ اب پیشقدمی کی ضرورت بالکل نہ تھی لیکن ابھی محمد امین کا مال و جائیداد ضبط تھی اور محمد سعید کو بھی جو کرنا لگ سے آ رہا تھا پناہ میں لینا تھا، اس لیے محمد سلطان کو یہ حکم ہوا کہ آگے بڑھ کر حیدرآباد میں کسی مناسب جگہ قیام کرے اور میر جملہ کا منتظر رہے چنانچہ محمد سلطان کی فوجیں ۶ ربيع الثانی کو تالاب حسین ساگر پر جا گزریں ہو گئیں اور دو روز کے بعد حیدرآباد میں داخل ہو گئیں کیونکہ فوجی نقطہ نظر سے اول الذکر جگہ اچھی نہیں تھی مغل فوج کے حسین ساگر پہنچنے کے ایک روز پہلے ہی عبداللہ، حیدرآباد چھوڑ کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ چونکہ شہر میں کوئی حفاظت کا سامان نہیں تھا اس لیے یہاں ٹوٹ مار شروع ہو گئی، اور شرفاء و روساء کے مکان اور محلات تاخت و تاراج کے نذر ہو گئے۔ اس طریقے سے شہر کے تمدن کو بہت نقصان پہنچا۔ اگرچہ محمد سلطان نے اس تاخت و تاراج کو روکنے کی کوشش کی اور محمد بیگ کو اس کام کے لیے مقرر کیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، ممکن ہے کہ اس ٹوٹ میں مغل سپاہی بھی شریک ہوں۔

۱۔ لیکن قلعے سے عبداللہ نے محمد سلطان سے مدد کی درخواست کی کہ چالیس لاکھ روپیے نقد دینے کے لیے تیار ہوں، اور اپنی بیٹی شہزادے کے عقد میں دیتا ہوں، لیکن محمد سلطان کو اس کا کوئی اختیار نہ تھا، اس لیے صلح نہیں ہوئی۔ عبداللہ پر یہ اعتراض ہے کہ وہ صلح کی درخواست بھی کر رہا تھا، اور حملہ بھی کر رہا تھا، غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر احیاناً صلح نہ ہو تو مدافعت کا اختیار ہاتھ سے نہ جائے اور عادل شاہی ملک کا انتظار بھی تھا کیونکہ جاپور سے ایک فوج آ رہی تھی۔

اگرچہ محمد سلطان کے حسین ساگر آنے کے بعد قطب شاہی فوجوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ ضرور ہوئی تھی لیکن باضابطہ مقابلہ اورنگ زیب کے آنے کے بعد ہوا۔ ۶ فروری کو اورنگ زیب حیدر آباد پہنچا اور ۱۲ ربیع الثانی ۱۰۳۰ھ میں قلعے کا محاصرہ کر لیا جو ۶ فروری سے ۳ مارچ تک جاری رہا، اور ۳ جمادی الثانی ۱۰۳۰ھ مطابق ۳ مارچ کو میر جملہ بھی کرناٹک سے آکر مغل فوج کے ساتھ محاصرے میں شریک ہو گیا۔ محاصرے کا حال یہ تھا کہ قدرتی طور پر مغلوں کو قلعے پر وار کرنے کے لیے اچھے مواقع تھے۔ قلعے کے باہر شمال مشرقی سمت ایک اچھی پہاڑی تھی جس پر مغل فوجوں نے اپنے مورچے باندھ کر قلعے پر زبردستی اور اس وجہ سے قطب شاہی فوجوں کو قدم جما کر لڑنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ فوجیں قلعے سے باہر نکل کر حملہ کرتی تھیں اور شکست کھا کر واپس ہو جاتی تھیں۔ قلعے کے مشہور برج سے جو بعد کو ”موسنی برج“ کے نام سے موسوم ہوا، بڑی مدافعت کی گئی، اس برج میں گولکنڈے کا مشہور جنرل میر میراں مر گیا، اور اس کے بعد موسنی خاں متعین ہوا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر یہ لڑائی برابر جاری رہتی تو

۱۔ سنوچی کہتا ہے کہ وہ (محمد سعید) عبداللہ قطب شاہ سے انتقام لینے کے ورپے تھا (سنوچی جلد اول ص ۱۲۵)۔  
 ۲۔ ”موسنی برج“ جس کو دھرم پور مستری نے بنایا تھا، اس محاصرے کی مشہور یادگار ہے، چوں کہ یہ برج موسنی خاں کی نگرانی میں بنا تھا، اس لیے آج تک اس کا نام ”موسنی برج“ ہے اور اس پر یہ کتبہ کندہ ہے:۔

”بہ میر میراں حکم عالی صادر گردید کہ شما قایم بودہ مورچہ و نقب نزدیک این برج تا بخدق

رسانید پول درین جا برج کوچک بودا، حکم جهان مطاع عالم مطیع خسرو زماں

شہنشاہ و دران السلطان العادل ظل اللہ ابو المظفر ابو المنصور ابو الغازی

سلطان عبداللہ قطب شاہ یہ دستورالوزر را فی الزمان مقرب المحفرت السلطانیہ

محمدا لدولہ الخا تا تانیہ خان ذی شاہا سپہ سالاری موسنی خان چنان شرف صدور

یافت کہ خود درین جا بودہ یہ دفعہ فہم مشغول باشند برآن خان مالی شاہا شب و روز

اس کا فیصلہ کس فریق کے حق میں ہوتا لیکن عبداللہ اپنی فطری کمزوری سے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ قلعے میں سے اورنگ زیب کے پاس کئی آدمی اور تحفے آئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اس قلعے کو مسخر کر کے اسی وقت قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے شرائط صلح ماننے سے انکار کر دیا۔ اس اثنا میں شاہجہاں کی طرف سے بھی احکام آئے کہ عبداللہ کے شرائط پر صلح کر لی جائے۔ لیکن اورنگ زیب نے یہ احکام چھپا دیے اور لڑائی جاری رکھی۔ پھر عبداللہ قطب شاہ نے ناچار شہزادہ محمد سلطان کی خوشامد کی، میر نصیح، اور اپنے داماد میر احمد کو شہزادے کے پاس بھیجا، اور اورنگ زیب کی منظوری سے عبداللہ کی ماں حیات بخش بیگم بھی درخواست صلح کے لیے آگئی۔ چنانچہ حیات بخش بیگم، میر نصیح کے ساتھ اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور اس کا ہاتھ قاعدہ احترام کیا گیا، یعنی ایک مورخ کے الفاظ میں ”پس از وصول استمالت نامہ بہ امید حصول مرام

بہ ہشیاری تمام درو فح غنیم بودن از قضا ربانی غلولہ توپ بر وجہ و میر میران چنان  
خورد کہ در ہاں مورچہ ہلاک گشت و بعد از فوت او بہ سہ روز صلح شد و بعد از  
گذشتن محاصرہ بہ خان مشائر الیہ حکم عالی شد کہ برج عظیم درین جا بنا باید کرد تا  
غنیم را فرصت نقب مورچہ کنند مجال نباشد بنا بر حکم ہایون اعلیٰ بہ اندک  
زمانی این برج عظیم بہ سعی خان موسی الیہ در سال سینہ ہزار و ہفتاد و ہفت  
بہ اتمام رسید و اسم مہار دھرم پچار“ (دائرہ کن، علی اصغر صاحب بگرامی)

۱۔ چونکہ دارا شکوہ، اور اورنگ زیب میں مخالفت تھی، اس لیے قطب شاہی حکومت نے اس مخالفت سے فائدہ اٹھایا، یعنی اپنے ایک سفیر ملا عبد الصمد کو آگرے میں بٹھایا تھا جو دارا شکوہ کو سمجھایا کرتا تھا، اور دارا کے ایمان سے احکام آیا کرتے تھے۔ لیکن ٹیڈنیر کا بیان ہے کہ شاہجہاں اپنے پڑائے تعلقات کی بنا پر کہ قطب شاہی سلطنت نے انھیں اڑسے وقت میں پناہ دی تھی گولکندہ پر مہربان تھا (سیاحت نامہ ٹیڈنیر، جلد اول ص ۱۳۰)۔

والدہ رافرتاد۔ حسب الامر عالی جمعی بہ استقبال شتافتہ بہ عزت و احترام در منزل شایستہ خان فرود آوردند۔  
 اس اثنا میں شاہجہاں کے ہمدیدی احکام بھی پہنچ گئے کہ موعودہ شرائط کے ساتھ صلح کر کے حصار اٹھا لیا جائے  
 اور نیز حیات بخشی بیگم کی شخصیت کی وجہ سے اورنگ زیب نے بالآخر شرائط صلح تسلیم کر لیے اور لڑائی موقوف  
 کر دی۔ شرطیں یہ پیش کی گئی تھیں کہ عبداللہ کی بیٹی محمد سلطان کے عقد میں دی جائیگی اور ایک کروڑ مالیت کے نقد  
 جواہر اور ہاتھی تاوان جنگ دیا جائیگا۔ لیکن حیات بخشی بیگم کی درخواست پر خود اورنگ زیب نے اور بعد کو شاہجہاں نے  
 تاوان میں بہت تخفیف کر دی یعنی صرف ستر لاکھ روپیے دینے پڑے اور شاہجہاں کے ہمدیدی احکام کی وجہ سے  
 جس میں داراشکوہ کا مخالفانہ ہاتھ تھا ۴۴ ہجادی الثانی کو فوراً قلعے سے فوج ہٹائی گئی اور اس کے پانچ دن بعد  
 محمد سلطان کا قطب شاہی شہزادی سے عقد عمل میں آیا اس شہزادی کے چہیز میں رام گیر کے علاقے دیے گئے اور اس میں  
 یہ قرار دیا ہوا تھا کہ عبداللہ کے انتقال کے بعد محمد سلطان اس کا جانشین ہوگا۔ غالباً اس ضمیمے کی شہنشاہ کو اطلاع  
 نہیں تھی۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ نے جو عہد نامہ لکھ دیا تھا، اس میں اس کی کافی صراحت تھی۔ معاہدے کے الفاظ

لے۔ عمل صالح۔

لے۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ نے جو معاہدہ لکھ دیا تھا اس سے کوئی تخفیف نہیں معلوم ہوتی۔ یہ مبلغ بست لکھ ہون را  
 بہ طریق نذر و نیاز از نقد و جواہر نفیسہ و از فیلان کہ بہتر از آن پیش مرید موروثی نباشد برساند۔ اس کے علاوہ  
 یہ بھی وعدہ تھا کہ پانچ ہزار سوار مغل سلطنت کی امداد کے لیے دیے جائیں گے اور مغل سلطنت سے یہ درخواست  
 تھی کہ ہراڑے وقت میں وہ قطب شاہی سلطنت کی مدد کرے (تاریخ ظفر)۔

لے۔ مقدمہ رقعات عالمگیری مولوی نجیب اشرف صاحب بیورنیر اور منوچی نے اس کی صراحت  
 کی ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے بعد محمد سلطان کی جانشینی معاہدے میں شریک تھی بیورنیر

یہ ہیں: ”اول این کہ ..... صبیہ صلیبہ خویش را بہ حبالہ ازدواج تازہ نہال ..... محمد سلطان .....  
 در آورده کہ بعد از مرید موروئی ایالت این ملک بہ آن بیدار بخت متعلق باشند و دیگر آنکہ سولے پیش کش مقرر  
 مبادلہ دولک و پنجاہ ہزار ہون قلعہ ارم گیر را با ولایات متعلقہ سابق آن حوالہ دکلائے سرکار فیض آثار نماید<sup>۱</sup>  
 میر جملہ کی غداری سے جس کا کوئی پہلو بھی حق بہ جانب نہیں تھا، قطب شاہی سلطنت کو بہت برے دن  
 دیکھنے پڑے۔ اس ڈیڑھ سو سال کے دوران میں جب سے یہ سلطنت قائم ہوئی تھی، غداری کی پہلی مثال تھی اس بے وفائی سے  
 سلطنت کو جس قدر نقصان پہنچا اس کی پھر تلافی نہیں ہو سکی اور اس گرتے ہوئے زمانے میں کہاں تلافی ہو سکتی تھی۔  
 چونکہ قطب شاہی سلطنت کو دب کھل کر کرنی پڑی تھی اس لیے شہنشاہت کو جاہلانہ مداخلت کا موقع تھا۔ اب یہ توبت  
 پہنچ گئی تھی کہ قطب شاہی سلطنت نہ صرف شہنشاہ اور صوبہ دار دکن کو لاکھوں روپیوں کا نذرانہ دیتی تھی بلکہ  
 مغل حاجبوں پر جو گوگلکندے میں رہتے تھے زرد جواہر کی بوچھاڑ کرتی تھی اور اس وقت سلطنت کے بقا کی یہی  
 ایک سبیل رہ گئی تھی اور اگر فرانسیسی سیاح برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو گوگلکندے کی اصل حکومت مغل حاجب  
 کے ہاتھ میں تھی اور گوگلکندے کا حکمران بالکل بے دست و پا تھا۔ برنیر کہتا ہے کہ:۔

”گوگلکندے میں اورنگ زیب کا سفیر احکام جاری کرتا، پرہ ولفے دیتا، عوام کے ساتھ

بد سلوکی کرتا، اور دھمکیاں دیتا ہے مختصر یہ کہ اس کے افعال اور اقوال ایسے

خود مختارانہ ہوتے ہیں جیسے ایک مطلق العنان حکمران کے“<sup>۲</sup>

۱۔ تاریخ ظفرہ۔

۲۔ جمشید قطب شاہ کے انتقال کے بعد سیف خاں مین الملک جگہ پوراؤ، اور سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں

محمد امین میر جملہ باغی نے سلطنت سے انحراف کیا تھا، لیکن ان سے حکومت کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔

۳۔ سفرنامہ برنیر ص ۱۹۵۔

نیز اس باغی (محمد سعید) کی حمایت سے جو مغل سلطنت کے طرف سے ہوئی تھی نہ صرف گولکنڈے کے وقار کو زبردست دھکا لگا، بلکہ سلطنت کا رعب و داب غایب ہو گیا، اور راعی و رعایا کے تعلقات جو ضبط و تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے، ٹوٹ گئے۔ اکابر سلطنت بادشاہ کی کوئی وقعت نہیں کرتے اور من مانے ظلم و زیر دستی کرتے ہیں اور عوام اس سلطنت کا جو اتار کر مغل سلطنت میں شامل ہونے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خود عبداللہ قطب شاہ نے شہر حیدرآباد چھوڑ کر گولکنڈے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو عبداللہ نے دربار کی نشست بھی چھوڑ دی تھی۔

قسمت کے اس فیصلے میں گولکنڈے کے ساتھ بیجاپور کی سلطنت بھی اسی طرح شریک تھی جس طرح مرہٹوں کا احیا ۱۰۳۶ھ کے معاہدے میں تھی۔ گولکنڈے سے فراغت پا کر مغل فوجوں نے بیجاپور کا رخ کیا اور ۱۰۶۷ھ میں اس سلطنت سے بھی کچھ اسی قسم کی شرطیں منوالیں جو قطب شاہی سلطنت سے ہوئی تھیں۔ لیکن مغل سلطنت کو اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ عین اسی زمانے میں دکن میں ایک نئی طاقت پیدا ہو رہی تھی جو آگے چل کر بہت خطرناک ہو گئی اور یہ مرہٹوں کی طاقت تھی جو سیوا جی بھونسلہ کی رہنمائی میں

۱۔ سفر نامہ برنیر ص ۱۴۳-۱۴۵۔

۲۔ بیجاپور کے ساتھ بہت سی شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں، لیکن قریبی شکایت جس کی بنا پر اورنگ زیب نے حملہ کر دیا یہ تھی کہ ابھی چند روز پہلے جبکہ مغل فوج گولکنڈے پر حملہ آور ہو رہی تھی محمد عادل شاہ نے قطب شاہی سلطنت کی مدد کے لیے ایک فوج بھیجی تھی۔

۳۔ سیوا جی بھونسلہ جس کا ننیال اور دیال نظام شاہی سلطنت کے ملازم و جاگیر دار تھے جنیر میں (سنہ ۱۱۲۲ھ) پیدا ہوا، اور یہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۱۳۶ھ سے اس نے نظام شاہی سلطنت کے لیے بے روزگار سپاہیوں کو (جو موالی کہلاتے ہیں) جمع کر کے بیجاپور کے قلعوں پر وار کرنا شروع کر دیا۔ اس سند میں اس نے پہلے قلعہ تورنا پر حملہ کیا، اس کے بعد سین گڈھ۔ پور ندھر وغیرہ کے قلعے حاصل کر لیے جو بیجاپور کے مقبوضات تھے اور

آہستہ آہستہ تمام دکن پر چھا گئی اور نعل سلطنت کے لیے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا جو بہت صبر آزما ثابت ہوا۔ دکن کی مسلمان سلطنتوں کو نیچا دکھانا تو ہر وقت آسان تھا لیکن مربٹوں کو مغلوب کرنا بے حد مشکل ثابت ہوا سیوا جی کی جولانیاں ۱۱۶۴ھ سے شروع ہوئیں۔ اس کے پہلے دس سال تو بیجا پوری علاقوں کی تاخت و تاراج میں گزرے جس کا ناخداۓ سیاست محمد عادل شاہ جیسا کمزور بادشاہ تھا۔ جب تک محمد عادل شاہ زندہ رہا سیوا جی کا کوئی مزاحمت نہ ہو سکی، جب بیجا پور پر اس کے داؤ چل گئے اور اس کی طاقت بڑھ گئی تو مغل علاقوں پر حملے شروع کر دیے اور یہاں بھی اس کے لیے میدان کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ ادھر ۱۰۶۹ھ سے مغل سلطنت میں اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کے مابین ایک سخت خانہ جنگی شروع ہو گئی جو اورنگ زیب کی شہنشاہیت پر ختم ہوئی۔ لیکن نئے شہنشاہ بہت زمانے تک دکن کی طرف توجہ کرنے کے قابل نہ تھے، اور اس کی وجہ سے سیوا جی کو دکن میں اچھی طرح اُدھم مچانے کا موقع مل گیا چنانچہ عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کر کے سیوا جی نے ۱۰۷۰ھ سے مغل علاقوں پر وار کرنے شروع کر دیے، اور سیواۓ بے سنگھ کے تمام مغل جنرلوں کو ایسا ہرایا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکے۔

لیکن محمد عادل شاہ نے مرنے کے بعد جب اس کا جانشین علی عادل شاہ اول ۱۰۶۷ھ میں تخت پر بیٹھا تو پھر عادل شاہی سلطنت میں جان آگئی اس نوجوان بادشاہ نے جس کو دکن کا آخری سورا کھنا چاہیے عادل شاہی سلطنت کو بچانے کی کامیاب کوششیں کیں اور سیوا جی کی جولانیوں کا پورا جواب دیا۔ پہلے اس نے

اس طرح آہستہ آہستہ ۱۰۶۶ھ تک دس سال میں بیجا پور کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایک طاقت فراہم کر لی۔ حالانکہ یہ لوگ زمانے میں اسی بیجا پوری سلطنت کے نمک خوار تھے۔

۱۰۷۶ھ سے پہلے جو ۱۰۷۶ھ میں دکن آیا تھا، شاید خاں اور جہونٹ سنگھ سیوا جی کے مقابلے کے لیے آئے، لیکن ان دونوں کو ہزیمت ہوئی۔



مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لیے افضل خاں کو <sup>۱۷۵۹ء</sup> ۱۷۵۹ء میں بھیجا جو بد قسمتی سے سیوا جی کے مکرو فریب کا شکار ہو گیا، اس کے بعد جب سدھی جوہر صلابت خاں گیا، اور یہ بھی بہت جلد اس کے دام فریب میں آ گیا تو علی نے خود <sup>۱۷۶۰ء</sup> ۱۷۶۰ء میں بڑھ کر پنالہ کے قلعے میں سیوا جی کو شکست دے اور اٹھ بھگا دیا۔ چنانچہ بیجا پور کے ملک الشعراء ملا نصر قی نے اس واقعے کی تعریف میں کہا تھا کہ

”علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں“

اور ادھر شمال سے شایستہ خاں و جسونت سنگھ کی شکست کے بعد شہنشاہ نے اپنے مشہور جنرل جے سنگھ کے تحت ایک بڑی فوج بھیج دی اور عادل شاہی سلطنت سے اتحاد عمل کی درخواست کی گئی تو علی عادل شاہ نے اس صلہ پر لبیک کہا، اور جے سنگھ کے آنے سے بہت پہلے بیجا پور کے مشہور جنرل خواص خاں کو سیوا جی کے مقابلے کے لیے بھیج دیا جو اہل خاں نے <sup>۱۷۶۰ء</sup> ۱۷۶۰ء میں سیوا جی کو ایسا تھکا دیا کہ مغل فوجوں کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ چنانچہ جب جے سنگھ دکن آیا اور اپنے حملے شروع کیے ہی تھے کہ سیوا جی نے ہتھیار ڈال دیے اور مغل سلطنت کی اطاعت اختیار کر لی۔

لیکن اس واقعے کا ایک تاریخی رخ یہ تھا کہ سیوا جی نے مغل سلطنت کی چند روز اطاعت کر کے جے سنگھ کو اپنے دیرینہ منصوبوں میں شریک کر لیا، یعنی عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ اور مرہٹہ طاقت کا احیا اس کا اصل مقصد تھا۔ اول تو سیوا جی کی اطاعت بھروسے کے قابل نہ تھی اور یہ ایک دھوکا تھا، دوسرے بیجا پور کے خلاف جے سنگھ کو آمادہ کرنا بھی فریب سے خالی نہ تھا۔ جے سنگھ اتحاد عمل کے پھلے معاہدے کو بالائے طاق کر کے جو شہنشاہ اورنگ زیب نے علی عادل شاہ کے ساتھ کیا تھا سیوا جی کے ساتھ شریک ہو گیا اور عادل شاہی سلطنت پر اٹھ آیا، اور اس کی یہ حرکت کھلی بد عہدی تھی اب اٹا یہ ہوا کہ جو فوجیں سیوا جی کے مقابلے کے لیے آئی تھیں وہ بیجا پور پر پلٹ پڑیں جس سے عادل شاہی سلطنت سخت پریشان ہوئی کیونکہ اب اس کو دو دشمنوں کا سامنا تھا۔

لیکن علی عادل شاہ ثانی جو اچھا مدبّر اور سپاہی تھا پوری تیاری کے ساتھ جے سنگھ کے مقابلے کے لیے آگیا، اور بیجا پور کی دیواروں کے سامنے اس کو ایسی شکستیں دیں کہ مغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بیجا پور سے جے سنگھ کی چار پانچ لڑائیاں ہوئیں جن میں بیجا پور کے نامور سپہ سالار خواص خاں اور سید الیاس۔ شہزہ خاں نے جان توڑ کوشش کی اس کے علاوہ اس داروگیر میں قطب شاہی سلطنت نے بھی اپنی پُرانی روایت کے مطابق حصہ لیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے خود اپنے طور پر گولکنڈے سے مدد بھیج دی۔ کیونکہ اب نظام شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد بیجا پور ہی دکن کا آخری سہارا رہ گیا تھا۔ پہلے قطب شاہی جنرل شہزہ خاں روانہ ہوا، اور اس کے بعد ہارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیدل کے ساتھ نیک نام خاں، جو اس زمانے میں قطب شاہی سلطنت کا چہرہ جملہ ہو گیا تھا موقع جنگ پر پہنچ گیا۔

۱۷۳۳ء میں جبکہ مہابت خاں نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کیا تھا عبداللہ قطب شاہ نے اس موقع پر کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ محمد عادل شاہ نے مقدور بھر اس امداد میں حصہ لیا، اور گولکنڈے کو بھی اشارہ کیا تھا، اور غالباً اسی اتحاد عمل کو مقبوضہ کرنے کے لیے ۱۷۳۳ء میں محمد عادل شاہ نے عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطانہ سے شادی کی تھی، لیکن اس وقت عبداللہ مغلوں سے ایسا سہما ہوا تھا کہ مدد کی ہمت نہیں کی۔ لیکن اس زمانے میں جبکہ مغلوں سے بیجا پور کی لڑائی ٹھنی ہوئی تھی مرہٹوں کی وجہ سے دکن کے حالات بالکل بدل گئے تھے، یعنی مغل سلطنت مرہٹہ طاقت سے اٹھی ہوئی تھی اس لیے اب قطب شاہی سلطنت کو مغلوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطانہ جو حاجی بڑے صاحب کے نام سے مشہور تھی بیجا پور میں بہت ذی اثر تھی۔ اسی نے علی عادل شاہ ثانی کی اپنے آغوش میں پرورش کی جو بڑے تیاری کا باعث ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ علی کی عظمت جس کا نصرتی گیت گاتا ہے اسی ناتون کی فیض صحبت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اعلیٰ اس وقت گولکنڈے سے جو بیجا پور کی امداد ہوئی تھی اس میں بھی غالباً اسی کا ہاتھ تھا۔

۱۷۳۳ء۔ بسا تین السلاطین ص ۴۱۳۔ زبیری نے نیک نام خاں کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے: ”نیک نام خاں کہ در شجاعت و

اور اس نے عادل شاہی فوج کے ساتھ پورا اتحاد عمل کیا۔ غالباً اسی اتحاد عمل کا نتیجہ تھا کہ مغل سپہ سالار جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے ایسی فشکستیں ہوئیں کہ وہ اسی شرم کے مارے راہی عدم ہو گیا۔ اور اس طریقے سے ۱۶۶۶ء میں دکن میں چاندنی بی اور ملک عنبر کی پھر یاد تازہ ہو گئی اور بیجاپور آئندہ اور بیس سال کے لیے محفوظ ہو گیا ورنہ جے سنگھ اس کا خاتمہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ X

---

بسالت و کفایت و درایت ممتاز اقران و سرآمد اعیان بود۔

۱۷۔ ان فشکستوں کی وجہ سے جو پانچ مرتبہ ہوئی تھیں جے سنگھ کی بہت بدنامی ہوئی اور شہنشاہ بھی اس پر بہت خفا ہوئے چنانچہ اسی شرم کے مارے یہ ۱۶۶۷ء میں برہانپور میں مر گیا، شمال نہیں جاسکا۔



② سلطان ابوالحسن تمانا شاه

# ستر حواں باب

## ابو الحسن قطب شاہ کی تخت نشینی

عبداللہ کا طویل عہد جو ناکامیوں کی ایک دل خراش داستان ہے، ۳۱ محرم ۸۱۳ھ پر ختم ہوا۔ ملک کی یہ بد نصیبی جو پچھلے ابواب میں ہم دیکھ آئے ہیں صرف بادشاہ کی تخت نشینی سے نہیں بلکہ اس کی پیدائش سے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن یہ عجیب و غریب منظر ہے کہ ان پیہم ناکامیوں کے باوجود جن سے سلطنت کی سیاست کو بڑا دکھا لگا ملک کی رفتار ترقی میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ۸۶۶ھ کی شکست کے پانچ چھ سال کے بعد حکومت پھر اپنے پرانے ڈھچھر پر آگئی چنانچہ حکومت نے

۸۶۶ھ عبداللہ قطب شاہ کا عہد حکومت کوئی چھیالیس سال طویل ہے۔ ہجری سنہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دو سال اور زیادہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ۸۳۵ھ میں تخت نشینی ہوئی اور ۸۱۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ یہ بہت ڈرپوک آدمی تھا، اور لڑائی سے گریز کرتا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کو سخت نقصان پہنچا لیکن اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ اول تو یہ بہت خوب صورت آدمی تھا، اور نظام الدین نے اس کو ہر جگہ عاتقانِ یوسف جمال لکھا ہے، غالباً اس کے آباؤ اجداد اتنے خوب صورت نہیں ہوئے اس کے علاوہ اس کی طبیعت بہت نیک اور خدا ترس تھی۔ اس نے کسی پر سختی نہیں کی اور اس کو علم و فن کا چسکا بھی تھا۔ اپنے دادا محمد قلی قطب شاہ کی طرح یہ بہت مذہب پرست بھی تھا چنانچہ محرم اور ربیع الاول میں بڑے اہتمام سے مذہبی رسوم ادا کیے جاتے تھے۔ محرم میں تمام خوشی کی تقریبات موقوف کر دی جاتی تھیں، اور نہ صرف مسکرات کی دکانیں، بلکہ پان کی دکانیں بھی بند کی جاتی تھیں، تاکہ کوئی

ضرورت کے مطابق دفاعی انتظامات بھی کیے اور جہاں ضرورت ہوئی فوجی مزاحمت سے کام لیا جب مغلوں نے محاصرہ اٹھالیا تو اس پہاڑی کو جو قلعے سے باہر شمال مشرقی سمت واقع تھی اور جہاں سے مغلوں نے قلعے پر زد کی تھی، فسیل اور ضروری برجوں کے ذریعے سے محصور کر کے قلعے میں شامل کیا گیا۔ "موسیٰ بُرج" کی از سر نو تعمیر ہوئی جو اس کے کتبے سے ظاہر ہے۔ کرناٹک کے قطب شاہی مقبوضات پر پورا قابو رکھا گیا۔ ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں قطب شاہی فوج سان تھوم پر قابض ہو گئی اور انگریز کپتانی سے قطب شاہی آئین کی پوری پابندی کروائی۔ سلطنت کے شمالی سمت ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء میں مغلوں کے غلات بیجا پور کی مدد کی گئی، پھر ملک کی خوش حالی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا اور خوشگوار نظم و نسق کی وجہ سے ملک میں پورا امن رہا۔ زراعت و تجارت میں ترقی نہیں تو تنزل بھی نہیں ہوا اور ملک کی دولت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا اس کے علاوہ اس عہد میں شان دار علمی اور تعمیری کام بھی ہوئے۔ نہ صرف شاعروں اور عالموں کی سرپرستی ہوئی بلکہ خود بادشاہ کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ نے حیدر آباد میں کئی عمارتیں بنوائیں جو اپنے تعمیری حسن کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

پان نہ کھائے سب کو سیاہ کپڑے پہننے کا حکم تھا۔ سرکاری ملازمین کو جامدہ اور خائے بنے سیاہ کپڑے دیے جاتے تھے اور دولت خانہ عالی میں روشنی کی جاتی تھی اور مرنے والے بھی پڑھے جاتے تھے۔ ہر روز عصر کے وقت بادشاہ سیاہ لباس پہن کر سنگا سن میں آتے اور اپنے ہاتھ سے الاوے میں روشنی کرتے تھے۔ آدمی رات تک تعزیر ہوتا تھا۔ "داو محل" میں بھی یہ انتظام تھا، اور یہاں بھی بادشاہ آتے تھے، اور اس انتظام میں بہت رویہ صرف ہوتا تھا۔ ربیع الاول کی تقریب جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جاری ہوئی تھی، بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی۔ یہ تقریب سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں مسدود ہو گئی تھی لیکن عبداللہ نے اس کو پھر جاری کر دیا اور اس میں بارہ ہزار ہون صرف ہوتے تھے اور مختلف محلات میں روشنی کی جاتی تھی۔ غرباء اور تحقیق کو کھانا کھلایا جاتا تھا،

۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء میں ۲۱ شعبان ۱۰۷۴ھ کو حیات بخشی بیگم کا انتقال ہوا۔

بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم نے جس طرح سیاست کی مدد کی تھی اسی طرح قطب شاہی تمدن میں بھی اضافہ کیا۔ اگر کچھ نہیں تو اس خاتون کا تعمیر کیا ہوا حیات آباد جس میں ایک بڑی کاروان سرائے مسجد و مدرسہ ہے ہمیشہ یاد رہیگا، اور یہ چیزیں ہیں لگے ابواب میں تفصیل کے ساتھ ملین گی۔ ان ترقیوں کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس سلطنت کی تعمیر ایسے سیاسی مسائل سے ہوتی تھی جو زمانے کے ہر خشک و تر کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ نیز بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم کا اخلاقی اثر بھی اس سلطنت کو آخر دم تک سہارا بنا رہا۔ حیات ماں صاحبہ آخری عہد تک زندہ رہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہ تھا بلکہ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی عبداللہ قطب شاہ کی اولاد

حجاز کے ایک شریف زادے کو دی گئی تھی جس کا نام سید احمد تھا، بعض لوگ اس کا نام سید نظام الدین احمد بتاتے ہیں۔ گوئیورنیر اس کو عرب کا ایک شہزادہ لکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص حجاز کے ایک شریف گھرانے کا آدمی تھا، اور جس طرح اور لوگ اپنی تلاش معاش میں گولکنڈہ آتے تھے اسی طرح یہ بھی یہاں آیا، اور اپنی شرافت و قابلیت کے زور سے قطب شاہی دربار میں داخل ہو گیا۔ اس کا رسوخ اتنا بڑھا کہ عبداللہ قطب شاہ کی شرفاء و نوازی نے اس کو اپنی دامادی کے لیے منتخب کر لیا، اور اپنی بڑی بیٹی سے اس کی شادی کر دی اور اس بیٹی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری بیٹی اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو دی گئی تھی، یہ سیاسی شادی تھی جو ۱۶۱۹ء جمادی الثانی ۱۰۶۶ھ کو عمل میں آئی، شادی کے بعد یہ بیٹی شمال چلی گئی۔ تیسری بیٹی جس کا نام بعض لوگ بادشاہ فی بی بتاتے ہیں، ابوالحسن کو دی گئی جو حالات کے زور سے

۱۔ سفرنامہ گیورنیر جلد اول ص ۱۶۱-۱۶۲۔

۲۔ یہ نہیں معلوم کہ شادی کے بعد اس بیٹی کا کیا حشر ہوا، اور آیا اس کی کوئی اولاد ہوئی تھی۔ چونکہ بعد کو شہنشاہ اورنگ زیب محمد سلطان سے ناراض ہو گئے تھے اور اس کو قید کر دیا تھا، اس لیے قیاس یہ ہے کہ یہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ قید میں مر گئی۔

عبداللہ قطب شاہ کا جانشین ہو گیا۔

اس بات کی وضاحت بہت مشکل ہے کہ شادی سے پہلے ابو الحسن کا قطب شاہی خاندان سے  
 کیا رشتہ تھا! ان روایتوں کو چھوڑ کر جو حیدر آباؤ کے بعض اضلاع میں زباں زد ہیں  
 اور ان خیالات کے قطع نظر جو بعض مورخ بلا تحقیق ظاہر کرتے ہیں قرائن یہ ہیں کہ ابو الحسن عبداللہ قطب شاہ کا  
 داماد ہونے کے علاوہ قطب شاہی خاندان کا راست قرابت دار بھی تھا۔ اب قرابت میں بھی بہت سوں کو اختلاف ہے۔

۱۷۔ سدی پیٹ کی مقامی روایت یہ ہے کہ ابو الحسن موضع انت گری کاربنے والا، اور لدات کا بیٹا تھا۔ اس موضع کے برہمن  
 اکٹا، اور مادنا نے اس کی پرورش کی تھی جب اتفاق سے یہ بادشاہ ہو گیا تو ان برہمنوں کو بہت ترقی دی یہ روایت  
 خلیل اللہ صاحب بی۔ اے ساکن سدی پیٹ سے معلوم ہوئی۔ (مجلہ عثمانیہ جلد ۱۰ شماره ۳-۴)۔

بعض مورخ اس کو قطب شاہی خاندان سے تو کچا ہندوستانی بھی نہیں کہتے بلکہ اس کو ایرانی اور  
 عربی شمار کرتے ہیں، اور غالباً انھیں یہ غلط فہمی اس کے ہم زلف سید احمد کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لالہ جگجیون داس کا  
 بیان ہے کہ ابو الحسن مرد بیگانہ کار ہا وارستہ از قیوم مغل ہمدانی بود بعد مردن عبداللہ قطب الملک دغترش بہ عقد  
 از و واج در آورده بہ حکومت آن ملک رسید۔ (منتخب التواریخ) مفتاح التاریخ کے ملف نامہ میں کہہ  
 وائی ابن دیار سلطان ابو الحسن از نجیب زاد ہائے ایران بود۔ در لباس فقیری بہ سیاحت آمدہ چون دلی حیدر آباد  
 قطب الملک عبداللہ قطب شاہ را پسرے نہ بود بر فطنت و ذکاے او مغتوں ملکہ اورا بہ دامادی گرفت۔

۱۸۔ برٹیر، ٹیورنیر، اور منوچی اسب ابو الحسن کو عبداللہ کا رشتہ دار بتاتے ہیں ٹیورنیر تو ابو الحسن کو عبداللہ کا  
 رشتہ دار ہائی بتاتا ہے سفر نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۳۸۔ منوچی اور مارٹن اس کو پھلے قطب شاہوں کی اولاد میں  
 بتاتے ہیں (منوچی جلد چہارم ص ۴۴۴)۔ یہی تو قطب شاہی خاندان سے اس کا علوی رشتہ بتاتا ہے۔  
 سیاحت نامہ تھیونو، حصہ سوم ص ۱۰۱۔



اور ہر مورخ اپنا خاص خیال رکھتا ہے بغیر مورخ محمد ساقی کہتا ہے کہ ابو الحسن عبداللہ قطب شاہ کا بھتیجا، اور داد تھا ابو بہت کچھ بحث طلب ہے۔ مقامی تاریخیں اور روایتیں یہ کہتی ہیں کہ ابو الحسن کا رشتہ عبداللہ قطب شاہ سے براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تھا، چنانچہ یہ مقامی مورخ ابو الحسن کا رشتہ بادشاہ کے ساتھ اس کی ماں یعنی حیات بخش بیگم کی طرف سے ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی حدیقۃ العالم کے الفاظ میں: ”ابو الحسن کہ از طرف مادہ بادشاہ قرابت قریبہ دارد“ اور خانی خاں کے الفاظ میں: ”از طرف مادر سلسلہ او بہ قطب شاہیہ می رسد“ دوسری مقامی تاریخیں اس حقیقت کو اور زیادہ متکشف کر دیتی ہیں۔ ماہ نامہ کے مولف کا بیان یہ ہے کہ جب نسبت کے لیے عبداللہ قطب شاہ نے ابو الحسن کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ تو محل کی ذمہ دار عورتوں نے جن کے نام ماہ بانو اور سرور ماتھے بیان کیا کہ: ”جو آنے از نبائرین الملک و از احفادین دودمان... شایستہ این نسبت است“ اگر ابو الحسن سیف خاں میں الملک کا پوتا ہے تو اس کا قطب شاہی خاندان کا رشتہ دار ہونا ضروری ہے کیونکہ سیف خاں سلطان قلی قطب شاہ کے چچا زاد بھائی فتی خاں کا بیٹا تھا۔ ولدیزی سیاح ہیوورٹ کے بیان سے بھی اس کی

۱۔ تاثر مالگیری ص ۱۲۳۔

۲۔ حدیقۃ العالم جلد اول ص ۱۶۱۔

۳۔ منتخب الباب جلد سوم ص ۴۰۷۔ خانی خاں کے الفاظ پر مبہم ہو جاتے ہیں اور رشتہ ابو الحسن کی ماں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے لیکن غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رشتہ حیات بخش بیگم کی طرف سے تھا۔

۴۔ ”ماہ نامہ“ ص ۲۲۹ میں لکھی گئی اس کا مولف غلام حسین کہتا ہے کہ اس نے اپنے زمانے میں ابو الحسن کے بھانجے ابو محمد سے جو اس زمانے میں بہت بڑھا ہو گیا تھا یہ حالات دریافت کیے تھے اور غلام حسین سے اس کی قرابت بھی تھی اس لیے اس کا بیان زیادہ مستند ہے۔ (ماہ نامہ ص ۳۱۵-۳۱۶)۔

۵۔ تاریخ قطب شاہی ص ۳۰۔

تصدیق ہوتی ہے! اس کا بیان ہے کہ ابو الحسن براہ راست قطب شاہی خاندان کا رشتہ دار ہے۔ اسی وجہ سے دوسری تاریخیں تو اس کو عبداللہ قطب شاہ کا بہت بڑا قرابت دیکھتی ہیں! اور بعض نے ”در قرابت قریبہ سرکار راست“ لکھا ہے۔ اس طریقے سے اس کو نہ صرف اس بات کا حق تھا کہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد بنے بلکہ قطب شاہی تخت کا بھی مالک ہو۔ چنانچہ قدرتی حالات نے خود بہ خود اس کا انتظام کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عائدانی رشتے کی وجہ سے ابو الحسن کی قطب شاہی خاندان میں شادی ہونی چاہیے تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی میں ابو الحسن ایک دیویشانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور غالباً اس بے راہہ روزندگی کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ نہ صرف اس سے ناراض تھا بلکہ خافی خاں کے الفاظ میں ”عبداللہ قطب شاہ از بعضے اطوار اور بنجیدہ خاطر گشتہ اور از نظر انداختہ بود“۔<sup>۱</sup> یورنیر نے اس میں ایک اور اضافہ یہ کیا کہ جس لڑکی سے ابو الحسن کی شادی ہوئی اس کا پہلے سے بے رفا و رغبت انتظام ہو سکتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ابو الحسن ایک عیاش آدمی تھا، اور اسی وجہ سے بادشاہ اس کی وقعت و عزت نہیں کرتا تھا، شادی کے بعد اس کے اخلاق و عادات درست ہوئے ہیں۔ یہ تمام بیان بے سرو پا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ابو الحسن کے اخلاق و عادات میں کوئی خرابی نہ تھی اور نہ یہ عیاش تھا۔ اگر ”نامہ“ سے استناد کیا جائے تو ابو الحسن شخص عالم و متقی بود۔ اصلاً یہ منہیات و مسکرات میل نہ داشت۔ اس سے زیادہ یہ کہ ”کمالی مورخ“

---

۱۔ سفرنامہ بیرو و رٹ جلد سوم ص ۴۲۵۔ یہ سیاح یہاں تک کہتا ہے کہ ابو الحسن، ابراہیم قطب شاہ کی اولاد میں سے ہے۔

۲۔ گلزار آصفیہ ص ۴۷۔

۳۔ منتخب اللباب جلد سوم ص ۴۰۷۔

۴۔ سیاحت نامہ یورنیر جلد اول ص ۱۳۸۔

معنوی آراستہ و از مقدمات علمی آشنا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان سے اس کی کوئی راہ و رسم نہ تھی، اور چونکہ اس کو شاہی خاندان میں شادی کی امید نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شاہی محل کے غیر معمولی واقعات اس کے موافق نہ ہوتے تو شاہی خاندان میں ابوالحسن کی شادی نہ ہوتی، اس لیے اس عالم مایوسی میں اس نے ایک صوفیانہ زندگی اختیار کی تھی اور حیدر آباد کے مشہور بزرگ شاہ راجو قتالؒ کا مرید ہو گیا تھا جن کی خانقاہ میں اس کے آٹھوں پہر گزرتے تھے، اور کچھ اسی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ اس سے واقف نہ تھا، یہ اس وقت واقف ہوا ہے جبکہ محل کے غیر معمولی واقعات سے وہ مجبور ہو گیا، اور اہل محل نے اس کو واقف کرایا اس سے پہلے عبداللہ کو مطلق خیال نہ تھا کہ اس کی بیٹی ابوالحسن کے عقد میں بیجاگی اتفاق سے کچھ حالات ایسے نمودار ہوئے کہ ایک دم کا یا پلٹ ہو گئی اور ابوالحسن کی شاہی خاندان میں شادی ہو گئی۔

جن اسباب سے اور جس سرعت کے ساتھ یہ کا یا پلٹ ہوئی ہے وہ بہت حیرت انگیز ہیں۔ بات یہی تھی کہ جس لڑکی سے ابوالحسن کی شادی ہوئی ہے اس کی نسبت بہت پہلے سید سلطان نامی ایک حجازی بزرگ سے ہو چکی تھی۔ یہ سید سلطان بھی اسی طرح حیدر آباد میں آیا تھا جس طرح سید احمد کاورد ہوا تھا چونکہ سید احمد کی طرح اس کا تعلق بھی حجاز کے ایک ذی عزت خاندان سے تھا، اس لیے دربار میں اس کی بہت آؤ بھگت ہونے لگی اور

۱۔ ماہ نامہ ص ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶۔

۲۔ ان کا اصل نام شاہ رضی الدینؒ ہے رفیع دروازے سے باہر ان کا مزار ہے، ان کے دادا کا بھی شاہ رضی الدینؒ نام تھا جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں حیدر آباد میں رہتے تھے، لیکن چند سیاسی حالات سے مجبور ہو کر بیجا پور چلے گئے تھے۔

۳۔ یہ روایت مشہور ہے کہ ابوالحسن کے مرشد شاہ رضی الدینؒ راجو نے پورے ایقان کے ساتھ پیشین گوئی کر دی تھی کہ بادشاہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگی۔

یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ سید سلطان کے ساتھ سید احمد کے آبائی ردابط بھی تھے، چنانچہ جب عبداللہ قطب شاہ نے سید احمد سے سید سلطان کی ہابیت دریافت کیا تو اس نے پوری صداقت کے ساتھ سید سلطان کے تمام واقعات بتا دیئے۔ ان کی جان پہچان اس طرح کی تھی کہ وہ نون ایک ہی دیار کے رہنے والے تھے، اور اس کے علاوہ سید سلطان سید احمد کے باپ کا شاگرد بھی تھا، اور اس میں سید احمد سے زیادہ خاندانی شرافت تھی۔ اس لیے عبداللہ قطب شاہ نے اپنی تیسری بیٹی، سید سلطان سے منسوب کر دی، ظاہر ہے کہ اس نسبت میں سید احمد کا مشورہ ضرور شامل تھا چونکہ یہ بڑا داماد تھا، اور سلطنت کے محل و عقد میں بھی شریک تھا، اس لیے ازدواجی نسبت کا سراجام سید احمد کے مشورے کے بغیر کہاں ممکن تھا! اس نسبت کے ساتھ شادی کی تیاری شروع ہو گئی۔ اور اگر اس کے بعد غیر معمولی و ناگوار واقعات ظہور پذیر نہیں ہوتے تو سید سلطان سے شادی ہو جاتی اور گلگڈے کی تاریخ کا انجام کچھ اور ہوتا۔ لیکن ایک واقعے سے سید احمد اور سید سلطان میں غایت درجے کی مخالفت ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ ایک روز عبداللہ قطب شاہ نے دربار میں سید سلطان سے دریافت کیا کہ تم سید احمد کے خاندان سے کس حد تک واقف ہو، وہ کس پایہ کا خاندان ہے؟ اس سوال کا جواب اچھا نہیں تھا، اس نے سید احمد اور اس کے خاندان کی مذمت تو نہیں کی بلکہ ان الفاظ میں تعریف ہی کی کہ ”وہ میرے استاد زادے ہیں اور ان کو خاندانی فضیلت بھی حاصل ہے“ لیکن یہ الفاظ سید احمد کی توقع سے بہت گریے ہوئے تھے، وہ اس سے زیادہ

---

۱۔ منتخب اللہ باب جلد سوم ص ۴۰۶۔ حدیثۃ العالم جلد اول ص ۳۶۱۔ بعض مورخ اسی جواب کو بہت کھینچ تان کر پیش کرتے ہیں کہ سید سلطان نے اپنے خاندان کی بڑھئی اور سید احمد کے خاندان کی حقارت کی۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس منزل پر جبکہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور اس تقریب کا سراجام سب کچھ سید احمد کے ہاتھ میں تھا، سید سلطان اپنے مرنے کی نسبت ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

تعریف چاہتا تھا، اس کو یہ خیال ہوا کہ سید سلطان اپنے کو بڑھانے کے لیے مجھے بادشاہ کی نظروں میں گرانا چاہتا ہے۔ اس واقعے سے وہ سید سلطان کا دشمن ہو گیا۔

جوں جوں شادی کی تیاری ہو رہی تھی، سید احمد کی مخالفت کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ یہ اور اس کی بیوی اس نسبت کو توڑنا چاہتے تھے اور ہر خطرے کے لیے تیار تھے۔ شادی کی تیاریاں ہو گئیں اور بالآخر عقد کا دن آگیا، اس کے ایک روز پہلے سید احمد نے بادشاہ کو اطلاع کر دی کہ ہم اس شادی کے مخالف ہیں۔ اگر یہ شادی اٹل ہے تو میں گو لکھنؤ میں نہیں رہوں گا، بلکہ یہاں سے کوچ کر کے عالمگیر بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لوں گا۔ چنانچہ اس کوچ کا بندوبست بھی شروع ہو گیا، صورت حال بہت نازک ہو گئی، عبداللہ قطب شاہ نے سید احمد کو بہتر سمجھایا، اور اس کو راضی کرنے کے لیے متعدد آدمی بھیجے، لیکن یہ سب بے فائدہ ہوا۔ سید احمد کی یہ دیکھ کر وہ عالمگیر بادشاہ کے پاس بھاگنا چاہتا تھا، عبداللہ قطب شاہ کو ڈرانے کے لیے خود کافی تھا۔ اول تو بادشاہ کو اپنی بڑی بیٹی اور داماد کا زیادہ پاس تھا، دوسرے اس میں مغلوں کا آئندہ خطرہ تھا، کیونکہ مغل تو گو لکھنؤ سے پر اپنی آنکھ لگائے بیٹھے تھے، چونکہ اس وقت سلطنت کی عنان حکومت سید احمد کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس شخص کا مغلوں کے پاس بھاگ جانا سلطنت کے لیے بہت خطرناک ہوتا۔ بادشاہ سخت کشمکش میں پڑ گیا، لایق درباریوں نے سمجھایا کہ اب سید سلطان سے شادی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، چونکہ شادی کی پوری تیاری بھی ہو چکی ہے اس لیے بجائے سید سلطان کے ابوالحسن سے شادی کر دی جائے تو مناسب ہے، اور اس مشکل کا واحد حل یہی تھا۔ بادشاہ نے

---

۱۔ بعض مورخ اس بیان میں بہت مبالغہ کرتے ہیں کہ سید احمد اور اس کی بیوی کے اغواء سے خود دہلی اور اس کی ماں خود کشی کرنے کے لیے تیار ہو گئیں کہ جو نئی عقد کی توہین سمجھو گی خنجر سے اپنے آپ کو بھونک لیں گی (گلزار آصفیہ ص ۱۴۷)۔

۲۔ دوسری طرف حضرت شامہ راجو کی خاتقاہ کا عجیب منظر تھا، یہاں قدم قدم پر شادی کی تیاریوں کی خبر ملتی تھی، ابوالحسن تو ملے ہو جاتا، لیکن حضرت راجو اس کو یقین دلاتے تھے کہ شادی تم سے ہی ہوگی شادی کے

ناچار اس سے اتفاق کر لیا۔ چنانچہ مین اس روز جبکہ سید سلطان کی شادی ہونے والی تھی ابو الحسن فوراً گو لکنڈہ طلب کیا گیا، اور ان تمام تیاریوں کے ساتھ جو، اب تک عمل میں آئی تھیں ابو الحسن کی شادی ہو گئی اور سید سلطان عالم وحشت میں گو لکنڈے سے فرار ہو گیا۔

ابو الحسن کی تخت نشینی جس طرح ابو الحسن کی شادی ایک حیرت انگیز طریقے سے ہوئی تھی تقریباً اسی طرح اس کی تخت نشینی بھی ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ سید احمد کے ہوتے ہوئے جو عبداللہ قطب شاہ کا بڑا داماد تھا اور جو بادشاہ وقت کے ساتھ امور سلطنت میں دخل رکھتا تھا، ابو الحسن کو تخت ملنے کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ یوں تو اس معاہدے کی رو سے جو ۱۰۶۶ھ میں ہوا تھا، اورنگ زیب کا بیٹا محمد سلطان وارث تخت تھا، لیکن یہ بھی اتفاق ہے کہ محمد سلطان اپنے باغیانہ رویہ کی وجہ سے شہنشاہ کی نظروں سے گر چکا اور نظر بند تھا۔ شہنشاہ نے کبھی اس پر زور نہیں دیا کہ عبداللہ کے بعد محمد سلطان گو لکنڈے کا بادشاہ ہو۔ ان حالات میں گو لکنڈے کی جانی کا مسئلہ زیر بحث ہو گیا اس وقت عبداللہ قطب شاہ کے دو داماد تھے، ایک تو سید احمد دوسرے ابو الحسن ان میں سے ایک کو تخت ملنا چاہیے تھا۔ سید احمد بڑا داماد تھا، اور اس کے علاوہ وہ امور سلطنت میں بادشاہ کا شریک تھا، اور خود عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں حکومت کی باگ تمام تر سید احمد کے ہاتھ میں تھی۔ جب تک بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم زندہ رہی ہے وہی حکومت کو مشورہ دیا کرتی تھی اور جب ۱۰۸۰ھ میں اس کا انتقال ہوا تو عنان حکومت سید احمد کے ہاتھ آگئی۔ نیز اس کی بیوی جو ماں صاحب یا بڑی صاحبی کے نام سے مشہور ہے

ایک روز پہلے ابو الحسن کو معلوم ہوا کہ گو لکنڈے میں رسم ساچق ہونے والی ہے تو اس نے اپنے مرشد کو اس کی اطلاع کر دی اور مرشد نے اپنی خانقاہ میں بھی اس ساچق کا اخطام کر دیا، یعنی مٹی کے گونے صبح کر کے چند ضروری لوازم کے ساتھ ساچق کی شکل پیدا کر دی دگلزار آصفیہ ص ۱۷۶ اور یہ اس بات کا یقین تھا کہ گو لکنڈے میں جو شادی ہو رہی ہے وہ محمد اکبر کا ہے اور محمد اکبر کا یہ اتفاق ہے کہ یہ پیشین گوئی صرف یہ حرف صحیح ہوئی۔

محل میں ذی اثر تھی اور اپنے شوہر کی جانشینی کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس طریقے سے سید احمد کے بادشاہ ہونے کے بہت سے قرائن تھے۔ برخلاف اس کے ابو الحسن کو نہ تو تخت کا کوئی حق تھا نہ بظاہر اس کے کوئی اسباب تھے۔

قیاس یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کا کوئی بعد و بست نہیں کیا اس کی وضاحت کسی تاریخ سے مشکل ہے۔ البتہ بادشاہ کی خاموشی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً سید احمد کی جانشینی کو پسند نہیں کرتا تھا اگر وہ اس کی جانشینی کو پسند کرتا تو نہ صرف اس کا کھلا اعلان کر دیتا بلکہ جہاں تک ہو سکتا اس کا قبل از وقت انتظام کر دیتا چونکہ یہ بند و بست نہیں ہوا تھا، اس لیے قرائن یہ ہیں کہ غالباً عبداللہ قطب شاہ ابو الحسن کی طرف مائل ہو گا، اور اس کے اسباب بھی ہیں کیونکہ ابو الحسن نہ صرف لائق اور پاکیزہ اخلاق آدمی تھا بلکہ قطب شاہی خاندان کا رکن بھی تھا اگر بیورنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو شادی ہونے کے بعد ابو الحسن کے اخلاق و عادات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت راجو کا مرید ہونے کی وجہ سے اس کے اخلاق و عادات کے خلاف کوئی بدگمانی نہیں کی جاسکتی۔ مقدس مرشد کا اس کے اخلاق پر ضرور اثر پڑا ہو گا، اس لیے اب اس سے کوئی بدگمانی اور مخالفت نہ تھی۔ اس طریقے سے اگر یہ قیاس کیا جائے کہ عبداللہ قطب شاہ دل سے ابو الحسن کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا تو بے محنی

---

۱۔ فراتر کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے سید مظفر کے کہنے سے ابو الحسن کو اپنا جانشین بنادیا تھا اسفناہ فراتر جلد اول ص ۸۲-۸۳) لیکن یہ بیان بہت کچھ بحث طلب ہے اول تو سید مظفر کا اس زمانے میں اتنا اثر نہ تھا کہ وہ بادشاہ کو سید احمد کے خلاف مشورہ دیتا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ سید احمد کے خلاف بادشاہ کو مشورہ دینا کیا معنی رکھتا ہے! خصوصاً سید سلطان کی شادی کے فسخ ہونے کے بعد تو اہل گولکنڈہ سید احمد کے خطرے سے ضرور واقف تھے۔ لیکن اس قدر صحیح ہے کہ اہل گولکنڈہ سید احمد کے مقابلے میں ابو الحسن کی طرف مائل تھے اور سید مظفر ابو الحسن کا ہمدرد تھا۔

نہ ہوگا چنانچہ "ماہ نامہ" کا بیان ہے کہ شادی کے بعد بادشاہ نے اس کو خزانوں کی کونجیاں سپرد کر دی تھیں جن میں قیاس یہ ہے کہ پچاس کروڑ، پانچ لاکھ ہوں تھے، اور امور سلطنت کی بھی تملقین کی تھیں۔ یہ الفاظ بڑی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز فرائض کے خیال سے اس کی واسطہ تائید ہوتی ہے۔ اس کے متعلق اعلان کرنا، اور اس کا اعظام کرنا عبداللہ کے لیے نامکن تھا۔

جائینی کے متعلق عبداللہ قطب شاہ کا یہ خیال ہو یا نہ ہو، حالات تمام تر ابو الحسن کے موافق تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سید احمد کے غرور و تکبر کے باعث گولکنڈے کے تمام اُمراء اور عمائد سلطنت اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ اول تو ابو الحسن فطرتاً سے مزاج واقع ہوا تھا، دوسرے اس گھمنڈ میں تھا کہ میں بادشاہ کا بڑا داماد ہوں، ایک روز سلطنت کا مالک ہو جاؤں گا یہ سب اسباب اس کی مخالفت اور ابو الحسن کی تائید میں جمع ہوئے لگے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی زندگی میں ہی ابو الحسن کی بادشاہی کا سامان ہو گیا، اور اس کا باعث یہ تھا کہ۔

"ابو الحسن چون شکنجہ روزگار کشیدہ پانزدہ شانزدہ سال در لباس فقیری  
بسر بردہ سخت و سست جہان را تماشا نمودہ بود و با اکثر اُمراء قطب الملک  
بزماں خوش و سلوک بڑا درانہ زیست می نمود و بیشترے از امرایہ او گرویدہ بودند"

حقیقت یہ ہے کہ ابو الحسن نے اچھے اخلاق و عادات کی وجہ سے اپنے ارد گرد بہتر فضا پیدا کر لی تھی اور تمام دوست دشمن اس کے ہوا خواہ ہو گئے چنانچہ سلطنت کے دوسرے عمائد سید مظفر اور موسیٰ خاں محلدار اس کے بڑے ہمدرد تھے ان کے ساتھ پیشکار اکتا و مادنا بھی شریک تھے ان لوگوں نے ابو الحسن کی پوری تائید کی یہی



ان کی رہنمائی کے بغیر ابوالحسن کی کامیابی ممکن نہ تھی چنانچہ جب عبداللہ قلب شاہ کی آخری گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں سلطنت کے  
 عائد مستقبل کی سوچ میں پریشان پھرنے لگے اور ہر طرف ایک ہیجان معلوم ہوتا تھا، اور یہ خیال ہوا کہ بادشاہ کے  
 مرنے سے پہلے جانشینی کا مسئلہ طے نہ کرنا چاہیے جو لوگ سید احمد کے ہمدرد تھے وہ اس کے لیے کوشش کرنے لگے برخلاف  
 اس کے سید مظفر اور موسیٰ خاں جیسے لوگ ابوالحسن کی تائید میں کھڑے ہو گئے لیکن مرنے والے بادشاہ سے کسی وصیت کی  
 توقع نہ تھی، اس پر ایسی غشی طاری ہوئی کہ اس کے بعد پھر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ جانشینی کا مسئلہ تنازع للبقا کے لیے  
 ملتوی رہا۔ ۲۱ اپریل ۱۰۸۳ھ کو عبداللہ قلب شاہ کا انتقال ہوا اس کے انتقال سے پہلے ہی خاندانگی کے آثار پیدا  
 ہو گئے تھے، کیونکہ اس وقت جانشینی کے مسئلے کو حل کرنے والے دو فریق تھے جو ایک دوسرے کے حریف تھے اور ہر فریق اپنے  
 امیدوار کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا۔ سید احمد کو یہ فائدہ تھا کہ اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل تھا، اور حکومت کے تمام  
 آلات اس کے ہاتھ میں تھے، اس کی بیوی بڑی صاحبزادی محل کے اندر اپنا پورا اثر رکھتی تھی اور ہر قسم کے مقابلے کے لیے  
 تیار تھی! ابھی بادشاہ غشی کے عالم میں تھا کہ اس کی موت کا وادیا چنے لگا۔ ابوالحسن اپنے کو بے دست و پا سمجھتا تھا  
 اس خیال سے کہ خاموش بیٹھنا اچھا نہیں ہے، گھوڑے پر سوار ہو کر محل تک پہنچ گیا تاکہ صورت حال پر قابو حاصل ہو جائے۔  
 ابوالحسن کے اہلکار آجائے محل میں ایک سنسنی سی ہو گئی۔ سید احمد کے ہوا خواہوں کو ڈر ہوا کہ عین وقت پر یہ اپنے  
 ہوا خواہوں کی مدد سے مرکزی حکومت پر قبضہ حاصل کر لیا۔ یہ کہا گیا کہ ابوالحسن آمادہ فساد ہے اور اس لیے اس کی  
 پوری مزاحمت کی تاک وہ اندر نہ آنے پائے! اس میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہو گئی۔ سید احمد کے ہوا خواہوں نے  
 ڈنڈوں کے ذریعے ابوالحسن کا مقابلہ کیا چونکہ ابوالحسن نہتا تھا، اس لیے اس کو پسپا ہونا پڑا۔ یہ خود تو بچ گیا، لیکن  
 عبداللہ نامی ایک شخص کے وار سے اس کے گھوڑے کا پیٹھا مروج ہو گیا جب ابوالحسن مجبور ہو کر شاہی محل سے پلٹا تو سید  
 سید مظفر کے گھر گیا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کے ہمدرد سید مظفر اور موسیٰ خاں تھے، اور روتے ہوئے اس کے سامنے  
 زمین پر بیٹھ گیا۔ سید مظفر نے کہا کہ اس گریہ و زاری کی کیا ضرورت ہے، ہمت سے کام لینا چاہیے کہ اگر کامیاب ہو جائیں تو  
 لے۔ غامی ہاں دیکھا ہے کہ وہ بے ہوش ہو کر پڑ گیا، لیکن یہ غالباً سبالتو ہے۔ اتنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اسی واقعہ کے

تخت ملیگا، ورنہ تختہ<sup>۱</sup> ان الفاظ میں دیکھو اور نصیحت و نواہیں شامل تھیں تاکہ ابو الحسن ہمت نہ ہارے اور اسی سے سید مظفر کی سیاسی قابلیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان حالات سے پریشان نہیں ہوا بلکہ ٹھنڈے دل سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا۔ غالباً وہ اس راز سے واقف تھا کہ فریق مخالف میں کس قدر دم خم ہے۔

خانہ جنگی کا تمام سامان جمع ہو گیا۔ سید احمد محل کے باہر اپنے تمام ہواخواہوں اور آلات حکومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا، اور محل کے اندر اس کی بیوی زنارہ فوج کے ساتھ مسلح کھڑی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ماں صاحبہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور اس کے ساتھ کنیزان حبشی اور ترک کی مسلح کھڑی تھیں۔ مادھر سید مظفر اور اس کے شرکاؤ کا رابو الحسن کی تائید کے لیے تیاری کر رہے تھے چونکہ جانشینی کا فیصلہ فریقین کی تلوار پر منحصر تھا، اس لیے ایک خانہ جنگی یقینی تھی! اس سے پہلے ابو الحسن سے ایک جھڑپ تو ہو چکی تھی، اگر حالات پر ہوشیاری سے قابو حاصل نہیں کیا جاتا تو سخت لڑائی ہو جاتی جو گولکنڈے کے لیے مہلک ہوتی۔ لیکن اس معاملے میں دو چیزوں نے کام کیا، ایک تو سید احمد کی غیر ہر دلعزیزی تھی، صرف محدودے چند آدمی اس کے غیر خواہ رہ گئے تھے، اکثر ایسے تھے جو بہ ظاہر اس کے ہمدرد معلوم ہوتے تھے لیکن دل سے اس کے مخالف تھے۔ سید احمد کا اقتدار ایسے لوگوں پر ہی تھا، چنانچہ جب کام کا وقت آیا تو یہ سب چپکے سے ابو الحسن کی تائید پر کھڑے ہو گئے اور سید مظفر کی غیر معمولی سیاسی قابلیت بہت جلد تمام حالات پر قابو پا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید مظفر نے نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ تمام سیاسی جھگڑے

---

اس پسیدہ جو اسی ضرورت طاری ہوئی ہوگی اور اسی عالم میں وہ سید مظفر کے گھرایا تھا۔

۱۔ منتخب اللہ باب جلد سوم ص ۳۰۸۔

۲۔ موسیٰ خاں حوالدار کو بعض مؤرخ سید احمد کا موید بتاتے ہیں (حقیقۃ العالم جلد اول ص ۳۶) اور دوسرے اس کو سید مظفر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگر اس کا سید احمد کے ساتھ شریک ہونا صحیح بھی ہے تو وہ بہ ظاہر ہوگا، مگر دل سے ابو الحسن کے ساتھ شریک تھا۔

پہلے سے سوچ لیے تھے اور وقت کا منتظر تھا۔ اگر اس موقع پر سید مظفر نہ ہوتا تو ابو الحسن کو کبھی تخت نہیں ملتا۔ چنانچہ اس نے ابو الحسن کو ہمراہ لے کر پہلے ان مقامات کی گرفت کی جہاں لگرائی کی ضرورت تھی، چونکہ فوج اس کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس نے آسانی کے ساتھ شاہی محلات کا محاصرہ کر لیا جہاں "ماں صاحب" تھی اور بادشاہ سسکیاں لے رہے تھے، اسی جگہ سید احمد بھی تھا۔ اس محاصرے سے سید احمد اور اس کی بیوی جن سے مقابلہ تھا، بے دست و پا ہو گئے اور کوئی حرکت نہ کر سکے۔ پھر سید مظفر نے بعض اہل دربار کو جو بادشاہ کے مقرب تھے اشارہ کیا کہ وہ سید احمد سے کنارہ کش ہو جائیں اور ابو الحسن کی تائید کریں۔ اس طریقے سے سید احمد اور ماں صاحب کے حوصلے اور تیاریاں ہاک میں مل گئیں، اور جو تھی عبداللہ قطب شاہ کی روح پر واز ہوئی ابو الحسن قطب شاہ کا بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔

سید احمد قید میں رکھا گیا، اسی قید میں وہ ایک سال کے بعد مر گیا۔ غالباً اس کی بیوی بھی قید میں ہی مری۔ سید احمد کے ساتھ اس کے بعض متعلقین بھی گرفتار ہوئے تھے۔ سید سلطان تو بہت پہلے فرار ہو گیا، اور شہنشاہ اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس کو وہاں خطابات و مناصب بھی عطا ہوئے، لیکن اس کا ایک بیٹا سید معصوم علی اس وقت تک گولکنڈے میں تھا ابو الحسن قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد موقع پا کر یہ شخص بھی گولکنڈے سے بھاگ گیا، اور مغل سلطنت کا ملازم ہو گیا۔ ان لوگوں کا بھاگنا، اور مغل سلطنت میں شریک ہونا، آئندہ گولکنڈے کی سلطنت کے لیے بہت مضر ہوا۔

# اٹھارواں باب

## مادنا کی وزارت

ابو الحسن قطب شاہ دکن میں "تانا شاہ" کے ہر دلعزیز لقب سے مشہور ہے جس طرح اس کی شادی اور تخت نشینی تلاطم خیز تھی، اسی طرح اس کا پندرہ سالہ عہد حکومت بھی بڑا پُر آشوب ثابت ہوا یہ ایسے وقت میں تخت نشین ہوا تھا جبکہ دکن میں چاروں طرف گرم آندھیاں اُٹھ رہی تھیں۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے دکن کی تمام سرزمین دہلتی تھی۔ سیاست و معاشرت کے تمام تار و پود اس طرح بکھر رہے تھے کہ ان کو یکجا کرنا مشکل تھا۔ مغلوں کا سیلاب شمال سے اس زور سے اُمنڈ آیا کہ اس کے سامنے دکن کی کوئی طاقت ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ تانا شاہ ان حالات کا اچھا مقابلہ تھا۔ اس میں حکمرانی کی قابلیت تھی اور جہان بینی کے حوصلے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت شاہی محلوں سے دور ایسے ویرانوں میں ہوئی تھی جہاں علمی و سیاسی تربیت کے اچھے مواقع تھے اپنی خانگی اور صوفیانہ زندگی میں اس نے "گلشن روزگار کشیدہ"..... سخت و سست جہاں راتماشا نمودہ بود۔ اس کی بیدار مغزی میں کلام نہیں۔ سیاست میں اس نے ایک وسیع نظریاتی تھی۔ یہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ مستعد و جفاکش تھا۔ دکن کی تمام سیاست سے واقف تھا جو ہر روز اُنکے رہی تھی یہ دیکھ کر چنبا ہوتا ہے کہ گو اس کی نشوونما شاہی محلوں میں نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے ایسے شاہانہ طور و طرز اختیار کیے تھے کہ گویا بادشاہی اس کا

---

۱۔ قطب شاہوں کی تاریخ میں سلطان قلی قطب شاہ کے بعد ابو الحسن قطب شاہ کا درجہ ہے جس نے غربت سے شاہی حاصل کی تھی اور زندگی کے مختلف مدارج دیکھے تھے۔

حقیقی ورثہ تھا اس کے بلند کردار اور غیر متزلزل خود داری و استقلال جو ہر موقع پر ظاہر ہوئے ایسے اوصاف تھے کہ ان کی مثال نہیں۔ اور یہ ایک کامیاب جہانبانی کے ضروری لوازم ہیں اگر شمال سے مغلوں کا زور دار ریلانہ نہیں آتا جو شہنشاہ اورنگ زیب کے جلو میں آیا، اور دکنی طاقتوں کو بہلے گیا، تو قرآن یہ ہیں کہ ابوالحسن دکن کا چہار ہنما ہوتا۔

۵ محرم ۱۰۸۳ھ کو ابوالحسن کی بادشاہی کا اعلان ہوا، لیکن غالباً مشرور محرم کا محاذ کر کے تخت نشینی کی اصل رسم آٹھ روز کے بعد یعنی ۱۳ محرم کو منائی گئی اس روز شاہی دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ پرانے دستور کے مطابق امراء و عمائد سلطنت نے نذرانے دیے اور بادشاہ کی طرف سے انھیں خلعتیں ملیں جن لوگوں نے ابوالحسن کی تخت نشینی میں مدد کی تھی وہ سب سے زیادہ شاہی عنایات کے مستحق تھے، بادشاہ نے ان کا احسان مانا، اور ان کی محنت کا صلہ دیا۔ چنانچہ اس دوہ کے روح رواں سید مظفر کو جو عبداللہ کے آخری زمانے میں سرخیل کی خدمت پر مامور تھا، امیر الامراء کا خطاب اور میر جگسا اہمد عطا کیا گیا۔ موسیٰ خاں حوالدار کو خانخانان کے خطاب کے ساتھ سرخیل کے عہدے پر فائز کیا گیا، یہ اب تک محلدار تھا۔ اکتا اور مادنا جو دونوں بھائی تھے اور سید مظفر کے ساتھ تخت نشینی کے معرکے میں شریک تھے ترقی دی گئی۔ مادنا کو سید مظفر کا پیشکار بنایا گیا، اور اکتا اپنے بھائی کا معتمد مقرر ہوا۔ رضاعی نیک نام خاں جو کرناٹک کا طرفدار تھا، اپنی خدمت پر بحال رہا۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا گیا، اور ادھر شمال میں مغل سلطنت سے سیاسی تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب کی خدمت میں نذرانہ ارسال کر کے اطاعت کا وعدہ کیا گیا۔ شہنشاہ نے میر عبدالرحمن اور خواجہ عثمان کے ذریعہ ایک فرمان بھیجا جس میں ابوالحسن کی بادشاہی تو تسلیم کر لی، لیکن یہ ہدایت کی کہ مقررہ پیش کش برابر ادا کیا کرے، اور سیوہی کی مدد نہ کرے۔ اور اس کے بعد ۱۰۸۶ھ میں ابوالحسن نے قوام الدین حاجب کے ہمراہ شہنشاہ کی خدمت میں

سہ۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا فرمان، ابوالحسن کے نام :-

”در حضور خانہ زاد..... عبدالرحمن کہ حامل این فرمان است.... و خواجہ عثمان....

دست بر قرآن گذاشتہ باشد قسم واللہ و باللہ یاد کند کہ اصلاً و مطلقاً در هیچ امر سے

نولاکھ روپیے جواہر اور ہاتھی بہ طور پیشکش بھیجے تھے۔ اگر ان جدید عہدہ داروں کی جن کو ابوالحسن نے ترقی دی تھی بے وفائی

از امور بہ ظاہر و باطن از طریق اطاعت و انقیاد و خلوص و اعتقاد تخلف و انحراف نہ ورزد۔  
 و در استیصال سیوائے مقہور ..... بہ اولیائے دولت قاہرہ متفق بودہ از امداد و اعانتہ و  
 اجتناب واجب شناختہ ..... و مبلغ چہل ہک روپیہ پیشکش حال را با وجہ پیشکش  
 مقررے و بقایائے سال بہ سال ..... بہ خزانہ عامرہ صوبہ دولت آباد .....  
 ارسال پیشکش ہائے بالستہ کند۔ (تاریخ ظفرہ ص ۳۷)۔

ابوالحسن کا انقیاد نامہ :-

گلکنڈہ و مضافاتش کہ بہ عبد اللہ قطب الملک مرحوم متعلق بود پس از وفات آن مغفور و مبرور  
 بہ این مرید و درست اخلاص بشرط اقامت بر جادہ اطاعت و انقیاد ... بخلاف مودہ فرمان ....  
 مزین بہ دستخط قدسی ... شرف صدر یافتہ این ارادتمند ظہور نمود کہ در هیچ حالت سرشتہ اخلاص  
 اطاعت نسبت بہ بندگان کہ از استغواب ..... خان جہاں بہادر کو کلتاش  
 قرار یافتہ سال بہ سال ..... گذرانیدہ باشد ..... سیوائے مقہور  
 شقاوت پیشہ را ..... بہ دل و جہاں دشمن دانستہ .....  
 از امداد و اعانتہ او ..... اجتناب لازم ..... و جنور  
 میر عبد الرحمن ..... و خواجہ عثمان ..... دست  
 بر قرآن مجید گذاشتہ قسم و اثبات شد باز نمود ..... کہ تا دم واپسین ... ہرگز پرہیز  
 خلاف و اختلاف نہ گرد و تحریر ۱۸ صفر ۱۰۸۶ ھ "تاریخ ظفرہ ص ۲۹۔

۱۔ تاثر علیگیر ص ۱۴۴۔

سدرہ ذہن ہوتی تو یہ نظام حکومت برسوں تک چلتا، اور غالباً مغل شہنشاہت کو اس سلطنت میں دخل دینے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ترقی پاتے ہی محمد سعید میر جملہ کی طرح سید مظفر نے بھی سلطنت سے بے وفائی کی

چونکہ سید مظفر جو اب میر جملہ کی خدمت پر فائز تھا، ابوالحسن کی تمام ترقی کا باعث تھا، اس لیے اس کی حیثیت بادشاہ گری سی تھی اور تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں ایسے بادشاہ اور بادشاہ گراں ایک جگہ جمع ہوئے حصول اقتدار کی کش مکش شروع ہو گئی۔ سید مظفر یہ سمجھنے لگا کہ شاہی اقتدار اس کا حق ہے، کیونکہ اس کی دستگیری کے بغیر ابوالحسن کو یہ درجہ نصیب نہ ہوتا۔ اس نے بہت جلد تمام سیاہ و سفید اپنے ہاتھ میں کر لیے اور بادشاہ کو بالکل کٹ پٹی بنانے کی کوشش کی اور جو لوگ ابوالحسن کے ہمدرد تھے ان کا بری طرح پیچھا کیا چنانچہ موسیٰ خاں سے جو بادشاہ کا ہمدرد تھا، اس کی ان بن ہو گئی۔ جس طرح اس نے مرکزی حکومت میں بے وفائی کی اسی طرح سلطنت کے دور دراز صوبوں میں بھی خود غرضی سے کام لیا، اور قطب شاہی مفاد کو نقصان پہنچایا چنانچہ نیک نام خاں کے انتقال تک جو ۱۲ جون ۱۰۸۳ء کو ہوا، کرناٹک کے حالات بہ دستور تھے، کیونکہ مغربی تاجر اس سے بہت ڈرتے تھے، لیکن اس کے بعد جب موسیٰ خاں یہاں کا طرفدار ہوا تو سید مظفر نے اس کو بہت ستایا، اور فرانسسیوں کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلنے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسسی سان تھوم اور پلے کٹ پرتاؤں ہو گئے اور مسلمان ملاحوں کی کشتیاں تباہ کر دیں جو گولکنڈے کے لیے بہت شرم کی بات تھی اور بادشاہ کو اس کی بالکل اطلاع نہیں دی گئی! اگر موسیٰ خاں اپنے طور پر ہمت نہیں کرتا تو یہ مغربی کمپنیاں بے قابو ہو جاتیں اور حکومت کو اپنا اقتدار قائم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا۔ ابوالحسن نے اس خطرے کو دور کرنے میں بڑی دوراندیشی سے کام لیا۔ اگر وہ اس معاملے میں جلدی کرتا تو محمد سعید کا سا پھر نیا شاخسانہ پیدا ہو جاتا، اور اس سے سلطنت کو ایک نیا دھکا لگتا پہلے تو ابوالحسن خاموشی کیساتھ حالات کا مطالعہ کرتا رہا، اور اپنی حالت کچھ اس طرح بنائی کہ گویا وہ بہت ہی تن آسان و عیاش آدمی ہے، اور امور سلطنت سے قطعی بے پروا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید مظفر بادشاہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا کہ گویا دربار سے اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوگی اس کو صرف موسیٰ خاں سے ڈر لگتا تھا، اسی وجہ سے اس کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی مرکزی حکومت سے دور کرنے کے لیے کہ وہ یہاں اپنا جال نہ پھیلائے پہلے اس کو کرناٹک کا طرفدار بنا دیا، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کرناٹک میں

موسنی خاں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے تو اس کو وہاں سے بھی برخاست کر دیا، اور جب یہ مرکز میں واپس آیا تو اس کو فہار اور خاں ٹھیرانے کے لیے اس کے حساب کی تنقیح شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ میر جملہ کی حیثیت میں سید مظفر کو یہ حق حاصل تھا کہ جمع و خرچ کا حساب دیکھے۔ موسنی خاں کے برہمن پیشکار سے تمام مواد حاصل کر کے تنقیح کی گئی اور پھر خیانت ثابت کی گئی اور اس علت میں وہ قید کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موسنی خاں کے مکان سے پانچ لاکھ ہون نقد اور جو اہرات برآمد ہوئے تھے۔ موسنی خاں کی گرفتاری سے سید مظفر کے حوصلے اور بڑھ گئے، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ موسنی خاں تنہا اس کے راستے میں حائل ہے اب اس نے بادشاہ کو بالکل بے دخل کر دیا، اور تمام امور سلطنت خود فیصلہ کرنے لگا۔ بادشاہ کے لیے صرف یہ چارہ کار تھا کہ اپنے چند ہمدردوں کو جمع کر کے نہایت خاموشی کے ساتھ سید مظفر کو گرفتار کرائے۔ جب بادشاہ نے اپنے ہمدردوں کو ٹٹولا تو کئی فوجی افسر اور سید مظفر کے پیشکار اکتا و مادتا، اس سازش کے لیے تیار ہو گئے۔ مادتا نے سید مظفر کو بے دست و پا کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے ذی اقتدار فوجی ہمدردوں کو دروازہ صوبوں میں بھیج دیا تاکہ اس کا کوئی بس نہل سکے چنانچہ جب اس کی تیاری ہو گئی تو پھر ان لوگوں نے بادشاہ کو اشارہ کیا کہ وہ اب سید مظفر کے خلاف کارروائی کرے۔ اکتا، و، مادتا کی اس سازش سے تمام مطلع صاف ہو گیا۔ سید مظفر کو اس سازش کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ چنانچہ دربار عام منعقد ہوا، اور اس کھلے دربار میں بادشاہ نے پورے اطمینان قلب کے ساتھ سید مظفر کی حرص و آز اور فہاری بیان کی اور کہا کہ اس جرم کی سوائے موت کے کوئی دوسری سزا نہیں ہو سکتی لیکن اس کی دیرینہ خدمات کا لحاظ کر کے یہ رعایت کی گئی تھی کہ بخشی الممالک کی پرانی خدمت اور اس کی جاگیریں بحال رکھی گئیں۔ اس کے بعد اسی دربار میں

---

۱۔ اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ مادتا نے اپنی ترقی کی خاطر بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سید مظفر کا قاتلہ کرے۔ چونکہ یہ سید مظفر کا پیشکار تھا، اور اس کے راز سے واقف تھا، اور سید مظفر کے تمام کاروبار اس کے ہاتھ میں تھے، اس لیے سید مظفر کو بے دست و پا کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ دغاف خاں جلد سوم ص ۳۱۔ مآثر عالمگیری ص ۲۲۷۔

۲۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو سید مظفر نے بادشاہ کے اس فیصلے کے خلاف مزاحمت کی



مادنا کو میر جلد بنایا گیا عطاء مہمدہ کے ساتھ اس کو خلعت اور سوریا پرکاش راؤ خطاب ملے اس کا بھائی اکتا، اس کا پیشکار ہوا۔ موہنی بیگم ماں نامی ایک اور شخص کو فوج کا سرخیل بنایا گیا لیکن آئندہ کی احتیاط کر کے بادشاہ نے فوج کی تنخواہوں کی تقسیم راست اپنے ہاتھ میں رکھی تھی اس دربار کا انعقاد اور اس کی تمام کارروائی اس قدر اچانک طریقے سے ہوئی کہ سید مظفر اور اس کے حاشیے کے لوگ شدید ہو کر رہ گئے ان کو سان گھمان نہ تھا کہ اس قدر جلد کا یا پلٹ ہو جائیگی۔ اور جب بادشاہ اپنے احکام کا اعلان کر رہا تھا تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ماتھے پر ہل تک نہیں پڑے بلکہ ہر موقع پر اس کا چہرہ شگفتہ رہا جس سے اس کے بلند پایہ کردار کا پتا چلتا ہے۔

مادنا، اور اس کا خاندان ٹھیک تلنگانے کا رہنے والا تھا، اور ہنمکنڈے میں ان کا گھر تھا۔ مادنا کے باپ، دادا سب قلب شاہی سلطنت کے پرانے متوسل اور خدمت گزار تھے۔ مادنا، اور اس کے دوسرے بھائیوں کی تعلیم و تربیت اس زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوئی تھی، یہ فارسی اور ہندی جانتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ قلب شاہوں کی دو سو سالہ تاریخ میں آج سب سے پہلے تلنگانے کا ایک باشندہ وزارت پر مامور ہوا جہاں اب تک ترک و ایرانی فائز ہوتے تھے ان لوگوں کو غالباً اس ملک کی زیادہ واقفیت نہ ہوتی تھی مادنا کی خواہ کتنی ہی مذمت کی جائے لیکن اتنا تو

---

اس لیے وہ قید کر دیا گیا، لیکن مغل حاکم نے قید سے رہا کر کے اس کو اور اس کے بیٹے سید ہاشم کو شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا (تاریخ عالمگیری ص ۲۲)۔

۱۔ اس دربار کے ضروری معلومات مدراس کے انگریزی وثائق سے ماخوذ ہیں اور بھوپال راؤ صاحب ام لے کے توسط سے مجھے ملے، موصوف کا بہت ممنون ہوں۔

۲۔ مادنا کے باپ کا نام بھانوجہ پنتلو، اور ماں کا نام بھاگیا بتایا جاتا ہے۔ یہ ہنمکنڈے کے رہنے والے تھے بھانوجہ پنتلو ہنمکنڈے کے عامل کے تحت مال کی خدمت پر فائز تھا، اس کے چار بیٹے تھے جن میں ان کے بڑا، اکتا، اور اس کا بھائی مادنا بہت مشہور ہوئے۔

۳۔ بھانوجہ نے اپنے بیٹوں کو اس زمانے کی ضرورت کے مطابق تلنگی اور فارسی کی تعلیم دی تھی، چنانچہ یہ لوگ شاہی قرائین

صحیح ہے کہ یہ قطب شاہی سلطنت سے جہاں اس کی کئی پشتیں گزری تھیں اپنے پیٹروؤں سے زیادہ واقف تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس عہدے پر چاکر فائز نہیں ہوا تھا بلکہ درجہ بہ درجہ ترقی کر کے تجربے سکھے تھے۔ بادشاہ کو اس پر پورا اعتماد تھا، اور یہ اعتماد آخر وقت تک رہا ملک کے تمام لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے لیکن ابوالحسن اس سے کبھی بدگمان نہیں ہوا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ابوالحسن اور شیخ شہنشاہ کی ان بن ہوئی تو اس نے اپنی آقا کی اڑے وقت پر مدد کی۔ اور جب تک یہ وزیر رہا ملک و مالک کے ساتھ وفاداری کی اور بادشاہ کو اس طرح بے دخل کرنے کی کوشش نہیں کی جس طرح سید مظفر نے کی تھی نیز اس کا سیاسی مسلک خارجی اور داخلی امور میں وہی تھا جو بادشاہ چاہتا تھا اور گزشتہ سلاطین کے ہمیشہ پیش نظر تھا۔ سلطنت کا دائمی مقصد یہ تھا کہ ملک کی خوش حالی و ترقی اور بیرونی تلاء آوروں کا ایسا سد باب ہو جس سے نہ صرف قطب شاہی سلطنت بلکہ تمام دکن کی حفاظت ہو سکے۔ صوبہ کرناٹک کا بندوبست ایسا قابل اطمینان تھا جیسا نیک نام خاں کے دور میں تھا۔ مغربی تاجروں پر ایسی گرفت تھی کہ وہ آخری دور تک سلطنت کے آئین کی پوری پابندی کرنے کے لیے مجبور تھے۔

---

پڑھ سکتے تھے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ابوالحسن کے عہد میں شہنشاہی فرمان آیا جو سفید روشنائی میں لکھا ہوا تھا، صرف مادنا اس کو پڑھ سکا، اور اسی روشنائی میں اس کا جواب لکھ دیا۔

۱۰۹۶ء میں مادنا نے محکمہ مال کی خدمت انجام دی اور ۱۰۹۶ء میں سید مظفر میر جیل کا معتہد مقرر ہوا تھا، اور اس کی تمام ترقی اس کی وجہ سے ہوئی تھی چنانچہ سب مورخ اس کو "سید مظفر کا آفریدہ" لکھتے ہیں، اور جب ۱۰۹۶ء میں سید مظفر میر جملہ ہو گیا تو یہ اس کا پیشکار مقرر ہوا، اور اس کے تمام کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھے۔ ۱۰۹۶ء میں مادنا میر جملہ یادو ان ہو گیا، اور غالباً یہ پیشوائی کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ مادنا، اور اس کے خاندان سے متعلق یہ ضروری معلومات تلنگی ماخذوں سے دستیاب ہوئے ہیں، اور مجھے بھوپال راؤ صاحب ام' اے کی مہربانی سے ملے۔

مادنا کے پسماندگان، منکنڈے میں اب تک موجود ہیں اور ان کے ہاں اسناد بھی ہیں۔

اس عہد میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ مرکزی حکومت کی کارکردگی بڑھانے کے ساتھ مرکزی اور مقامی حکومتوں میں خاطر خواہ ربط پیدا ہو تاکہ اس ذریعے سے جو کارکردگی مرکز میں ہو وہی مقامی حکومتوں کو حاصل ہو سکے یہاں پر پیشرو حکومتوں میں پہلی جنس زمانے سے مادانے وزارت کا جائزہ لیا تھا بادشاہ اور اس کے وزیر نے کئی مرتبہ تمام سلطنت کا، اور خاص طور پر کرناٹک کا دورہ کیا، کیونکہ یہ مفتوحہ صوبہ تھا، اور یہاں مغربی تاجروں کی وجہ سے آئے دن بد انتظامی ہوتی تھی چنانچہ پہلا دورہ ۱۰۸۹ھ نومبر میں شروع ہوا، اور ۱۰۸۹ھ جنوری میں ختم ہوا۔ اس کے بعد دوسرا دورہ ۱۰۸۹ھ میں اور تیسرا ۱۰۸۹ھ میں ہوا۔ ان دوروں میں سلطنت کے تمام طول و عرض کا بہ ذات خود معائنہ کیا گیا۔ مغربی تاجروں کی کمپنیاں جو مسولی ٹیم۔ مدراس اور پٹی کٹ میں تھیں ان کی نگرانی کی گئی۔ کونڈ پٹی۔ کونڈ بیر وغیرہ کے اہم قلعوں کی مرمت کروائی گئی اور فوجوں کا انتظام کیا گیا۔ مغربی تاجروں اور کمپنیوں کے چشم دید معلومات حاصل کر کے ان کے متعلق مستقل ضابطے بنائے گئے، اور جب کبھی یہ تاجر آئیں شکنجہ کرتے تھے ان پر بہت سختی کی جاتی تھی اور اس معاملے میں مقامی عہدہ داروں کی پوری تائید کی گئی۔ زراعت کو فروغ دینے کے مختلف طریقے اختیار کیے گئے، تمام ملک میں جدید باؤلیاں۔ تالاب اور کھنڈ بنائے گئے۔ وصول مالگزاری کا قدیم زمانے سے جو بے ڈھنگا طریقہ یعنی اجارہ داری رائج تھی وہ مادانے مسدود کر دی کیونکہ اس طریقے سے کاشتکاروں پر زبردستیاں ہوتی تھیں اور

۱۔ مغل مورخ لکھتے ہیں کہ ابو الحسن اس قدر تن آسان تھا کہ کبھی محل کے باہر نہیں نکلا۔ محمد ساقی کا بیان ہے کہ از شہر حیدرآباد غیر از مسافت یک کروہ از محمد نگر در پانزدہ سالہ حکومت سفر گزیں نہ شدہ (آتش۔ عالمگیری ص ۳۰۱) لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔

۲۔ کونڈ پٹی کے قلعے میں ابو الحسن بہت دنوں تک رہا تھا یہاں سے اس نے تمام مشرقی تلنگانے اور کرناٹک کی نگہداشت کی تھی۔ یہ قلعہ جو بجاڑے سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے مشرقی گھاٹ کی ایک بلند چوٹی پر بنا ہوا ہے اس کا موقع محل مشرقی تلنگانے اور کرناٹک کی نگہداشت کے لیے بہت اچھا ہے۔ اس میں ابو الحسن کے بنائے ہوئے آثار موجود ہیں۔

درہات ویران ہو گئے تھے ان کو از سر نو بسایا گیا۔ اجارہ داروں کی جگہ مستقل تختہ و باب حکام مامور کیے گئے۔ چونکہ ملک میں اوقات یعنی اکر بار بہت تھے اور ان سے سرکاری مالگزاری میں خسارہ ہوتا تھا، اس لیے ان پر بھی محصول عائد کیا گیا جن اوقات کا انتظام اچھا نہیں تھا وہ شریک خالصہ کر لیے گئے۔ اس عہد سے پہلے کان کنی کی صنعت جس کی وجہ سے گولکنڈہ تمام ایشیا میں مشہور تھا، خراب ہو گئی تھی اس کو پھر زندہ کیا گیا، اور معدنوں میں کام کرنے والوں کی اجرت بڑھائی گئی۔ اس انتظام نے ملک کی خوش حالی میں بہت اضافہ ہوا۔

خارجی مسلک | اندرونی نظم و نسق کے یہ نسبت دکن کی خارجی سیاست زیادہ پیچیدہ اور جاذب توجہ تھی، کیونکہ اس ملک کو بالآخر ہندوستان کی بہت بڑی طاقت مغل شہنشاہت کا مقابلہ کرنا تھا جو اس زمانے میں بڑی شدت کے ساتھ اٹھاندا نہ تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں مرزا بے سنگھ کو بیجا پور کی دیواروں کے سامنے شہنشاہی فوجیں سیوا جی شمال سے بھاگ کر پھر اپنے کو ہستانی مسکنوں میں جاگزیں ہو گیا، اور لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا۔ خود بے سنگھ کی شکستیں مغل سلطنت کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھیں اور شہنشاہت اس کا انتقام لینا چاہتی تھی کہ مرہٹوں کا پھر خطرہ پیدا ہو گیا اس طریقے سے شہنشاہت کو دکن کی طرف دہری توجہ کرنی تھی۔ ادھر دکن کی نئی اور پرانی طاقتوں کو بھی اپنی مدافعت کا ضروری سامان کرنا پڑا کیونکہ یہ مغلوں کی پیشقدمی کا سبب کر کے اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتی تھیں بے سنگھ کے مرنے کے بعد شہنشاہ نے ۱۶۶۱ء میں شہزادہ معظّم کو دکن کا گورنر بنایا، اور سونت سنگھ کو فوج کی کمان دی اس جدید انتظام سے کوئی فوری خطرہ تو نہیں تھا، لیکن دکن کے لیے مشکل یہ تھی کہ ۱۶۸۳ء سے بیجا پور کی سیاست ایسی اُبھ گئی کہ اس کی وجہ سے تمام دکن کے معاملات سقیم ہو گئے۔ اس اچانک کمزوری سے مغلوں کو جو بیجا پور میں دخل دینے کا موقع ملا تو دوسری طاقتیں بھی آسانی سے اس کی زد میں آ گئیں اور بالآخر مغل سیلاب میں بہہ گئیں۔

۱۹۶۔ یہ معلومات مدراس کے مشرقی کتب خانے سے حاصل کیے گئے ہیں، یعنی کیفیت ص ۶۱ مجھے بھوپال راجا صاحب ام، اے کے توسط سے ملے۔



سلطان علی عادل شہزادہ ثانی

جب تک علی عادل شاہ ثانی زندہ تھا دکن پر کوئی آنچ نہ آئی۔ دکن کے اس آخری سورما نے ایک طرف مرہٹوں کو رکھا تو دوسری طرف مغلوں کا راستہ بند کیا لیکن جب ۱۰۸۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تو بیجا پور کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اب اس سلطنت کی زندگی محال ہو گئی۔ مرحوم کا بیٹا سکندر عادل شاہ جس کی عمر صرف پانچ سال کی تھی، تخت نشین کیا گیا۔ اس کی کمسنی کی وجہ سے بیجا پور میں طبقہ واری کش کش کا بازار گرم ہو گیا، اور غیر دکنی فریق اور ان کے رہنما آپس میں لڑنے لگے۔ دکنی فریق کے رہنما خواں خاں و میاں عبدالحمید تھے اور غیر دکنی فریق کا رہنما عبدالکریم بہلول خاں تھا۔ ان کی باہمی کش کش سے سلطنت کو ایسا نقصان پہنچا کہ اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ بہلول خاں پٹھانوں کا (جو باہر سے آکر بیجا پور میں آباد ہوئے تھے) سرگروہ تھا۔ یہ دن دھاڑے ٹوٹنے اور قتل و غارت کرنے لگا۔ حکومت اس کا سدباب نہیں کر سکتی تھی۔ میاں عبدالحمید جس نے علی عادل شاہ کے عہد میں بارہ سال ملک کی وفادارانہ خدمت کی تھی، بالآخر مایوس ہو کر حکومت سے کنارہ کش ہو گیا، اور چند روز کے بعد خواں خاں، بہلول خاں کے حربے کا شکار ہو گیا۔ اب پٹھان، بیجا پور کے ہر شریف اور امیر کو ذلیل کرنے لگے۔ باہر سے دلیہ خاں جوغل افواج کا سپہ سالار تھا، بہلول خاں کی تائید کرتا تھا، کیونکہ یہ بھی پٹھان تھا، اس لیے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے، اور بیجا پور کو سخت نقصان پہنچنے لگا۔ لیکن ۱۰۸۳ھ میں شہنشاہ نے شہزادہ معظم کو ہٹا کر بہادر خاں کو کلتاش کو دکن کا گورنر بنا دیا۔ اگرچہ بہادر خاں پٹھانوں کا ہمدرد نہ تھا، اور ایک طرح سے دکنی فریق کی تائید کرتا تھا، مگر اس کے تقرر کی غایت یہ تھی کہ بیجا پور پر پیش قدمی کرے چنانچہ بیجا پور پر حملہ کرنے کے لیے شہنشاہ کے بار بار احکام آتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ اس زمانے میں سیواچی سے بھی مقابلے ٹھیکے گئے جس نے بیجا پور سے بل کر ایک متحدہ محاذ چھانے کی کوشش کی، چنانچہ ۱۰۸۶ھ میں سیواچی نے بیجا پور سے اتحاد کر لیا جس کے بدلے عادل شاہی سلطنت نے اس کو ایک لاکھ ہون سالانہ اور تین لاکھ ہون یکمشت ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہادر خاں اور بیجا پور میں پُر زور جنگ شروع ہو گئی، لیکن بہادر خاں کو اکثر شکست ہوئی۔ اس وار و گیر میں قلب شاہی سلطنت خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی، اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حکومت کا

خارجی مسلک ایسا کمزور تھا کہ اس سے دکن کو بہت نقصان پہنچا لیکن ابو الحسن قطب شاہ اور مادنانے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی، ان دونوں نے خارجی معاملات میں وہی مسلک اختیار کیا جو پیشرو قطب شاہوں کا تھا چونکہ سکندر عادل شاہ کی کم سنی کے باعث بیجاپور کی حالت بہت سقیم ہو گئی تھی اور اس کی کمزوری سے گولکنڈے کو بھی خطرہ تھا، اس لیے اس سلطنت کو بیجانا ضروری سمجھا چنانچہ جب بہادر خاں کی بیجاپور پر یورش شروع ہوئی تو گولکنڈے سے فوجی مدد کی گئی۔ ۱۰۸۸ھ میں بہادر خاں کے مقابلے کے لیے مادنا خود ایک بڑی فوج لے کر آیا تھا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ پہلوی خاں کے بے ڈھنگے اصول کی وجہ سے قطب شاہی اور عادل شاہی فوجوں میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی اس سے بہادر خاں نے بہت فائدہ اٹھایا اور مادنا کو غلام ترغیب دے کر اس کو بیجاپور کے اتحاد سے علیحدہ کر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مادنا بیجاپور کو نہتہ چھوڑ کر گولکنڈہ واپس چلا آیا جس سے عادل شاہی حکومت کو سخت پریشانی ہوئی اور بہادر خاں نہایت آسانی کے ساتھ نل درک یا کل کوٹ اور گلبرگہ پر قابض ہو گیا۔ مادنا کا یہ طرز عمل قطب شاہی مسلک کے باطل منافی تھا۔

لیکن شہنشاہ بہادر خاں کی پچھلی ہزیمتوں سے ناراض تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ دلیر خاں نے جو بہادر خاں کا مخالف تھا، اپنے حریت کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰۹۹ھ میں بہادر خاں کو دکن کی گوری سے معزول کر دیا گیا، اور اس کی جگہ دودلی خاں مامور ہوا۔ اس نے اپنی فوجوں کو ایسا پھیلایا کہ یہ گلبرگہ سے ملکھیر تک پہنچ گئیں جو قطب شاہی سرحد تھی اور اس پیشقدمی سے اس کے حوصلے ایسے بڑھ گئے کہ اس نے گولکنڈے پر حملہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ شہنشاہ سے درخواست کی کہ اگر ایک بڑی فوج سپہری مدد کی جائے تو میں گولکنڈہ فتح کر لیتا ہوں! شہنشاہ نے یہ درخواست منظور کر لی، اس درخواست میں پہلوی خاں بھی شریک تھا اب قطب شاہی سلطنت کو مدافعت کا انتظام کرنا تھا۔ ابو الحسن قطب شاہ نے سرحد کو مضبوط کر کے محمد ابراہیم سرشکر کو ملکھیر روانہ کیا، اور ضروری بندوبست کر دی۔

۱۔ مادنانے پندرہ بیس ہزار کی ایک جرّار فوج تیار کی تھی اور اس کو اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔

۲۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مادنانے رشتوت لی تھی جادونا تھا سرکار جلد ۴ ص ۱۴۴۔



اس زمانے میں مغل فوجیں گلبرگے کا محاصرہ کر رہی تھیں قطب شاہی فوجوں کو پہلے شہنشاہ کا فرمان ملا کہ وہ کافروں کی مدد نہ کرے، اس کے بعد دلیر خاں نے ابوالحسن کو دھمکی دی کہ سیواجی سے اتحاد اور شیخ منہاج کو پناہ دینے کی پاداش میں ایک کروڑ روپیے اور دس ہزار گھوڑے تاوان ادا کرے ورنہ حملہ کیا جائیگا۔ اور اس کے ساتھ ملکیٹر کے قریب بہلول خاں و دلیر خاں کی فوجیں جمع ہو گئیں۔ ابوالحسن جنگ کو ٹالنے کے لیے پانچ لاکھ روپیے تاوان دینے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن بہلول خاں اور دلیر خاں جنگ پر تلے ہوئے تھے، انھوں نے ملکیٹر پر حملہ ہی کر دیا، ان کے مقابلے کے لیے قطب شاہی فوج بھی تیار تھی چنانچہ ایک گھمسان کا معرکہ ہو گیا جو مغلوں کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ اس معرکے میں مغلوں کے سات سو سپاہی اور سات ہاتھی ہلاک ہوئے اور چھ ساتھ افسر مارے گئے اور بے شمار سپاہی مجروح ہوئے۔ گولکنڈے سے شیخ منہاج رستم راؤ، اور بنجر خاں کے تحت ایک بڑی کمک آگئی، دو مہینے تک سخت کشمکش ہوتی رہی، اور ہر موقع پر مغلوں کا بہت نقصان ہوا ذرا ئے رسل و رسائل منقطع ہو گئے اور غلہ و پانی بھی نہیں ملا۔ اس مصیبت سے گلبرگہ واپس ہوئے کہ بنیں میل کی مسافت بارہ دن میں طے کی اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔

اس گری ہوئی حالت میں بھی بیجا پور کے ابھی بہت سے ہمدرد باقی تھے۔ سدی جو ہر صلابت خاں کا داماد مسعود خاں، اس سلطنت کا پیرانا خد متگذار تھا بہلول خاں کی زیادتی اور بیجا پور کی گری ہوئی حالت سے متاثر ہو کر مسعود خاں نے ابوالحسن قطب شاہ سے درخواست کی کہ وہ بیجا پور کے معاملات میں دخل دے کر اس سلطنت کی دست گیری کرے۔ ابوالحسن نے اس درخواست کو بھری آواز پر لبیک کہا۔ اب چارہ کار یہ تھا کہ بہلول خاں کو جو تمام فتنہ و فساد کا منبع تھا بیجا پور سے ہٹا کر مسعود خاں جیسے وفادار آدمی کو پیشوا بنائے، یعنی یہ طے ہو کہ ”ما دام کہ زمام این دولت خانہ در قبضہٴ قہر پروردہٴ قدیم و دولت خواہ دیرین مسعود خان است سپردہٴ نشود اصلاح این دولت خانہ صورت پذیر

۱۰۸۸ھ میں گولکنڈے نے سیواجی سے اتحاد کر لیا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ شیخ منہاج بیجا پور کا نوکر تھا، جو حکومت سے بے وفائی کر کے مغلوں سے مل گیا تھا، اور وہاں سے گولکنڈے کا ملازم ہو گیا۔



نہ خواہد گردید لیکن اس لیے ابوالحسن نے بہلول خاں کو اپنے پاس بلایا تاکہ اس کو نمک کا پاس دلا کر نصیحت کرے۔ لیکن بہلول خاں ملکیٹر کی لڑائی کے بعد ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ گولکنڈہ نہیں جاسکا، مگر اپنی طرف سے جمشید خاں کو بھیج دیا۔ ابوالحسن قطب شاہ نے اس کو بیجا پور کی حالت ناز کا نقشہ کھینچ کر شرم دلائی اور متنبہ کیا کہ اگر یہی حالت رہی تو کل کو مغل بیجا پور پر قابض ہو جائیں گے۔ ابوالحسن کی اس تقریر سے جمشید بہت متاثر ہوا، اور جب وہ بیجا پور واپس آیا تو

۱۔ بساتین السلاطین ص ۴۵۳۔

۲۔ ابوالحسن قطب شاہ نے بہلول خاں کے نمایندے جمشید خاں کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی جن سے اس کی بیدار ہوئی اور وسعت نظر معلوم ہوتی ہے:—

”فرمودہ کہ فدویان دولت خواہ و نمک پروردگان فدویت انتہاء را لازم است کہ  
نیکنامی دنیا و سرخ روی عقبی را در ادائے لوازم جان سپاری و تقدیم مراہم جانی شاری  
منحصر دانستہ ہنگی ہمت مصروف آن دارند کہ دولت خانہ ولی نعمت خود بار و نق و  
بنائے خویش بحال و قرار ماندہ تصعب و تشدد و برادری و نفاق و اختلاف خاگی کہ باہم  
داشتہ باشند یکسو و بر طرف ساختہ جہد کل ابجد و رآن مبدل دارند کہ فہم بدخواہان  
بیرونی دست تسلط بر آن نیافتہ خائب و خاسر مانند والا گر سود و بہبود خود را منظور  
داشتہ از عناد و نفاق خاگی در نگذردند و تصعب برادری و تباغض ہم چہی بر قرار  
داشتہ در ستیز و جدال یکدیگر کو شہد ظاہر است کہ اعدائے قصوم کہ در ہمیں فرصت  
نشستہ اند بہ یکبارگی از طرف ہجوم آوردہ متصرف ملک و سلطنت شوند۔ انکاء  
جز صرت و ندامت بدست یہج نخواہد ماند و زبان طعن و تشنیع خاص و عام بہر کدام  
از نمک خواہان دولت عادل شاہی تا ابد اللہ ہر دراز خواہد گردید خسلت صہ این

”چس ارشاد درہنمائی ابو الحسن قطب شاہ بہاول خاں پیشوا کی سے دست بردار ہو گیا، اور سدی مسعود پیشوا ہو گیا بہاول خاں اور مسعود خاں میں یہ شرطیں طے ہوئیں کہ افغانوں کی چڑھی ہوئی تنخواہیں ادا کی جائیں اور چونکہ اس کے لیے بیجاپور میں روپیہ نہ تھا، اسکی پابجائی کے لیے قطب شاہ نے چھ لاکھ روپے دیئے کا وعدہ کیا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ افغان سپاہی فوج سے برخاست کر دیے جائیں اور تنخواہ اسی شرط سے دی جائے کہ وہ بیجاپور سے باہر چلے جائیں۔ تیسرے بہلول خاں بیجاپور سے کنارہ کش ہو کر اپنی جاگیر میں حکومت اختیار کرے۔ چوتھے حکومت کی رہنمائی کے لیے گولانڈے کا ایک حاجب بیجاپور میں مقرر کیا جائیگا جو ہر انتظامی امور کی نگرانی کرے گا اور خارجی مسلک ایسا اختیار کیا جائیگا جو دونوں سلطنتوں کے مفاد کے عین مطابق ہوگا۔ پانچویں شرط یہ تھی کہ غلول سے ایسا عہد نامہ نہ کیا جائے جس سے اس عہد نامے کی خلاف ورزی ہوتی ہو اور گولانڈے سے بیجاپور کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے سر لی فریقین کے اس پر دستخط ہو گئے اور بادشاہ نے چھ لاکھ روپے کا تمسک لکھ دیا۔

تہبید و مقصود ازین تطویل آن است کہ از وقوع نزاع و خلاف شہاد دولت خواہان عادل شاہی تنزل در ارکان سلطنت واقع گشتہ بلکہ آن کاخ از بنیاد مشرف بر انہدام گردیدہ۔ انچنانکہ بیک صدر از باد در آید۔ اکنون موابل اصوب آن است کہ شہا فوج خود را رخصت دادہ خود معزول و از چہند سے در گوشہ کشیدہ و دست از قدرت و اختیار برداشتہ کار ملکی و دہالہامی بلکہ بیجاپور بہ سدی مسعود خاں و اگزار احمد و در تائید و بیعت او کوشیدہ بہ اتفاق ضبط و قیام سلطنت خانہ مخدوم حفظ بہ ظہور آزند۔ این معنی ہر آئینہ موجب استعسان و محبت عند الخلائق و سبب بہبودی و وقار شمار و دولت خواہان کا فہناس خواہد گردید۔ بساتین السلاطین۔

جب معاہدے کی تکمیل ہو چکی تو محمد براہیم سر لشکر چار ہزار سوار کے ساتھ سدھی سعود کو بیجا پور لایا اور پیشوا بنادیا اس کے بعد سعود اور سکندر نے اس عہد نامے کی توثیق کر دی اور حاجب کی خدمت انجام دینے کے لیے گوالکنڈے سے اکتا بھیجا گیا تھا یہ عہد نامہ اور قطب شاہی تائید بالکل مناسب حال تھی اور مفید ہوتی لیکن شکل یہ ہوئی کہ ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشتک نہیں ہوئی تھی کہ غلامان ورزی ہونے لگی جب سعود خاں بیجا پور آ رہا تھا راستے میں گلمبرگ کے پاس دایرخاں سے ایک اور معاہدہ کر لیا جو اس قطب شاہی معاہدے کے منافی تھا۔ بات یہ تھی کہ قطب شاہی اتحاد کا حال معلوم ہوا تو دلی خاں بہت پریشان ہو گیا کیونکہ اس طریقے سے مغلوں کا منصوبہ خطرے میں پڑ گیا تھا اس لیے نیا معاہدہ یہ ہوا کہ سعود نامہ اسلوجی کے خلاف مغلوں کی مدد کرے اور سکندر عادل شاہ کی بہن بادشاہ بیڈا کی شادی کسی مغل تہذوے سے کر دے اس عہد شکنی سے دکن کے معاملے کو بہت نقصان پہنچا، اس کی وجہ سے ابوالحسن نے چھ لاکھ روپیے نہیں دیے۔ افغانوں نے پھر شور مچایا اور بیجا پور میں شرفاء کی زندگی محال ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ گھر میں سعود خاں کا وزارتی افسر دارجم مکانہ باہر اور حالت روز بہ روز خراب ہونے لگی۔ ناچار ۱۱۶۱ھ میں اکتا واپس بلالیا گیا لیکن اس سے گوالکنڈے اور بیجا پور کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے بلکہ اس کے بعد بھی ابوالحسن نے بیجا پور کی مدد کی جینا پتہ جس وقت شہنشاہ نے بیجا پور پر حملہ کر دیا اور بہادر خاں کو کھٹاش کو اکل کوٹ پر متعین کیا کہ بیجا پور اور گوالکنڈے پر نگرانی رکھے تو سکندر نے ۱۱۶۸ھ میں گوالکنڈے سے مدد مانگی اور بیجا پور کے حاجب نے یہاں مادنا کو سمجھایا کہ اس وقت پرانے عہد نامے کی پابجائی بہت ضروری ہے تو ابوالحسن نے ۱۱۶۸ھ میں سکندر کی مدد کے لیے فوج بھیجنے کا ارادہ کر لیا، حالانکہ شہنشاہ نے یہ دھمکی دی تھی کہ بیجا پور کی کوئی مدد نہ ہونی چاہیے۔ ۱۱۶۸ھ اگست کو انہا جی راؤ کے تحت ایک فوج روانہ کر دی گئی لیکن مشکل یہ تھی کہ شہنشاہ نے اس کی روک تھام کے لیے پہلے سے بہرہ مند خاں کو گوالکنڈے کی سرحد پر متعین کر دیا تھا، اس لیے اس فوج کو منزل مقصود پر پہنچنا بہت دشوار ہو گیا اس کے بعد ابوالحسن قطب شاہ نے اپنے سفیروں کے نام جو شہنشاہ کے پاس تھے، ایک خط لکھا جس میں محمد براہیم سر لشکر کی سرکردگی میں چالیس ہزار کی ایک جرّار فوج بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا، یہ خط پکڑا گیا، اور شہنشاہ کے پاس پیش ہوا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہ عالم کے تحت

ملکبیز پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج بھیج دی گئی اور بیجا پور سے فارغ ہونے کے بعد تمام شہنشاہی طاقت گولکنڈے کی تباہی کے لیے آگئی۔

مادنا کی سیاست میں جو تمام ملک پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا اثر و کن کے دور دراز گوشوں میں محسوس ہوتا تھا بہت سے تاریک پہلو بھی تھے! اول تو مادنا نے اپنی ملک پرستی کے زعم میں حکومت کے بیرونی عنصر کو خارج کر دیا، اور اس کے خلاف ایک ہیجان برپا ہونا ضروری تھا۔ بات یہ ہے کہ جب سے قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی تھی ہزار ہا نو وارد ترک مغل و ایرانی ملک میں آباد ہوئے اور گولکنڈے کی سرکار سے فیض پاتے تھے۔ یوں تو یہ لوگ یہاں تجارت کی غرض سے آتے تھے کیونکہ گولکنڈہ تجارت کا مرکز تھا، تاہم ان میں اکثر اپنی قابلیت کے زور سے بلند خد مات پر بھی فائز ہوئے، لیکن اہل ملک ان کی ترقی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے! اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں مخالفانہ جذبہ ہر وقت موجود تھا، اور جب کبھی ملک میں انقلاب ہوا، ان نو واردوں کو سب سے پہلے اپنی جان و مال کا ڈر ہوتا تھا، اور حکومت کو ان کی خاص طور پر حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ مادنا نے اس جذبے کی سب سے زیادہ نمائندگی کی۔ دیوان ہونے کے بعد سب سے پہلے اس نے تمام اجنبیوں کو حکومت سے خارج کر دیا، اور ان کی جگہ اہل ملک کو مامور کیا چنانچہ ایک مورخ کے الفاظ میں ”مردم ہمدیار خود و کنیاں را بنواختہ مغل و غریب زاد ہارا برانداختہ“ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر اس ملک پرستی کے جذبے میں کچھ فرقہ پرستی کا رنگ ضرور پیدا ہو گیا جو مادنا، اور اس کے خاندان کے لیے مہلک ثابت ہوا کیونکہ اس اصلاحی دست برد سے جبکہ پُرانے لوگ سخت حکومت سے خارج کر دیے گئے تو ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا ماب جن نئے لوگوں کو مادنا نے مامور کیا وہ اکثر تلنگ تھے۔ نیز مرکزی حکومت کے جتنے بڑے عہدہ دار تھے ان میں اکثر مادنا کے خاندان کے لوگ تھے۔ چنانچہ مادنا کا بڑا بھائی اکنا، اس کا پیشکار ہو گیا، اور چند سال کے بعد اس کو مجموعہ دار کا عہدہ دیا گیا، اس کا۔ و سرائ بھائی آسنا، ورنگل کا عامل تھا، اور اس کا بھائی بنکنا جس کو رستم راؤ کا خطاب ملا تھا مختلف خدمتوں پر فائز ہوا۔

یہ بھی کرنا ملک کا صوبہ دار ہوا، اور کبھی فوج کا سر لشکر مقرر ہوا۔ اسی طریقے سے مرکزی حکومت کی اُگ تمام تر انہیں لوگوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کے علاوہ کرناٹک بھی جہاں لنگپا اور بینکنا کام کرتے تھے پوری طور پر ان کے زیر اثر تھا۔ بسوائے محمد ابراہیم کے کوئی مسلمان مرکزی حکومت کے بڑے عہدے پر فائز نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد ابراہیم جس کو مادنا کی مہربانی سے خلیل اللہ خاں اور پلنگ حملہ خطاب دیا گیا تھا، قطب شاہی افواج کا سر لشکر مقرر ہوا تھا، اور ایک سال اس کو کرناٹک کی صوبہ داری بھی دی گئی۔ مگر فوراً سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترقی کے لیے محمد ابراہیم نے مادنا، اور اس کے خاندان کی بے حد خوشامد کی۔ اور ایک روایت صحیح سمجھی جائے تو ابراہیم نے اس کے لیے ایک لاکھ دس ہزار ہون رشتوت دی تھی۔ غالباً مادنا نے اس کو نااہل اور غیر ملکی ہونے کے باوجود ایک اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کی چنانچہ اس ترقی کے لیے ابراہیم مادنا کا اس قدر احسان مند تھا کہ یہ شعر ہے۔

زالتفات بادشاہ و پندت رشتوں رول      گشت ابراہیم سر لشکر خلیل اللہ خاں

اس نے اپنی انگوٹھی کے نگینے پر کندہ کر دیا تھا جس سے اس کی نااہلی اور خوشامد معلوم ہوتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ملک کے عام مسلمانوں کے ساتھ مادنا کا اخلاقی اور سیاسی برتاؤ کیا تھا تو اس خصوص میں اس قدر مخالفت ہوا ہے کہ اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر تاریخ کاتبی ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ مادنا کا برتاؤ سخت جاہلانہ تھا، اور اس میں بہت تعصب پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی ذلت کی جاتی تھی اور ان کی شکایتوں کی داغ بیل نہیں ہوتی تھی۔ یعنی ایک مورخ کے الفاظ میں کہ: ”اسلام و اسلامیان را وقع نمی گذاشت۔ مساجد بے رونق بودند“

۱۔ حدائق العالم مقالہ اول ص ۳۶۸ - ۲۔ تاریخ اورنگ زیب، جادونا تھہ سرکار جلد ۳ ص ۳۳۴۔

۳۔ آثار عالمگیر ص ۲۶۷۔

۴۔ یہ واقعہ ہر مورخ نے لکھا ہے کہ ایک روز مادنا کسی مندر کی جاتر کے لیے گیا، چونکہ وہ پیشوا تھا اس لیے اس کے ساتھ ایک فوج گئی جس میں سادات و شرفاء بھی تھے ان لوگوں کی مادنا نے ان الفاظ سے سخت ملامت کی کہ تم ہمارے بزرگوں نے

کنالس آباد اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بیانات بہت کچھ سبالت پر مبنی ہیں، چونکہ مادنا اور اس کی حکومت کا مسلک مغل شہنشاہت کے سنگ راہ تھا اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مغل مورخوں نے ابوالحسن اور اس کے وزیر مادنا کے خلاف اپنے دل کا بخاری نکالنے سے سب سے پہلے مغل شہنشاہت کو یہ تمام مواد سید منظر اور اس کے بیٹے سید ہاشم کی وجہ سے ٹاٹھ جو گولکنڈہ سے بھاگ کر

ہمارے بت توڑے تھے اور اب میں اس پاداش میں تم کو ذلیل کرتا ہوں! یہ سن کر سیدوں کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔  
 (حقیقتہ العالم مقالہ اول ص ۳۶۸۔ خانی خاں جلد دوم بغانی خاں نے ایک واقعہ اور یہ لکھا ہے کہ مادنا نے نمن کا الزام لگا کر ایک سید کے ہاتھ کٹوا دیے) منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۱۱۔ منوچی نے ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ: ایک روز ندی کے کنارے ایک ایرانی اپنا منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ کوئی ہندو آیا اور اس کے قریب کھڑے ہو کر اس بے پرواہی سے اپنے پٹے دھونے لگا کہ پانی کے چھینٹے مسلمان (ایرانی) پر پڑنے لگے، اپنی صفائی کی خاطر اس نے شرافت کے ساتھ اس ہندو سے کہا کہ تم دور ہٹ کر اپنے پٹے دھو اس پر وہ توجہ کرنے کی بجائے ایرانی کو گالی دی اور مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔  
 آخر الذکر بہت برا فروختہ ہوا، اور اس کو ایک تھپڑ سید کی، اس پر ایک شور ہو گیا اور بہت سے ہندو جمع ہو گئے ان سب نے بے چارے مسلمان کی مرمت کی اور اس کو گرفتار کر کے مادنا کے پاس لے گئے، اس نے فوراً یہ حکم دیا کہ اس ایرانی کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں، چنانچہ اس کی تعمیل ہو گئی۔ بالآخر اس مظلوم نے دیکھا کہ اس کی کوئی داد نہیں ہوتی کیونکہ حکومت اور عدالتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں اس لیے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو تیل میں سکھا کر اور نگ زیب کے دربار میں پہنچ گیا شہنشاہ نے اس کو دلاسا دیا اور روپیے سے مدد کر کے وعدہ کیا کہ اس کا انتقام لیا جائیگا۔ منوچی جلد سوم ص ۱۳۱-۱۳۲۔

۱۔ مآثر عالمگیری ص ۲۸۵۔

۲۔ منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۲۸۔

مغل سلطنت سے جاملے تھے ان سے کسی انصاف کی توقع رکھنا بے معنی ہے۔ ان کو یہ الفاظ سے جو ان تاریخوں میں ظاہر کیے گئے ہیں صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ مادنا کی اصلاح کے باعث بہت سے مسلمان خدمتوں سے متحد ہو کر مغل ملازمت میں شریک ہو گئے اور ابوالحسن و مادنا کے خلاف مغل حکومت کو بھڑکایا کرتے تھے۔ تاہم اس کے باوجود بعض حقیقتوں کو بھول کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آخر باہر کے سیاحوں نے بھی جو غیر جانب دارانہ حیثیت رکھتے تھے مادنا کی کوئی تعریف نہیں کی بلکہ مذمت کی۔ اس کے علاوہ مادنا اور اس کی حکومت کے خلاف ملک میں اس قدر غیظ و غضب جمع ہو گیا تھا کہ ان کی مثال انہیں ملتی کسی قطب شاہی وزیر کے خلاف بھی اس قدر ہیجان برپا نہیں ہوا۔ مغل تو اس کے دشمن تھے ہی لیکن گو لکنڈے کے رہنے والے بھی اس کے دوست نہ تھے اور منوچی کے الفاظ میں مسلمان تو اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی محل کی خواتین جن کو سیاست سے بہت دور کا واسطہ ہوتا ہے اس کی سخت دشمن تھیں اور یہ اس قدر

---

۱۔ چنانچہ شہنشاہ نے کافر۔ فاجر ظالم ”منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۲۸ اور محمد ساقی نے ”ہنود مطرود“ (عالمگیر نامہ ص ۲۸۵) خانی خاں نے ”ہرد و براہ کا فرشید العداوت کا بد و حجام“ لکھا ہے (منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۹۲) اور جلد سوم ص ۴۷۱۔ حقیقۃ العالم کا مولف ”ہرد و براہ پر ہن شوم ملوم“ ص ۳۶۸۔ اور کر دھاری لال مولف تاریخ ظفرہ کہتا ہے کہ: ”مادنا برہمن تلمگہ درفت نہ و ابلیس خوی بے مثال بود“ ص ۳۵۔

۲۔ منوچی نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس سے مادنا کی فرقہ پرستی معلوم ہوتی ہے۔ جلد سوم ص ۱۳۱۔ مدراس کے انگریز اپنے وثائق میں یہ لکھتے ہیں کہ: ”مادنا بالکل مقتدر ہے اور لوگوں کو مجبور کر کے روپیہ وصول کرتا ہے۔ کرناٹک کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ: ”حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو دھوکا، فریب اور جبرستانی سے کام لیتے ہیں۔ معاہدہ قول وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔“ یہ صحیح ہے کہ مادنا کی سخت گیری کی وجہ سے انگریزوں کو بہت شکایت تھی۔

# انسواں باب

## جنگ ملکھیر

شہنشاہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد آئندہ بیس سال تک دکن کی رفتار سیاست میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوا کیونکہ آخر دکن کا سیاسی نقشہ وہی تھا اس ملک کی نئی اور پرانی ہوتاہیں مغل شہنشاہت کے مقابلے میں کشاکشِ زیست میں مبتلا تھیں ابھی فنا نہیں ہوئی تھیں مرہٹے تو اُلے ترقی کر گئے لیکن بیجا پور اور گولکنڈے کی رُو بہ زوال سلطنتوں نے بھی اپنی ہستی قائم رکھی۔ بیجا پور نے تمام مغل حملہ آوروں کو جن میں جے سنگھ، دلیر خاں اور بہادر خاں کو کلتاش تھے ہرا دیا۔ گولکنڈے نے دلیر خاں اور ہلول خاں کے متحدہ حملے کو جو ملکھیر پر ہوا تھا رد کر دیا لیکن ۱۰۹۱ھ میں جب سیواجی کا انتقال ہوا تو پھر دکن کے مالا مرتعت سے بدلے لگے، کیونکہ اس کا بیٹا سنبھاجی جو باپ کی جگہ گدی نشین ہوا تھا سخت فتنہ انگیز ثابت ہوا۔ یوں تو سیواجی کی ساخت و تاراج بھی کچھ کم تلاطم خیز نہ تھی تاہم اس میں عزت و ناموس کا کچھ پاس و سحا فاضل نہ تھا مگر سنبھاجی نے اپنی لوٹ گسوٹ میں تہذیب کی تمام تعینات توڑ دیے اور ایسا اودھم مچایا کہ زمانہ چینیے لگا چپنا پنچہ گدی نشین ہوتے ہی اس نے دکن کے چاروں طرف دست درازیاں شروع کر دیں اور بالآخر ۱۰۹۲ھ میں برہان پور پر جو اس زمانے میں دکن کی تہذیب کا بڑا مرکز تھا دھاوا بول دیا اور ایسی قتل و غارت کی کہ اہل برہان پور کانپنے لگے۔ بہادر خاں کی کم زوری کے باعث جو اس زمانے میں دکن کا گورنر تھا ان علاقوں کو وقت پر امداد نہ ہو سکی۔ ناچار ان لوگوں نے عاجزانہ کھجے کی نماز، چھوڑ دی اور شہنشاہ کی خدمت میں محضر پیش کیا کہ جب تک دکن میں امن قائم نہیں کیا جائیگا ہم جے کی غماز نہیں پڑھیں گے، کیونکہ یہ دارا کھرب ہے۔ اس درواغیہ مطالبے پر شہنشاہ نے کہا: ”ما خود بہ دولت برائے فتنہ کفار دکن متوجہ آن طریق“



می شوم۔ دوسری وقت یہ تھی کہ اسی زمانے میں شہنشاہ کاچھونا بیٹا شہزادہ اکبر راجپوتوں کے انھو سے بغاوت کر بیٹھا اور راجپوتانے میں اپنے باپ کے مقابلے میں ایک مخالفانہ محاذ بنانے کی کوشش کی لیکن جب یہاں اس کے قدم نہ جم سکے تو راجپوتانے سے بھاگ کر دکن میں پناہ لی اور سنبھادی سے اتحاد کر لیا۔ شہنشاہت کے لیے ایک نیا خطرہ یہ تھا کہ اس جدید بغاوت سے مرہٹوں اور دوسری وکٹی طاقتوں کو غیر معمولی تقویت ہو جاتی اور دکن مغل سلطنت کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ اس لیے اورنگ زیب نے شاہجہاں کی طرح بذات خود دکن کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا اور چونکہ اس زمانے میں راجپوتانے کی بغاوت فرو ہو چکی تھی اس لیے اس کو دکن میں قیام کرنا ممکن تھا۔

۱۶۹۲ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ ہندوستان کی تمام فوجی طاقت سمٹ کر دکن آگئی اس کا اولین مقصد غالباً یہ تھا کہ شہزادہ اکبر کی سرکوبی کرے اور دکن کو مرہٹوں کی شورش سے نجات دلائے، کیونکہ مرہٹوں کے قتل و غارت

کی وجہ سے دکن میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی ظاہر ہے کہ مراٹھی بے چینی اور بد امنی کا سد باب کرنا برہمن حکومت کا فرض منصبی ہے مغل حکومت بھی اس کو اپنا فرض سمجھتی تھی چنانچہ اکبر اعظم نے جہاں بھی حملے کیے ان میں ہمیشہ قیام امن کا پاکیزہ مقصد بھی مضمر تھا۔

اور یہی چیز اس وقت اورنگ زیب کے بھی پیش نظر تھی لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مغل شہنشاہ تمام ہندوستان کی شیرازہ بندی کر کے اپنی ایک اجتماعی قوت پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کو دکن کی تمام طاقتوں کا راستے سے ہٹانا ضروری تھا، کیونکہ وہ دکن جیسے بڑے غلط ارض کو جو ہندوستان سے ملحق نہیں ہے اپنی مرکزیت سے جدا نہیں رکھ سکتے تھے۔ شمالی ہند کی ہر بڑی طاقت خواہ وہ قدیم ہو یا وسطی جنوب پر ضرور اثر انداز ہوئی اور جب کبھی موقع ملا جنوب کو شامل کر کے ایک عظیم تر ہندوستان بنانے کی کوشش کی، گویہ کوششیں کبھی بار آور نہ ہوئیں۔ مغلوں کے لیے دکن کا مسئلہ وسط ایشیا کے ناگوار اثرات کی وجہ سے زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا، یعنی ایران کے صفوی، اور مغل سلاطین میں غایت درجے کی رقابت تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور دیکھنا چاہتے تھے اس کے لیے

صفویوں نے ادھر شمال میں قندھار پر بارہا زور لی اور جنوب میں بیجا پور و گولکنڈہ کی شیعہ سلطنتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ یہ سلطنتیں بھی اپنے بچاؤ کیلئے صفویوں کا دامن پکڑے ہوئے تھیں۔ ظاہر رہتا کہ اس سے مغل اقتدار پر ایک کھلی زد پڑتی تھی۔ ان حالات کے تحت مغلوں کو دکن کے لیے ایک مستقل مسلک قرار دینا تھا جو آئندہ عہد میں کیا گیا۔ البتہ اعظم نے دکن سے متعلق ایک بڑا مشاہدہ بتا دیا: اس کی ان کے باشندوں نے پابندی دے دی تھی اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اس دیرینہ منصوبہ کی تکمیل کی یعنی تمام دکن کو سرکر کے ایک عہد کی زیرِ شہنشاہیت قائم کر دی لیکن آئندہ واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے جانشینوں نے اس کے مسلک کی شاید غلط فہم دہندہ پیروی کی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے بڑے بڑے بندے اکبر کا بہت بڑا منصوبہ تھ لیکن اس کی تکمیل ایک ایسے طریقے سے بھی ہو سکتی تھی جو شہنشاہیت کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔

شہنشاہ درمضان شرایف کے بعد ۹۲۰ھ میں برہان پور آئے اور تین چار مہینے یہاں قیام کر کے اورنگ آباد پہنچ گئے اس کی وضاحت یہ شکل ہے کہ آیا شہنشاہ نے پہلے ہی دہلی میں مرہٹوں کے استیصال کے ساتھ گولکنڈہ اور بیجا پور کا خاتمہ بھی ضرور سمجھا تھا اور اس کا تہیہ کر لیا تھا۔ قرآن یہ ہیں کہ غالباً شروع ہی سے شہنشاہ کے ذہن میں یہ منصوبہ تھا کہ دکن کی رہی رہی مسلمان سلطنتوں کا خاتمہ کر دینا چاہیئے کیونکہ دکن کے ناظم کی حیثیت میں جب اس نے گولکنڈہ اور بیجا پور پر حملہ کیا تھا تو اس وقت اس کا ارادہ ہی تھا، اور اگر اس زمانے کے درپردہ واقعات مانع نہ ہوتے تو آج سے پانیس سال پہلے ہی ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اس وقت واقعات کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ آباد آتے ہی شہنشاہ نے سب سے پہلے شہزادہ ابراہیم کے خلاف فوج کشیاں کیں اور جب یہ ناکام ہو گئیں، اور شہزادہ اکبر باقی سے نکل گیا تو اس کے بعد ۹۲۳ھ میں مرہٹوں کے حلقوں پر وار کئے گئے چنانچہ شہزادہ اعظم کو قلعہ سالہیرا و شمالی نوٹن پر محصور کرنے کے لئے اور شہزادہ اعظم کو رام درہ پہنچا کر اسے روکا گیا۔ لیکن یہ بے سود ہوا یہ دونوں مہمیں ناکام ہوئیں اور مغل فوجوں کا بہت نقصان ہوا، مجبوراً ان فوجوں کو واپس بلا لیا گیا، اس کے بعد چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے سوا جو ایک سال تک مرہٹوں کے ساتھ جاتی رہیں کوئی بڑا موثر نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں شہنشاہ نے کبھی ناکامیوں پر

غور کر کے آئندہ کے لیے ایک پرزور لائحہ عمل مرتب کرنے کی کوشش کی۔ ۱۰۲۰ء کے آغاز میں دکنی سلطنتوں کا کوٹھ  
 عنصر تھا بلکہ دکن آنے کے بعد شہنشاہ نے مرہٹوں کے استیصال میں دکن کی اسلامی سلطنتوں کو بھی دعوت دی تھی کہ وہ مرہٹوں  
 کے خلاف مغل سلطنت کا ساتھ دیں۔ چنانچہ بیجاپور، گوالکنڈہ، کاشنابھی، زمان و صول ہوا تھا مگر وہ سال کے وقفے کے بعد  
 شہنشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سلطنتیں اپنے بچاؤ کے لیے مرہٹوں سے اتحاد کرتی ہیں اور ان کی ایسی مدد لیتی ہیں جیسے نظام شاہی  
 سلطنت کی مدد کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس طریقے سے مرہٹوں کا قلع قمع ناممکن تھا کیونکہ بیجاپور و گولکنڈہ سے  
 سنبھاجی کورمبیہ اور فوج سے مدد مل جاتی تھی اس لیے شہنشاہ نے سب سے پہلے بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کا  
 خاتمہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مرہٹوں کا تعاقب یک نخت بند کر دیا اور جو فوجیں مرہٹوں  
 کے خلاف مصروف تھیں ان کو سمیٹ کر اسلامی سلطنتوں کی رنج کشی میں لگا دیں۔ ۱۰۹۶ء میں ایک فوج شہزادہ اعظم کے تحت  
 بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دی۔

ان محرکات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا مغل سلطنت کو قطب شاہی حکومت کے ساتھ معاشی اغراض بھی  
 وابستہ تھے اور شکایتیں بھی تھیں گولکنڈہ ایک مال دار سلطنت تھی جس سے مغل شہنشاہوں کو مقررہ پیش کش کے علاوہ  
 بے حساب سونا چاندی اور جوا ہر ملتے تھے۔ محمد سعید میر جملہ نے تمام راز سر بست فاش کر کے مغل شہنشاہوں کو بہت مزیدار  
 بنایا تھا۔ شاہجہان نے یہاں سے کھلم کھلا جوا ہرا اور ہاتھی مانگے جن کی مجبوراً سربراہی کرنی پڑی۔ پرائے دھڑے کو چھوڑ کر نئی  
 شکایتیں یہ پیدا ہو گئی تھیں کہ ابو الحسن نے ایک طرف ”دو کافر شدہ یہ لعداوت“ اکتا داناؤ ملک میں مقتدر بنا رکھا تھا  
 جن کی وجہ سے سختی و ظلم زیادہ بر مسلمانان می گذشت ”دوسرے“ سنبھائے جہنمی دارالحربی“ کو امداد دی جاتی تھی چنانچہ  
 جب ۱۰۹۶ء میں بیجاپور کا محاصرہ ہو گیا تو ابو الحسن قلب شاہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ سکندر عادل شاہ کی کوئی مدد نہ کرے۔  
 ۱۰۹۶ء

۱۔ چنانچہ بیجاپور کے تاجدار سید محمد دوم شہید خاں کے نام میں مضمون کا ایک فرمان آیا تھا (بساتین السلاطین ص ۵۲۰)۔

۲۔ خانی خاں جلد دوم ص ۲۹۲-۲۹۳۔ ۳۔ بساتین السلاطین ص ۵۳۳۔

جب ۱۱۶۸ھ میں شہنشاہ خود بیجاپور کے محاصرے کو موثر بنانے کے لیے شولاپور گئے تو بہرہ مند خاں حیدر آباد کی نگرانی کے لیے مقرر ہوا تاکہ گولکنڈہ سے کوئی فوج بیجاپور کی امداد کے لیے نہ آنے پائے۔ لیکن قلب شاہی حکومت اپنے خارجی مسلک سے مجبور تھی اس کو یہ معلوم تھا کہ جب تک بیجاپور قایم ہے گولکنڈہ پر آنچ نہ آئیگی۔ اسی لیے شہنشاہ نے گولکنڈہ سے پہلے بیجاپور پر دار کرنا ضروری سمجھا، اس لیے ابوالحسن نے پہلے مراری راؤ کے تحت بیجاپور کی امداد کے لیے ایک فوج بھیجی جو سرحد کی ناکہ بندی کی وجہ سے منزل مقصود پر نہ پہنچ سکی، کیونکہ بہادر خاں اور بہرہ مند خاں عامل تھے سیکند عادل شاہ نے بھی ۱۱۷۰ء مانگی تھی اس آخری زمانے میں جبکہ بیجاپور کا محاصرہ سخت ہو گیا تو ابوالحسن نے پھر چالیس ہزار کی ایک فوج محمد ابراہیم خلیل اللہ کے تحت روانہ کرنے کی ہمت کی اگرچہ یہ منصوبہ پورا نہیں ہوا لیکن جس خط میں ابوالحسن نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا وہ مخلوں کے ہاتھ پکڑا گیا، اور شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ ”بتک

---

لے۔ فراز لکھتا ہے کہ: ”جب تک بیجاپور قایم ہے گولکنڈہ محفوظ ہے“۔ فراز جلد دوم ص ۵۱، از تاریخ اورنگ زیب مرچا دوناتھ سرکار۔

لے۔ حیدر آباد کے دو حاجب محمد معصوم اور محمد جعفر جن کو ابوالحسن نے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ کووال کی نگرانی میں نظر بند تھے اور یہ حکم تھا کہ ان کے ہاں گولکنڈہ سے جو خطوط آئیں وہ اہتمام خاں کو وال دیکھا کرے ”اسی طرح یہ خط پکڑا گیا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:-

”ایشان بزرگ اند۔ تا حال پاس مراسم بزرگ داشت نمودیم حالانکہ ایشاں سکندر را یتیم و ناتوان دانستہ بیجاپور را محاصرہ نمودہ کار او تنگ آورده اند۔ واجب آمد کہ سوائے جمعیت موقورہ بیجاپور۔ را بہ سنبھا از طرف باقشون از شمار افزوں جہت کو مک آن بیکس کمرسی بہ بندند۔ و ما بہ سرداری خلیل اللہ خان پلنگ حلیہ چہل ہزار سوار مستعد یکار قہن غایم و یتیم کہ ایشاں کہ ہم کہ ام طرف را مقابلت و مقاومت خواہند

ہم شہنشاہ کو بزرگ سمجھ کر ان کا پاس دیکھنا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سکندر جیسے یتیم بچے کے سر پر نفل لشکر پہنچ گیا ہے اس لیے ہم خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ ادھر سے خلیل اللہ خاں کے تحت چالیس ہزار کی فوج امداد کے لیے جائیگی اور دوسری طرف سے سنبھالی اپنی فوج لائیگا، پھر دیکھیں گے اورنگ زیب کس کس طرف سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس خط کو دیکھ کر شہنشاہ بہت برا فروخت ہوئے اور کہا کہ ماگوش مال این یک چینی فروش میمون باز پلنگ نواز را متوقع داشته بودیم حالانکہ مادہ خردس ببانگ آمد جائے توقف نماند۔ بادجو اس کے کہ بیجا پور کے محاصرے میں تمام توجہ منقطع تھی اور گو لکنڈے کے لیے فوج بھیجنا بہت مشکل تھا تاہم اس کو اپنے حال پر چھوڑنا خلاف مصلحت سمجھا گیا، اس لیے شہزادہ معظم کو ایک بڑی فوج کے ساتھ فوراً حیدرآباد پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا، اور بہادر خاں کو حکم ہوا کہ اپنے مستقر اندی کو چھوڑ کر شہزادے کی مہم میں شامل ہو جائے! اس فوج میں صفدر خاں، اعتقاد خاں، ملطف خاں، سید عبداللہ خاں بارہہ، جاں نثار خاں وغیرہ جیسے نامور جنرل شامل تھے۔ ملکیہ پیر جو گو لکنڈے کی سرحد سے نفل فوج کا پٹراؤ ڈالا گیا۔

اگرچہ قطب شاہی حکومت نے ہمیشہ مغلوں سے پہلو بچانے کی کوشش کی تاکہ ان کو کوئی شکایت نہ ہو

پکڑو۔ و آہنہ را کہ میش چہ وترہ کو توانی فردا آوردہ اند ازین معنی خستہ خاطر نشوند

نزودیک است کہ سدا رک بہ ظہور آید۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۶۰)۔

نزیری نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ :- نوشتہ جات نہانی کہ در ایام محاصرہ بیجا پور

باسکندر عادل شاہ داشت۔ (بہائمین السلاطین ص ۵۴۸)۔

۱۔ ہم نے چینی بیچنے والے بندر پنجانے والے کی گوشمالی ملتوی کر دی تھی، چونکہ اب مرغی کڑکڑا رہی ہے اس لیے

تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ (حقیقۃ العالم مقالہ اول ص ۳۶۹)۔

۲۔ مآثر عالمگیری ص ۲۶۰۔ خانی خاں جلد دوم ص ۲۹۲۔

اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ جب شہنشاہ دکن آئے تو ابوالحسن نے اس کی خدمت میں ہونا تھا اور جواہر رسالا، کیے تھے اور بیجاپور کے محاصرے کے زمانے میں جبکہ شہنشاہ شوالاپور میں تھے قلب شاہی حاجب بھی گئے تھے لیکن حکومت اپنے دفاعی انتظام سے غافل نہیں رہی بلکہ مغل حملوں کے خوف سے اپنے پاتہ پیر مضبوط کرتی رہی اور بیجاپور کی منفرد بھر مدد کی۔ مرہٹوں سے اتحاد کر لیا۔ سیواجی کے مرنے کے بعد سنبھاجی کو بھی مقررہ: مدد دی۔ شہناں، شہناہی، نیری، راجدول کو محفوظ کیا گیا۔ محمد ابراہیم کو ایک جرار فوج کے ساتھ ملکھیرے متعین کیا گیا جس نے بہلولیاں اور دیرناں کے متحدہ حملے کو روک دیا، اور شکست قاش دی۔ ۱۶۹۷ء میں ابوالحسن قلب شاہ اور مادنا جوار سے ۱۰۰ کوٹھلی میں بہت دنوں تک مقیم رہے۔ کوٹھلی کے قلعے کو مستحکم کیا تاکہ اگر مغل حملہ آور ہوں تو مدد، حکومت اور خزانہ یہاں منتقل کیا جاسکے۔ اسی زمانے میں کوند بیر کے قلعے کی بھی مرمت کروائی گئی، اور یہاں دو ہزار سپاہی متعین کیے گئے، حالانکہ پڑانے انتظام میں صرف بارہ سو سپاہی رکھے جاتے تھے انگریز بھینے کو لکھا لیا کہ بارہ ہزار ہون کی بارود، بیچیس کھنڈی سیسہ، ہم پہنچائیں اس کے علاوہ صوبہ کرناٹک کی بھی خاطر خواہ نگہداشت کی گئی جہاں حملوں کی ضرورت تھی حملے بھی کیے گئے چنانچہ لنگپانے ۱۶۹۸ء میں چکناکن پٹی ایک قصبہ اور اس کے نواح پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ وہ علاقے جو محمد ابراہیم کی غفلت کے باعث ہاتھ سے نکل گئے تھے دوبارہ حاصل کیے گئے۔ زمانے کی ضرورت کا لحاظ کر کے مرکزی آلات حکومت میں بھی ضروری تغیر کیا گیا۔ ۱۶۹۸ء میں بادشاہ دیوان کے گھر گئے۔ محمد ابراہیم کو جو اس زمانے میں مجموعہ دار کی خدمت پر فائز تھا علیحدہ کر کے اکٹالو مقرر کیا۔ محمد ابراہیم صرف

لے۔ قرینہ یہ ہے کہ درنگل کے قلعے کی بھی مرمت کروائی گئی ہوگی۔

لے۔ کرناٹک کے یہ معلومات مجھے بھوپال نواز صاحب ام، اسے سے دستیاب ہوئے ہیں۔

لے۔ ۱۶۹۷ء میں محمد ابراہیم سر لشکر کی خدمت پر فائز تھا، لیکن مجموعہ داری سے علیحدگی سے وہ بہت ناراض ہوا اور اسی وجہ سے ملکھیرے کی لڑائی کے بعد مغلوں سے مل گیا۔

مخبر کی خدمت پر بحال رکھا گیا۔ اکتا نے کرناٹک کا جائزہ لگیا کر دے کر مجموعہ واس کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔ اس طریقے سے اکتا تمام داخلی امور کی نگرانی کرتا تھا، یہ سر لشکر اور وزیر داخلہ اور مادنا صرف خارجی امور کی نگہداشت کرتا تھا، کیونکہ اس آخری زمانے میں مغلوں کے غلبے کی وجہ سے خارجی امور بہت پیچیدہ ہو گئے تھے اور ان کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت تھی۔ اور جب ۱۰۹۶ھ میں حیدر آباد پر حملہ کرنے کے لیے مغل فوجیں آنے لگیں تو ان کی مدافعت کا بھی خاطر خواہ اہتمام کیا گیا۔ ابراہیم خلیل اللہ خاں شیخ منہاج اور رستم راؤ کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج جس کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ تھی ملکیہ پرستین کر دی گئی جو قطب شاہی سلطنت کی سرحد تھی۔

پہلے خاں جہاں کوکلتش اپنی فوج کے ساتھ ملکیہ پرستین، برہمنوں اور شاہ عالم دو یا تین میل پیچھے تھا۔ جب مغل فوج کا مقدمہ جس کا ہر اول جاں نثار تھا آگے بڑھا تو ملکیہ کے مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر قطب شاہی فوج نے جو پہلے سے ملکیہ پرستین راؤ والے ہوئے تھے اس کا راستہ روکا چونکہ کوکلتش فوج تعداد میں زیادہ تھی اس لیے مغل فوج قریب کے ایک قلعے میں محصور ہو گئی اور اپنی مدافعت کرنے لگی پہلی جھڑپ میں جو ملکیہ اور رستم کے قریب ہوئی مغل فوج کو شکست ہو گئی اس اثنا میں شہزادہ معظم آگیا اور اس نے جنگ سے بچنے کے لیے پہلے چند شرائط پر صلح کرنے کی کوشش کی۔ شرطیں یہ پیش کی گئیں کہ اکتا، اور مادنا کو حکومت سے خارج کر دیا جائے اور رستم و رام گیر کے پرگنے مغلوں کے حوالے کیے جائیں۔ نیز بقاہ پیشکش اور آردا بجائے۔ لیکن کوکلتش نے یہ سب رد کر دیا۔ بلکہ لیٹا کر دیا۔ خان جہاں بہت خاں اور سید عبداللہ، بہ چاروں طرف سے کھڑے ہو گئے اور ان کا باہر ٹکنا مشکل ہو گیا، اور قرائن یہ تھے کہ خان جہاں کوکلتش کو شکست ہو جاتی لیکن مغل فوج کے ایک ہاتھی نے جس کے منہ میں چارمن کی زنجیر دی گئی تھی ایک تھلک

---

۷۔ خانی خاں جلد دوم کوکلتش فوج کا ایک مشہور سپاہی باری خاں (جو پتھر پھینکنے میں بہت مشہور تھا) جس کا ہاتھ پہلے آؤب تھما اپنے بھالے کے ساتھ خان جہاں کے ہاتھی کے سامنے آگیا اور پوچھا کہ مغل فوج کا خاص سردار کون ہے، یہ حملہ کرنا چاہتا تھا کہ خان جہاں نے تیر سے اس کا کام تمام کر دیا۔

ڈال دیا، اس کی یورش سے دکنی فوج منتشر ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ بہت سے ہاتھی دگھوڑے مغلوں کے ہاتھ آگئے۔ مغل فوج نے فتح کے شادیاں بجالائیں، اس کے ساتھ ہی جاں نثار خاں نے گڈی سیڑم پر حملہ کر کے فتح کر لیا، اور اس کے بعد گولکنڈے سے ایک بڑی ملک آگئی اور جاں نثار خاں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ طرفین کے بہت سے آدمی مرے اور اس کے چوتھے روز اس قدر سخت مقابلہ ہوا کہ بہت خاں سید عبداللہ خاں۔ راجہ مان سنگھ وغیرہ بڑی طرح زخمی ہو گئے، لیکن آخر میں قلب شاہی فوج کو شکست ہو گئی اور یہ میدان سے بھاگنے لگی۔ سید عبداللہ نے یہ رائے دی تھی کہ منہزم فوج کا تعاقب ہو تو مناسب ہے، لیکن شہزادہ معظم اور خان جہاں نے اس سے اختلاف کیا اور خیمہ لگا کر پیپ چاپ بیٹھ گئے، اس کے بعد ویسے بھی بارش کی وجہ سے جنگ موقوف کرنی پڑی کیونکہ یہ بارش کا موسم تھا جب شہنشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں بہت لول و بد دل ہو گئے اور چار پانچ مہینے مغلوں کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ حالانکہ دکنی فوج چپکے چپکے حملہ کرتی جاتی تھی، اس واقعے سے شہنشاہ اور زیادہ غصا ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے ایک فرمان لکھا جس میں خان جہاں کی سخت سرزنش کی گئی تھی اور یہ ہدایت تھی کہ فوراً حملہ ہونا چاہیئے۔ اگرچہ شہزادہ دل سے حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن شہنشاہی فرمان کی وجہ سے مجبور ہو کر اس کو اپنے سپہ سالاروں سے جن میں خان جہاں بھی تھا، مشورہ کرنا پڑا چونکہ خان جہاں شہنشاہ کی طرف سے برداشتہ خاطر تھا اس لیے اس نے حملے کی مخالفت کی، لیکن دوسرے سرداروں نے یہ رائے دی کہ اب شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ سید عبداللہ نے خان جہاں کی جگہ اپنے آپ کو ہراول کی خدمت کے لیے پیش کر دیا جب یہ طے ہو گیا کہ لڑائی ہونی چاہیئے تو شہزادے سب سے پہلے حیدر آباد کے سر لشکر خلیل اللہ خاں کو صلح کا پیغام بھیجا کہ

۱۔ یہ مادنا کی خاص فوج تھی جس کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے دغانی خاں جلد دوم ص ۲۹۸۔

۲۔ دغانی خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ کو کچھ پہلے سے شہزادہ معظم اور خان جہاں سے شکایت تھی، اس تساہل سے

اور زیادہ ناراض ہو گئے دغانی خاں جلد دوم ص ۲۹۹۔



اگر ابوالحسن، سیٹھم، کوہیر، اڑکی اور ملکھیر جو ماہ الزراع پر گئے ہیں بھاسے ہوئے کروٹ نہ جنگ نشوئی ہو سکتی ہے اور شہنشاہ سے "عفو تقصیرات" کی سفارش کی جائیگی۔ یہ پیغام ناظر محل نمرکی معرفت بھیجا گیا تھا۔ محمد ابراہیم نے سیٹھم اور دوسرے پر گئے دے کر صلح کرنا چاہتا تھا مگر شیخ منہاج اور رستم راؤ نے اس کو منظور نہ کیا بلکہ کہا کہ:-

”قلعہ سرحد سیٹھم بر سر نوک شمشیر و سنان نیز ہائے ما و ابستہ است“<sup>۱</sup>

اور دکنی سپاہی فوراً ان پھینکنے لگے چنانچہ بعض بان تو خود شہزادہ معظم کے خیمے میں آپڑے اور کھانے کا خوان گر گیا، شہزادے نے بڑا کر فوراً جنگ کی تیاری کی، چنانچہ بہادر خاں کے ساتھ شہزادہ معز الدین کو فوج کا ہرا دل بنایا گیا اور جعفر خاں و ہمت خاں اس کے ہمراہ رکھے گئے، مرکزی رسالہ خود شہزادہ معظم کے تحت تھا جس میں بان سنگھ ابوالکلام سمند بیگ وغیرہ شامل تھے۔ دوسرے گولکنہ سے بھی نئی کمک آگئی اور قطب شاہی افروں نے اس وقت موقع کی نزاکت کو ملحوظ رکھ کر جنگ کا ایک نیا نقشہ مرتب کر لیا، یعنی پہلے تو ان لوگوں نے یہ کام کیا کہ اپنی بعیر وائیں جساب تین چار میل ہٹا دی اور پھر توپیں گڑھے میں اور بعض توپیں مٹی میں دبا دیں تاکہ دشمن کو نظر نہ آئیں، اس کے بعد فوج کا ایک حصہ مغل ہرا دل کے سامنے اور دوسرا حصہ جس میں شیخ منہاج، رستم راؤ وغیرہ کھڑے تھے یہ عداوت اور شہزادہ معظم کے مقابلے کے لیے مقرر کیا، اور بڑے زور سے یلغار کیا۔ لیکن مغل فوج کی پورش کے سامنے پسپا ہو گئے۔ اور گڈی سیٹھم کی طرف ہٹ گئے، دشمن سے تھوڑی ہمت مانگی پھر دوسرے روز شام تک لڑائی ہوتی رہی لیکن اس کا انجام بھی یہی ہوا جب شکست ہونے لگی تو قطب شاہی فوج نے شہزادہ معظم کو یہ پیغام بھیجا کہ بجائے گھمسان کی لڑائی کے دو بد و مقابلہ کیا جائے تو مناسب ہے، یعنی چند آدمی فریقین میں بے میدان میں آئیں اور شمشیر آزمائی کریں اس بڑی خونریزی سے کیا فائدہ ہے چونکہ شمشیر آزمائی دکن کا خاص فن تھا اس لیے قطب شاہی سپاہیوں کو تو اپنے فن پر

۱۔ خانی خاں جلد دوم ص ۲۰۲۔

۲۔ خانی خاں جلد دوم ص ۲۰۲ - ۲۰۳۔

اطمینان تھا، لیکن مغل اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ شہزادے نے جواب دیا کہ ہم صرف ہاتھی پر مقابلہ کر سکتے ہیں اس طرح یہ مطالبہ رد ہو گیا۔ صبح کو یہ معلوم ہوا کہ قطب شاہی فوج حیدرآباد کی طرف فرار ہو گئی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فوج کے دکنی اور غیر دکنی عناصر میں بے حد اختلاف ہو گیا، اور بعض لوگ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر مغل فوج نے فتح کے نقارے بجائے اور قطب شاہی فوج کا تعاقب شروع کر دیا۔ جب دکنی فوج حیدرآباد پہنچ گئی تو یہاں یہ حادثہ ہوا کہ گولکنڈے کا سر لشکر محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں مغلوں سے مل گیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب قطب شاہی فوج ملکھٹڑ سے منہزم ہو کر آئی تو اس نے صرف محمد ابراہیم کو شکست کا ذمہ دار قرار دیا، اور بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ وہ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتا، مادنا نے بھی اس کی تائید کی۔ بادشاہ اس سے بہت ناراض ہوئے اور اس کو قید کرنا چاہا۔ اس سے خائف ہو کر محمد ابراہیم ۸ اکتوبر ۱۰۹۷ھ کو شہزادہ معظم کے پاس پہنچ گیا چونکہ مغل ایسے مواقع کو غنیمت سمجھتے تھے اس پر عنایات کی بوجھار کر دی اور ملازمت میں داخل کر لیا۔ اس کو بہابت خان خطاب شیش ہزاری منصب اور چار ہزار سوار ملے۔

گولکنڈے کی فوجوں کی شکست اور محمد ابراہیم کی بے وفائی سے قطب شاہی حکومت بہت پریشان ہوئی۔ ابوالحسن پر اس قدر پریشانی طاری ہوئی کہ وہ اب دوسروں سے بھی بے اعتمادی ظاہر کرنے لگا۔ شیخ مہناج نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ ”مادنا بھی ناقابل اعتماد ہے، اغلب یہ ہے کہ خلیل اللہ خاں کی غداری میں یہ بھی شریک ہو کیونکہ خلیل اللہ خاں آخر اسی کا آفریدہ ہے، ممکن ہے کہ یہ بھی کل کو مغلوں سے مل جائے۔“ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ فوراً حیدرآباد سے اٹھ کھڑا ہوا۔

۱۔ منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۰۵۔

۲۔ شہزادہ معظم پہلے دھوبی بیٹ کے راستے گلگن پہاڑ آیا اور اس کے چند روز بعد گوشتہ محراب میں آکر ٹھہرا۔

۳۔ منتخب اللباب خانی خاں جلد دوم ص ۳۰۵۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابراہیم پہلے سے ناراض تھا، کیونکہ اس کو دیوانی سے علیحدہ کر کے اکنا کو ترقی دی گئی تھی۔

اور جہاں تک ممکن تھا اپنے متعلقین اور ضروری زردجواہر ہمراہ لے کر قلعے میں محصور ہو گیا۔ حالانکہ مادنانے یہ مشورہ دیا تھا کہ گولکنڈے کی بجائے ورنگل کے قلعے میں پناہ لینا مناسب ہے۔ مگر اس کا کوئی سحاکا نہیں ہوا اور اول تو مادنانے بے اعتمادی پیدا ہو گئی اور دوسرے مغلوں کی آمد اور خلیل اللہ خاں کی بے وفائی سے ایسی بدحواسی طاری ہوئی کہ اس کو مشورہ لینے کی بھی مہلت نہیں ملی، بلکہ وہ راتوں رات قلعے میں بھاگ گیا۔ بادشاہ کا اس طریقے سے شہر کو چھوڑ کر قلعے میں محصور ہونا اچھا نہیں تھا، اس سے شہر کی حفاظت کا تمام انتظام ٹوٹ گیا، اور لیٹروں کو جن میں نسل سپاہی بھی شامل ہو گئے تھے دن دھاڑے تاخت و تاراج کرنے کا موقع مل گیا۔ ان لیٹروں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نہ صرف اہل شہر کے زردجواہر لوٹ گئے بلکہ خود شاہی محلات تاراج ہو گئے۔ ہر طرف آتش زدگی ہونے لگی، یہ عجیب دل خراش منظر تھا کہ ہزار ہا شرفاء اپنے بیوی بچوں کو لے کر انتہائی وحشت میں بھاگ رہے تھے تاکہ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت ہو سکے، عورتوں کو چادر اور برقعے اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ لیکن اس عزت و ناموس کی حفاظت میں ہزاروں کی جانیں تلف ہوئیں اور بہت سے گرفتار ہو گئے اور ہزار ہا شریف گھرانے آگ کی نذر ہو گئے۔ شرفاء کا تمام سامان تمدن راستوں پر بکھرا پڑا تھا، اور اس میں زردجواہر اور قیمتی کپڑے ہر قسم کی چیزیں تھیں تقریباً پانچ کروڑ روپیے کی لوٹ ہوئی۔ بڑے قالینوں کا اٹھانا لٹا ہوا تھا اس لیے ان کے ٹکڑے کیے گئے۔ غرض مورخ غانی خاں کے الفاظ میں ”عجیب ہنگامہ قیامت و رستخیز غریب برپا گردید“ غالباً شہر حیدر آباد پر ایسی مصیبت کبھی نازل

---

۱۔ اس معاملے میں ابوالحسن نے اپنے ارباب سیاست سے کوئی مشورہ نہیں کیا، اس بدحواسی میں اس نے اپنی عزت و ناموس کا پاس دھکا دیا، نہ اہل شہر کی عزت و جان و مال کی حفاظت کی پروا کی بلکہ شہر کو بالکل لیٹروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا (غانی خاں جلد دوم ص ۳۰۶)۔

۲۔ چونکہ ان لوگوں کو اپنا سامان اٹھانے کے لیے وقت پر کوئی گاڑی نہیں ملتی تھی اس لیے سب سامان چھوڑ دیا، اور اپنے بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ کر قلعے کی طرف آرہے تھے۔ ۳۔ غانی خاں جلد دوم ص ۳۰۶۔

نہیں ہوئی تھی، اس شہر کو آراستہ کرنے میں قلعہ شاہوں نے جس قدر محنت کی تھی وہ سب رشکیاں گئی جب شہزادہ معظّم کو اطلاع ہوئی تو اس نے ناخفت و تاراج کا سدباب کرنے کی کوشش کی اور سپاہی متعین کیے، لیکن اس وقت تک سب کچھ ہو چکا تھا۔ یہ کوشش وقت پر ہوئی چاہیے تھی جو مغل سپاہی آتش فتنہ فرد کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے وہ بھی ٹوٹیں شریک ہو گئے۔ بالآخر خانِ جہاں شہر کی حفاظت کے لیے مقرر ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ٹوٹ ہوئی رہی۔ اس بہت ٹھکن ماحول میں جبکہ شہر حیدر آباد کی اینٹ سے اینٹ بچ رہی تھی اور ملک کے قدار ہر روز اپنی سلطنت سے ہمدردی کر مغلوں سے مل رہے تھے، اب جو احسن کے لیے عاجزانہ درخواستِ صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ اس نے قلعے سے نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ صلح و رحم کی درخواست کی اور شہزادہ کے لیے رضا مندی ظاہر کی شہزادہ شہر پہلے سے صلح و آشتی کی طرف مائل تھا، اور اس وقت وہ حیدر آباد کی تباہی سے ایسا متاثر ہوا کہ فوراً صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی اور شہنشاہ کے ہاں سفارش کرنے کا وعدہ کیا۔ صلح کے لیے چار شرطیں طے ہوئیں: (۱) پہلے بقائے کی ادائیگی میں نائبِ شاہی سلطنت ایک کروڑ بیس لاکھ روپیے (۲) اور ہر سال دو لاکھ ہون خراج ادا کرے، (۳) نیز اگنا و مادنا جن سے مغلوں کو سخت شکایت تھی حکومت سے بے دخل کیے جائیں، (۴) اور ٹیکس و سیڑم جن کی مغل سلطنت پہلے سے دعویدار تھی فاقوں کے حوالے کر دیئے جائیں شہزادہ معظّم نے ان شرائط کے ساتھ صلح منظور کر لی اور میر باہشم کی معرفت شہنشاہ کو اس کی اطلاع کر دی اور منظور کی درخواست کی شہنشاہ اس صلح سے بظاہر خوش ہوئے اور شہزادے اور

---

شاہِ محمد ابراہیم کے علاوہ محمد تقی، محمد داؤد نے سلطنت سے بے وفائی کی اور مغلوں سے مل گئے، ان بے وفادوں میں خود بادشاہ کا بیٹا بھی غریب الملک بھی تھا۔ مغل سلطنت نے آخر الذکر کو سہ ہزاری منصب و دوسری صد سوار، اور دوسروں کو دو ہزاری منصب اور سی صد سوار عطا کیا۔ آخر عالمگیری (۱۶۹۹)۔ جب محمد ابراہیم شہنشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو اس کو اکتائیس گھوڑے چند ہاتھی اور پانچ ہزار ہون انعام ملے۔ چند روز کے بعد زین العابدین بھی جو ابواحسن کا ایک عزیز تھا، مغل ملازمت میں داخل ہو گیا (آخر عالمگیری ۱۶۹۲)۔

اس کے رفقاء کار کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ شہزادہ معظم چند مہینے حیدر آباد میں ٹھہرا رہا کیونکہ شرایط کی تکمیل ابھی باقی تھی، چونکہ حیدر آباد کی وحشتناک حالت کی وجہ سے روپیہ جمع کرنا اور شرایط کے مطابق بقایا، اور خراج ادا کرنا بہت مشکل تھا، اور مغل فوج کے ہوتے ہوئے یہ کام اور بھی دشوار تھا، اس لیے ابوالحسن قطب شاہ نے شہزادے سے یہ درخواست کی کہ وہ حیدر آباد سے باہر چلا جائے، چنانچہ اس درخواست پر شہزادہ کو ہمراہ چلا گیا جو حیدر آباد کے شمال مغرب میں واقع ہے اور وہاں تکمیل شرایط کا انتظار کرنے لگا۔ دیویوں کی فراہمی تو اس طریقے سے ممکن ہو گئی، لیکن مادنا، اور اکنا کی معزولی کا سوال ابھی باقی تھا۔ بادشاہ ان کی برطرفی کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ مغلوں کی مخالفت کے علاوہ خود گولکنڈہ کے مسلمان اور محل کی خواتین ان وزراء کی سخت دشمن تھیں، کیونکہ یہ لوگ ان وزراء کو حیدر آباد کی تمام تباہی اور مسلمانوں کی خونریزی کا باعث سمجھتے تھے اور پزار تھے۔ چنانچہ ان وزراء کی معزولی کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا، لیکن جب بادشاہ ان کو معزول کرنے میں پس و پیش کرنے لگے تو یہ لوگ بے قابو ہو گئے اور ملن کو خود مارنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ ان کے قتل کی خطیہ سازش ہو گئی اس سازش میں بہت سے امراء اور ذمی اثر لوگ تھے اور محل کے اندر سردما، اور جانی صاحب جو عبداللہ قطب شاہ کی

لے۔ نعمت خاں مرزا محمد نے اس فتح کی مسرت میں ذیل کا قطعہ لکھ کر جس سے تاریخ بھی اخذ ہوتی ہے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

از نصرت بادشاہ غازی گردید دل جہانیاں شاد

آمد قلم صواب تاریخ شد فتح بہ جنگ حیدر آباد داس تاریخ میں ایک سال زیادہ ہے

۱۰۹۷

شہزادہ معظم کے منصب میں وہ ہزاری کا اضافہ کیا گیا تھا۔

لے۔ قطب بریں تمام خرابی حیدر آباد و لشکر کشی، مسلمان کشی از نحوست ہر دو برادر دجال بہرت بد سرشت است تنگ آمد

بودند "دخانی خاں جلد دوم ص ۳۰۸۔ لیکن سازش کرنے والوں میں غالباً ایسے لوگ زیادہ تھے جن کو مادنا نے

برطرف کیا تھا۔

ذی اثر حرم تھیں ساتھ ہو گئیں لیکن شیخ منہاج جو ان ہندو وزراء پر پہلے سے خار کھایا ہوا تھا سب کا سرغنہ بنا جب مادنا اور اکتارات کو بادشاہ کے پاس سے گھر واپس آرہے تھے، گولکنڈے کی ایک شاہراہ میں جمشید اور دوسرے غلاموں نے دونوں وزراء پر حملہ کر کے انکو قتل کر دیا، ان کے ساتھ جو محافظ دستہ تھا وہ رشوت کے ذریعے پہلے سے فراہم کر لیا گیا تھا۔ اس وقت اتفاق سے رستم راؤ گھر میں تھا سازشیوں نے گھر میں گھس کر اس کا کام تمام کر دیا ان لوگوں کے تمام گھر لوٹ بیٹھے اور اس اشتعال میں دوسرے مندر اور برہمنوں کو بھی نقصان پہنچا۔ اگر حکومت اس وقت روک تھام نہیں کرتی تو شاید بہت سے ہندوؤں کا خاتمہ ہو جاتا۔ محل کی بیگیوں اور دوسرے اُمرانے ان مقتول وزراء کے سر شاہ عالم شہزادہ معظم کے پاس بھیج دیے اور شہزادے نے یہ سر بہادر علی خاں کے ہمراہ شہنشاہ کے پاس بھیجنے کا انتظام کیا، اور خود ابوالحسن کو آخر وقت تک اس کی اطلاع نہیں ہوئی۔ گو شہنشاہ دل سے خوش تو نہیں تھے لیکن اتنا اطمینان تو تھا کہ اب گولکنڈے میں مغل مفاد کی کوئی مخالفت نہ ہوگی۔

۱۔ مادنا، اور اکتا کے قتل کی صحیح تاریخ غرہ جمادی الاول ۱۰۹۷ھ م اوائل مارچ ۱۶۸۶ء ہے۔ ولندیزی سیاح ہیورٹ کا بیان ہے کہ یہ دونوں وزراء سڑک پر گھسیٹے گئے، مادنا کا سر کاٹ کر شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس بھیجا گیا، برغلات اس کے اکتا کا سر ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلا گیا تاریخ اورنگ زیب جادونا تھا سرکار۔ فرائر کہتا ہے کہ ان کے قتل سے ملک میں کوئی شورش نہیں ہوئی اور کسی نے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی اس سے ان کی غیر ہردلعزیزی معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ محمد ساقی کہتا ہے کہ:-

”سر مادنا برہمن فتنہ زرا ابوالحسن یوانمود اطاعت و انقیاد بریدہ نزد شاہ عالم فرستاد (تاریخ مالگیری ص ۷۷)۔ منوچی کہتا ہے کہ جب شاہ عالم نے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا تو ابوالحسن نے صلح کی درخواست کی، شاہ عالم نے اپنے باپ کے پاس سفارش کی کہ صلح کر لینی چاہیے، کیونکہ پہلے تو قلعے کی تسخیر میں بہت دیر لگے گی اور پھر جو کچھ قصور میں وہ ہندو وزراء کے ہیں، ابوالحسن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ ابوالحسن شہنشاہ کے حسب خواہش شرائط کی تکمیل کر دیگا اس کے جواب میں شہنشاہ نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ ایک بڑی رقم، جواہر ہاتھی اور آلات حرب

غالباً اسی وجہ سے شاہ عالم کو اپنے پاس شوالا پور بلا لیا، اور قطب شاہی علاقوں سے تمام فوجیں ہٹا لیں۔ شہزادہ مع فوج کے ۷ جون ۱۶۸۶ء کو شوالا پور پہنچ گیا اس کے پانچ روز کے بعد قطب شاہی صاحب شہنشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا اور سواہتھی نذرانے کے طور پر پیش کیے۔

چاہتا ہوں اور یہ وعدہ لیا جائے کہ بیجا پور کی کوئی مدد نہیں کی جائیگی جواب وصول ہونے پر شاہ عالم نے ابوالحسن سے جواب تک قلعے میں محصور تھا گنڈیشہ کی۔ وہ ان شرائط کے لیے تیار ہو گیا، اور پہلا کام یہ کیا کہ اکٹا، اور مادنا کے سر کاٹ کر قلعے کی فصیل کے نیچے پھینک دیے دمنو جی جلد دوم ص ۲۹۳-۲۹۴۔ لیکن محمد ساقی اور دمنو جی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے، ان کو قتل کرنا تو کجا ابوالحسن ان کو حکومت سے بے دخل کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خانی خاں کے بیان کے مطابق بادشاہ کو اس کی مطلق اطلاع نہ تھی دغانی خاں جلد دوم ص ۳۰۸۔ اکٹا، اور مادنا کے منیر حکم جمادی الاول ۱۰۹۷ھ مطابق

۲۶ مارچ ۱۶۸۶ء کو شہنشاہ کے پاس بھیجے گئے۔

# ”ہیسواں باب“

## گوکندے کا محاصرہ اور اس کا خاتمہ

! یہ بے بنیاد صلح نامہ جو شہزادہ معظم سے طے ہوا تھا مغلوں کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے اس کی بنیاد اخلاقی نہ تھی بلکہ اس سے قطب شاہی سلطنت کو صریح دھوکا دینا مقصود تھا، مغل سلطنت نے اس سے بے حد فائدہ حاصل کر لینے یعنی اپنی من مانی شرطیں منوالیں اور مطالبات پورے کر والیے۔ بقایا پیش کش اور تاوان جنگ وصول کیا۔ لکھنؤ اور برہمپور کے شاداب پرگنوں جن کی مغل سلطنت زمانے سے عہدیدار تھی چین لیے اور اس کے علاوہ سلطنت کے ہندو وزراء اکتا و مادنا کا جن سے مغلوں کو بہت ڈر تھا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور ظاہر ہے کہ ان ہندو وزراء کے مرتبے سے اب قطب شاہی سلطنت میں کوئی چیز مغل مفاد کے سدا راہ نہ تھی ان واقعات سے شہنشاہ کو اس قدر اطمینان تھا کہ اس نے تمام مغل فوجیں جو گوکندے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی گئی تھیں واپس بلا لیں اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ گوکندے سے اطمینان حاصل کر کے مغل حکومت نے بیجاپور کے خلاف اپنی تمام طاقت لگا دی اور گوکندے کی وجہ سے فوجی طاقت اس قدر منتشر تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے بیجاپور کی تسخیر بہت مشکل ہو رہی تھی لیکن ان قائدوں کے باوجود مغل سلطنت نے اس معاہدے کا کوئی پاس نہیں کیا بلکہ چند روز کے بعد ہی جبکہ وہ بیجاپور کی ہم سے خارج ہو گئی تو اس معاہدے کے پرچھے اڑا دیے۔ برخلاف اس کے قطب شاہی سلطنت کو بہت نقصان پہنچا، کیونکہ وہ مغلوں کے دلی ارادے سے بالکل واقف نہ تھی اور آخر وقت تک سمجھتی تھی کہ معاہدہ ایک اخلاقی بنیاد پر مبنی ہے جس طرح گوکندے سے اس کی پابندی ہو رہی تھی اسی طرح مغلوں سے پابندی کی جائز توقع تھی، اور غالباً اس معاہدے کو



زیادہ خوشگوار و مستقل بنانے کے لیے محل کی بیگم نے جواکنا و مادنا کے قتل کی ذمہ دار تھیں ان ہندو وزراء کے سر  
شہنشاہ کے پاس بھیجے تھے تاکہ یہ خوش ہوں اور پھر گولکنڈہ پر حملہ نہ کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ اس معاہدے کے لیے دل سے تیار نہ تھے، اس کو سچی طور پر منظور تو کر لیا جو نظم و نسق کا  
اقتضا تھا لیکن دل سے خوش نہیں ہوئے بلکہ درپردہ شہزادہ معظم اور بہادر خاں کی طاعت کی کہ انہوں نے کیوں یہ  
معاہدہ منظور کر لیا۔ کیونکہ اس مہم سے شہنشاہ کی اصل غایت گولکنڈہ کی تسخیر تھی جو پوری نہیں ہوئی لیکن اس معاہدے سے  
شہنشاہ کو بیجا پور کی فتح تک سانس لینے کا موقع مل گیا، اور اس وجہ سے اس نے چند روز جبکہ بیجا پور کا محاصرہ  
جاری تھا سکوت اختیار کیا، اور قطب شاہی سلطنت کو دھوکے میں رکھا۔ پہلے تو سعادت خاں کو حاجب کی خدمت پر  
ماہور کر کے گولکنڈہ بھیج دیا تاکہ معاہدے کے مطابق تاوان اور پیشکش وصول کرے اور اس کے بعد سعادت خاں  
کے بھائی مرزا محمد کو جو نعمت خان عالی کے خطاب سے مشہور ہے اس غرض کے لیے علیحدہ بھیجا کہ وہ بہ ظاہر ابوالحسن سے  
دو الماس ربیع خوش قطع شفاف بہ طور پیشکش وصول کرے، لیکن اس کو درپردہ یہ ہدایت کی گئی کہ ابوالحسن کے ساتھ  
سخت کلامی کر کے اس کو گستاخی اور لڑائی پر آمادہ کرے تاکہ برائے ما جھتے و دست آویزی بہرہت تنجیہ و  
استیعال او بارشہ<sup>۱</sup>

۱۲ ستمبر ۱۵۹۹ء میں بیجا پور فتح ہوا اس فتح کے بعد محل فوج گولکنڈہ کی تسخیر کے لیے فارغ ہو گئی۔ چنانچہ  
شہنشاہ اورنگ زیب ۲۹ محرم، ۱۰۳۰ھ، اکٹوبر کو حیدرآباد کے ارادے سے روانہ ہوئے اور آہستہ سفر کرتے ہوئے

۱۔ منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۱۳۔

۲۔ شہنشاہ کا یہ حربہ بے کار ثابت ہوا کیونکہ ابوالحسن نعمت خاں سے کم لائق نہ تھا اس نے ہر اعتراض کا  
ایسا جواب دیا کہ نعمت خاں کو ہار مانتی پڑی اور وہ ابوالحسن کا قائل ہو گیا۔ (منتخب اللباب جلد دوم  
ص ۱۸۷ تا ۲۹۵)۔

پہلے گلبرگ پہنچے اور وہاں درگاہ حضرت بندہ نواز صاحب کی زیارت کی اور اس کے کئی روز کے بعد میدان آئے، اور حیدر آباد آنے سے پہلے سعادت خاں حاجب گولکنڈہ کو حکم ہوا کہ ابوالحسن سے زریعہ پیش کش وصول کرے۔ فرمان میں تحویف کے ساتھ تسلی کے الفاظ بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ پچھلے معاہدے کے مطابق بقایا وصول طلب تھا، لیکن اس وقت اس فرمان سے بقایا پیش کش وصول کرنے سے زیادہ ابوالحسن کو صریح دھوکا دینا مقصود تھا کہ گویا گولکنڈے سے کوئی پرہاش نہیں ہے اور وہ مقابلے کی تیاری نہ کرے۔ اور اس کا اندازہ اس فرمان سے بھی ہوتا ہے جو سعادت خاں کے نام درپردہ آیا تھا، اور اس کو راز میں شہنشاہ کی نقل و حرکت کی اطلاع کر دی گئی اور گولکنڈے کی حکومت صریح دھوکے میں تھی۔ اس نے مصلح کی امید میں پیش کش بھیجنے کا انتظام کر لیا چونکہ ابوالحسن کے پاس نقد روپیہ نہیں تھا، اس لیے اس نے زردجواہر اس کی فوری پابجائی کی، یعنی اس نے زردجواہر سے بھرے ہوئے نو خوانچے سعادت خاں کے پاس بھیجے تاکہ یہ نقد روپیہ وصول ہونے تک یہ طور امانت رکھے جائیں گو ان کی قیمت کا تعین بھی نہیں ہوا تھا لیکن تخمینہ یہ ہے کہ یہ زردجواہر وصول طلب نقد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ ابوالحسن کو اس انتظام سے اس قدر اطمینان تھا کہ وہ مدافعت کی باضابطہ تیاری بھی نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ ہزار ہا روپیے کے زردجواہر ٹھیکے سے دشمن کے ہاتھ چلے گئے جو اڑے وقت خود گولکنڈے میں کام آتے۔ ظاہر ہے کہ اس ارسال پیش کش سے شہنشاہ کی نقل و حرکت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ شہنشاہی جلوس گلبرگ کی طرف برابر بڑھ رہا تھا یہ ایسی متوحش خبر تھی کہ اس سے قلب شاہی حکومت بہت پریشان ہوئی۔ کیونکہ خوانچے شہنشاہ کے پاس جا چکے تھے یا سعادت خاں نے

۱۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۲۳۔

۲۔ محمد ساقی کہتا ہے کہ ابوالحسن اس قدر پریشان ہوا کہ۔

”چوں تصویر رو بہ دیوار ماند۔ لب از خندہ نو مید۔ چشم از گریاں سرشار۔ سر از ہوش

خالی۔ زباں از گفتگو بے کار۔“ (دائرہ عالمگیری ص ۲۸۷)۔

یہ الفاظ بہت مبالغہ پر مبنی ہیں۔ ابوالحسن ایسا مستقل مزاج بادشاہ تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر متزلزل نہیں ہوا۔

اپنے پاس چھپا رکھے تھے اور جب خود ابو الحسن نے واپس طلب کیے تو سعادت خاں نے کہا کہ یہ خواجہ شہنشاہ کے پاس بھیج دئے گئے ہیں۔ لڑائی کی لڑائی ٹھیری اور زر و جواہر بھی واپس نہیں ملے۔

۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۷ھ میں شہنشاہ گولکنڈہ سے دو فوجیں پر پہنچ گئے اور ابو الحسن قطب شاہ نے نہایت انگسار کے ساتھ صلح کرنی چاہی لیکن شہنشاہ کی نظر میں اس کی اتنی برائیاں تھیں کہ اب صلح ممکن نہیں تھی جب صلح کی کوئی صورت نہ تھی تو ابو الحسن نے مدافعت کی تیاری کی یثرزہ خاں شیخ منہاج اور مصطفیٰ خاں لالہ کو جس کا اصل نام عبدالرزاق لاری تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہدایت کی لیکن ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ اگر مغلوں کو شکست ہو جائے اور شہنشاہ گرفتار ہوں تو ان کو مارنا نہیں بلکہ نہایت احترام کے ساتھ لانا۔ ۱۰۹۷ھ میں لڑائی شروع ہو گئی اور مغلوں نے ۲ ربیع الاول کو قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں بہت تیزی تھی۔ ۱۹۰۰ برقد از ۴۰۰۰ شام ۱۰۶ توپیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ ان کے سترہ بڑی توپیں تھیں جو چار سیر سے لیکر چالیس سیر وزنی گولے پھینکتی تھیں۔ ۸۰۹ من بارود ۱۲۴ گولے اور خندق بھرنے کے لیے پونے چار لاکھ تھیلے موجود تھے جہاں شگن خاں ایک ایرانی میر آتش۔ فیروز جنگ سپہ سالار۔ شاہ عالم کمان دار مقرر ہوئے۔ فیروز جنگ کے باپ خواجہ عابد بھی فوجوں کی رہنمائی میں شریک تھے۔

۱۔ مآثر عالمگیری ص ۲۸۸۔

۲۔ ابو الحسن کی درخواست صلح پر حسب ذیل فرمان نافذ ہوا تھا:-

اگرچہ افعال قبیح آن بدعات بت از احاطہ تحریر بیرون است اما از صدیکے و از بسیار اندکے بشمار می آید اولاً اختیار ملک و سلطنت بہ کف اقتدار کافر قاہر ظالم دادن و سادات و مشایخ و فضلا و راسخوں و مغلوب او ساقی و در رواج فسق و فجور بہ افراط علانیہ کوشیدن و خود از بادہ پرستی بہ ریاست و بدستی دولت در انواع کبائر شب و روز مستغرق بودن بلکہ کفر از اسلام و ظلم از عدل و فسق از عبادت فرق نہ نمودن و دلاعت کفار

۲۷ دسمبر کو سخت خونریز لڑائی ہوئی اور مغللوں کے نامور سردار ابوالکلام سیب اللہ بابر بھی پڑے۔ کشتہ سنگھ اور کرشنا سنگھ جیسے راجپوت سردار کام آئے قلعے سے شدید آتش باری ہوتی تھی۔ قلیچ خاں خواجہ عابد کا توپ کے گولے سے انتقال ہو گیا، اور شاہ عالم نے پھر کوشش کی کہ ابوالحسن سے صلح ہو جائے اور اس سلسلے میں قلعے سے کچھ مراسلت بھی ہوئی۔ چونکہ شہنشاہ شاہ عالم سے ناراض تھے اور جب ان کو ابوالحسن کی مہاسات کا حال معلوم ہوا تو اور ہر طرف ختم ہونے اور شاہ عالم اور ان کی بیوی کو نظر بند کر دیا اس کے بعد فیروز جنگ پر ہی محاصرے کی پوری ذمہ داری تھی کیونکہ ان پر شہنشاہ کو پورا اعتماد تھا اس کے برخلاف صفت شکن خاں میر آتش اور روح اللہ خاں بخشی قابل اعتماد نہیں سمجھے جاتے تھے جب محاصرہ شروع ہوا تو قلعے کے باہر بھی بہت بڑی فوج مغلوں کی مزاحمت کے لیے تھیں تھی اور یہ کوئی چالیس ہزار بتائی جاتی ہے یہ شیخ نظام اور مصطفیٰ خاں کی سرکردگی میں اس پھرتی سے حملہ کرتی تھی کہ

حربی اصرار و زیدن و خود را در عدم اطاعت ادا مرد مناہی الہی خصوص در بارہ  
منع معاونت دارا کوہی کہ نص کلام مجید بہ تاکید واقع شدہ نزد خلق و خلایق  
مطعون ساختن چنانچہ مکر دریں باب فرامین نصیحت آمیز مصحوب مردم آداب دانی  
مزاج گرفتہ حضور صادر شد۔ و پنبہ غفلت از گوش زد کشید بلکہ دریں تازگی فرستادن  
لک ہون برائے سبھائے بد کردار بہ عرض رسید۔ بہ این ہمہ غرور و مستی نازہ ناکامی  
نظر بر افعال و زشتی اعمال نمود نہ نمودن و امید رسنگاری در ہر دو جہان داشتن۔  
ز بے تصور باطل ز بے خیال محال۔ (خانی خاں جلد دوم ص ۳۲۸)۔

۷۔ شاہ عالم اور ان کی بیوی شروع سے قطب شاہی سلطنت کے بہت ہمدرد تھے اس لیے شہنشاہ کو ہموار کرنے کے لیے ابوالحسن نے بھی ان سے کام لیا، اور شاہ عالم نے ابوالحسن سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن اس طرز عمل سے شہنشاہ ناراض ہو گئے۔

ان کی مدافعت بہت مشکل ہو جاتی تھی اور اس دار و گیر میں اکثر مغل فوجیں کام آئیں اور خانی خاں کے الفاظ میں کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ بعد ہائے کار طلب بادشاہی تلف نہ شد۔ اس دوران میں فیروز جنگ نے قلعے پر ایک شیخون مارنے کی کوشش کی اور ۱۲ مئی کو فصیل پر زینے لگا دیے اور اوپر سے پھینک کر چڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ پہرے والے تمام مست خواب تھے لیکن ان کی آہٹ سے ایک کتا بھونکنے لگا اور اس کی آواز سے تمام چوکیدار جاگ گئے اور ان لوگوں نے رستے کاٹ دیے اور زینے پھینک دیے اور حملہ آوروں کو ایسا ہلکیل دیا کہ دو مغل تو فوراً مر گئے اور بعد کو بند وقوں کی زد سے بہت سے مغل سپاہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ فیروز جنگ کا یہ حملہ بری طرح ناکام ہوا۔ ابوالحسن نے اس کتے کی جس کے بھونکنے سے مغلوں کو شکست ہوئی تھی بڑی عزت کی اس کے گلے میں سونے کی زنجیر باندھی اور اس کو ”سہ طبقہ خطاب دیا“ مغلوں کی شکست سے فائدہ اٹھا کر قلعے والوں نے ان کے توپخانے پر حملہ کیا اور بہت سے توپچیوں کا خاتمہ کر دیا۔

شعبان کے وسط تک محاصرے کے چار مہینے ہو چکے تھے اور مغل فوج کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، کیونکہ دو سال سے دکن میں بارش نہیں ہوئی تھی، دوسرے سنبھاجی نے گولکنڈہ کی تائید میں ہر طرف کھیت جلا کر خاک کر دیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مغلوں کو فائدہ ملنا بہت دشوار ہو گیا، اور جب رجب کے مہینے میں بارش شروع ہو گئی تو آمد و رفت اور غلے کی فراہمی بہت دشوار ہو گئی اس کے علاوہ مسلسل بارش کی وجہ سے توپوں کے دمدے اور اور مورچے سب تباہ ہو گئے اور محاصرین کا بہت نقصان ہوا، اس سے قلعے والوں کو بہت موقع ملا، انھوں نے ۵ ارجون کو مغلوں کے مورچوں اور توپخانوں پر اس قدر زور سے حملہ کیا کہ مغل پریشان ہو گئے، توپوں کے سوراخوں میں کیلے ٹھونس دیے، تمام بارود چیرالی اور پھر مغل انیسویں پر دھاوا بول دیا۔ سلیم خاں اور صف شکن خاں نے گڑھوں میں

۱۔ چونکہ فیروز جنگ کو ”سہ طبقہ خطاب“ یعنی خاں بہادر جنگ حاصل تھا، اس نے اس کے مقابلے میں کتے کو بھی یہ خطاب دیا تھا۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۴۔

مُنڈ چھپایا جھشید خاں پہلے سے بھاگ گیا تھا۔ عزیز خاں نے اپنے کو چھپانے کے لیے مَنہ پر کھیڑ لگا کر ایک گلی میں دوڑن ہو گیا تھا کہ یہ اور سربرہ خاں دونوں گرفتار ہو گئے اور قلعے میں پہنچا دیے گئے، گو قلعے میں قطب شاہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا اس کے باوجود شہنشاہ گولکنڈے کی تسخیر پر تلے ہوئے تھے۔ حالانکہ اکثر صداقت پسندوں کو رائے اس کے خلاف تھی چنانچہ جب قاضی شیخ الاسلام سے ہم بیجا پورا اور گولکنڈے کے متعلق استفسار کیا گیا تو اس نے نہایت جرات کے ساتھ یہ رائے دی تھی کہ شہنشاہ کے لیے ان اسلامی سلطنتوں پر حملہ کرنا بائز نہیں ہے۔ اس پر شہنشاہ بہت خفا ہوئے اور وہ اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر جاز چلا گیا۔ قاضی عبداللہ جو اس کی جگہ مامور ہوا تھا، اس نے بھی یہی رائے دی کہ ابوالحسن مسلمان ہے اس کے خلاف یہ دار و گیر جائز نہیں ہے۔ یہ قاضی ہی بہت محبوب ہوا، اور اس پر دربار کی آمد و رفت موقوف ہو گئی۔

محاصرے میں جبکہ چار مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے ابوالحسن نے پھر ایک مرتبہ معافی کی درخواست کی وہ یہ بھی کہ۔

”جناب قلعہ آپ کے تصرف میں آجائے تو اس ملک کا انتظام کسی اور امیر کو سپرد کرنے کی بجائے مجھے سپرد کیا جائے کیونکہ یہ ملک بہت پامال ہو گیا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ محنت درکار ہے اور اس کام سے مجھے جو ہمدردی ہو سکتی ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتی اور اس کے معاوضے میں کثیر رقم ادا کروں گا، یعنی جب آپ اس سرزمین میں تشریف لائیں گے تو ہر منزل پر ایک کروڑ روپیہ ادا کروں گا، اور اس وقت قلعے پر جتنی یورشیں ہوئی ہیں ان کے مطابق ایک کروڑ روپیہ بطریق نثار ادا کروں گا اور یہ سب کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کا ناحق خون ہو رہا ہے اور یہ مال و عیال سے ...“

محروم ہو رہے ہیں۔

یہ درخواست منظور ہونا تو کجا یہ قول خانی خاں :-

”در جواب کلمات ناصواب لغو فرمودند کہ اگر ابوالحسن از فرمودہ و حکم بایرون نیست“

بعد اہ کہ دست بستہ حاضر شود یا سرگردن او بستہ حاضر سازند“

کیونکہ اب شہنشاہ کو یہ فکر آپڑی تھی کہ مغل سلطنت کا دقار غایب نہ ہو جائے، وہ کسی طرح گولکنڈے کو مسخر کر ہی لینا چاہتے تھے۔

اس کے بعد محاصرہ سخت کر دیا گیا، اور قلعے کے ارد گرد مورچے باندھ کر توپوں کے ذریعے یورش ہونے لگی اور  
فصیل میں کئی مرتبہ نقب لگا کر بارود کے ذریعے اڑانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اہل قلعہ کی باخبری اور عبدالرزاق لائی کی  
رہنمائی سے مغلوں کو سخت پسپائی ہوتی تھی، چنانچہ ۲۰ جون کو سرنگس اڑانے کا جواہت تمام کیا گیا تو اس کا یہ حشر ہوا کہ  
جن فصیلوں میں نقب لگا کر بارود بھر دی گئی تھی قلعے والوں نے بہت سی بارود خارج کر دی اور کچھ بارود کا رخ  
مغل فوج کی طرف پھیر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب سرنگ اڑی تو قلعے کی فصیل کو تو کوئی دھکا نہیں لگا، بلکہ  
بارود کے دھماکے اور پتھروں کے اڑنے سے اُلٹے مغلوں کے کوئی گیارہ سو آدمی ہلاک ہو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے  
ان میں ڈواویلائے کشتہ شدن و زخمی گردیدن و دست و پا باختن“ بلند ہونے لگا۔ اس سے دشمن کو اور موقع ملا،  
چنانچہ اس نے قلعے میں سے یورش کی اور بہت سے مغل یتیم ہوئے جن خندقوں پر مغل قابض ہو گئے تھے ان کو  
دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسری مرتبہ سرنگ اڑائی تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے ہوا تھا۔  
پہلے ایک ہزار مغل مرے اور اس سے مغل کیمپ میں اس قدر یوسی چھا گئی کہ تمام مغل سپاہی گولکنڈے سے بھاگنا

چاہتے تھے اور یہ آرزو مند تھے کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لیے خود شہنشاہ فیصل کے قریب آئے اور محاصرے میں حصہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود قلعہ کشانی نامکن تھی، کئی مغل افسر مر گئے اور غازی الدین خاں فیروز جنگ جو اس تمام محاصرے کی روح رواں تھے اور ان کے ساتھ رستم خاں و دلپت راؤ بندیلہ بری طرح زخمی ہوئے اور اہل قلعہ کا یہ حال تھا کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ نہ صرف حملہ کرتے بلکہ مغلوں کی توپوں کو اس پھرتی سے قلعے کے اندر لیجاتے تھے کہ مغل حیران رہ جاتے تھے اور قلعے سے بان و بند و قوں کی اس قدر بارش ہوتی تھی کہ ایک انچ آگے بڑھنا نامکن تھا۔ غالباً محصورین کی مستعدی کا اصل باعث خود ابوالحسن قطب شاہ تھا جس نے آخری دم تک ہمت نہیں ہاری اور غازی خاں کے الفاظ میں ”ابوالحسن سنگ دل دل از حصار گولکنڈہ بر نمی کند“ یہ ابوالحسن کی مستعدی تھی کہ بعض بے دفاؤں کے سوا عام اہل قلعہ آخری دم تک رڑتے رہے۔ اسی دوران جنگ میں گھٹا ٹپ بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گولکنڈہ کی فوجیں تو محفوظ تھیں، برخلاف اس کے مغل فوج کے لیے کوئی سایہ نہ تھا اور ان کو راستہ ملنا مشکل ہو گیا، اور ہر طرف اتنا پانی بھر گیا کہ توپخانے بہہ گئے۔ نالے اس قدر بھر پور چل رہے تھے کہ عبور و مرور دشوار تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر قطب شاہی فوجیں حملہ کرتی تھیں اور نوپیں قلعے میں لیجاتی تھیں، مغلوں کی مزاحمت بہت ناکام ہوتی تھی۔ اسد خاں وزیر اعظم اور شہزادہ کام بخش نے بہتری کوشش کی لیکن ان کی ایک بھی نہیں چلی۔ ۲۱ جون کو ایک اور سڑنگ اڑانے کی بے سود کوشش کی گئی، وہ اس وجہ سے نہیں اڑی کہ اہل قلعہ نے تمام بارود نکال لی تھی۔ مغل سپاہی ناکام واپس آ گئے۔ اور شہنشاہ بھی جو اس دوران میں محاصرے کو پُر زور بنانے کے لیے فیروز جنگ کے عجیبے میں آ گئے تھے، چپ چاپ اپنے خیمے میں واپس

۱۔ غازی خاں جلد دوم ص ۳۵۲۔

۲۔ غازی خاں جلد دوم ص ۳۵۴۔

۳۔ مآثر عالمگیری ص ۲۹۵۔



ہو گئے مگر چہ۔ ارجوانی کو شہزادہ اعظم اور روح اشد خاں کی سرکردگی میں نئی فوجیں آگئیں اور گولکنڈہ کا مشہور جنرل شیخ مہناج مغلوں سے بل گیا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ قحط اور دبا سے علیحدہ جان عذاب میں تھی۔ جنگ کے علاوہ ان آسمانی مصیبتوں سے لوگ علیحدہ ہو رہے تھے، کہا جاتا ہے کہ ندی نالے مکانات سب مردوں سے پٹے ہوئے تھے، چو طرف لاشوں کے پشتے نظر آتے تھے اور ان کو ندی، نالوں میں بہا دیا جاتا تھا، اور یہ بھیاں کھنڈ ہر روز دکھائی دیتا تھا۔ اکثر مغل سپاہی جو ان مصیبتوں سے بیزار ہو گئے تھے قطب شاہی حکومت سے بل گئے۔ شہنشاہ نے آخری کوشش یہ کی کہ قلعے کے ارد گرد لکڑی اور مٹی کی ایک دیوار بنائی اور نئے سورجے کھڑے کیے اور شہزادہ اعظم آیا تو اس کو سب سالار بنادیا، کیونکہ فیروز جنگ بہت زخمی ہو گئے تھے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا! اس مایوسی میں بالآخر اس بات پر غور ہوا کہ قلعے کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ابوالحسن چند دوزاؤں پر دہشیں رہے، باقی تمام سلطنت پر قبضہ کر لینا چاہیے، چنانچہ حیدر آباد کا نام دار ابھارا رکھا گیا، اور تمام سلطنت میں شہنشاہ کے نام کا خطاب پڑھایا گیا۔

اگر یہی صورت حال رہتی تو ظاہر ہے کہ قلعے کی تسخیر ہمیشہ کے لیے ناممکن ہو جاتی کیونکہ اب مغلوں کے پاس بھی ایک صورت باقی تھی کہ یہ چپ چاپ مہینوں تک محاصرہ کیے ہوئے پڑے رہتے اور اہل قلعہ کو رسد کی قلت کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتے، مگر مغلوں کے لئے اول تو مہینوں تک محاصرہ کیے ہوئے پڑے رہنا ناممکن تھا، دوسرے اہل قلعہ بھی خاموش نہیں تھے، بلکہ دشمن کو تھکانے اور بیزار کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے اور ان کا سیلاب یورشوں کے مقابلے میں بالآخر مغلوں کو محاصرہ اٹھادینا ضروری ہوتا، لیکن اہل قلعہ کی بے وفائی کی وجہ سے

۱۔ شیخ مہناج کو ہفت ہزاری منصب اور تقرب خاں خطاب ملا۔

۲۔ آثار عالمگیری ص ۲۹۵۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۳۷۔

۳۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۵۸۔

بالآخر مغلوں کی مرادیں برائیں۔ شروع سے ہی جبکہ ابراہیم سپہ سالار مغلوں سے مل گیا، اکثر بے وفا قلعہ چھوڑ کر مغل ملازمت اختیار کر رہے تھے، چنانچہ اس منزل پر متعدد اہل قلعہ روگرداں ہو گئے اور مغل ملازمت اختیار کر لی۔ اب قلعے میں مصطفیٰ خاں لاری، اور عبداللہ خاں بنی دو جنرل باقی رہ گئے تھے جن پر قلعے کی مدافعت کا دار و مدار تھا اور آخر شوال تک جبکہ محاصرے کو آٹھ مہینے ہو چکے تھے یہ لوگ محاصرہ قلعے کے مدافعت کر رہے تھے، لیکن اس عین وقت میں جبکہ مغل مایوس ہو گئے تھے عبداللہ خاں بنی بھی باغی ہو گیا، اور مغلوں سے ساز باز کر لی، یعنی مغل فوج کے داخلے کے لیے قلعے کا دروازہ کھولنے تیار ہو گیا۔ یہ بے وفائی کی آخری کڑی تھی اگر یہ غداری سرزد نہ ہوتی تو قلعہ فتح نہیں ہوتا، کیونکہ قلعے میں مصطفیٰ خاں جیسے وفادار لوگ ابھی موجود تھے اور مدافعت کا خاطر خواہ سامان تھا۔ اگر عبداللہ خاں قلعہ چھوڑ کر مغلوں سے مل جاتا تو اس سے قلعے کو نقصان نہیں پہنچتا۔ مشکل یہ ہوئی کہ اس شخص نے قلعے کے اندر رہ کر دشمن کے روبرو دروازہ کھول دیا چنانچہ ۲۴ روز یقعدہ کو مغل فوج کھڑکی سے رات کو قلعے کے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے بعد مدافعت کی تمام تدبیریں لا حاصل ثابت ہوئیں۔

عبداللہ خاں کے اشارے پر ۲۴ روز یقعدہ ۹۸۶ھ ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو شب کے تین بجے مغل فوج دروازے میں داخل ہو گئی جو کھلا رکھا گیا تھا اور نگ زیب کے مشہور سپہ سالار روح اللہ خاں بہ محنت رخاں۔ رنمسیب خاں۔ صف شکن خاں اور بجاں نثار خاں اندر آ گئے اور محل کی طرف بڑھنے لگے۔ شہزادہ اعظم ہاتھی پر سوار باہر کھڑا ہوا تھا، ان لوگوں کے اندر آتے ہی قلعہ فتح ہونے کا شور ہوا، اور باہر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ یہ خبر پاتے ہی عبدالرزاق لاری جس کا مصطفیٰ خاں خطاب تھا فوراً مدافعت کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ

---

سے۔ عبدالرزاق لاری جس کا مصطفیٰ خاں خطاب تھا، ہندوستان میں شہرت دوام کا مالک ہے۔ اس شخص کی وفاداری ضرب المثل ہے، گو بہت سے باغی قطب شاہی حکومت سے روگرداں ہو کر مغل حکومت سے مل گئے، لیکن آخر دم تک اپنی وفاداری پر اڑا رہا، اس کی حمیت اور جذبہ وفاداری اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ

اس بدحواسی میں مسلح ہونے کا کہاں موقع تھا، لیکن اس ٹھوڑے سے وقت میں جس قدر اس سے ہوسکا ہاتھ میں تلوار اور سپرے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا، اور بارہ آدمیوں کے ساتھ مدافعت کے لیے آگیا۔ اگرچہ اس سیلاب کو دھکیلنا عبدالرزاق اور اس کے بارہ ساتھیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ نیز اس کے بارہ ساتھی بھی اس داروگیر میں ایسے منتشر ہو گئے کہ ان کا پتا نہیں چلا، لیکن اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ مردانہ وار دشمن پر جاگرا، حالانکہ خافی خاں کے الفاظ میں اس کی حالت: ”مانند قطره بہ دریا اقتد یا ذرہ کہ باخور رشید ہمسری نماید“ کی سی تھی۔ ایک دیوانے کی طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ: ”تاجان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود“ ہزار ہا آدمیوں سے تنہا مقابلہ کرتا رہا، چنانچہ اس داروگیر میں اس کے بدن پر اتنے زخم لگے تھے کہ ان کی گنتی نہ تھی، صرف چہرے پر بارہ زخم آئے تھے اور غشی کی حالت طاری ہونے لگی تھی، بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ گھوڑے کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی

اپنی سلطنت سے پھر جانے۔ قلعے کی گرتی ہوئی حالت اور مغلوں کی ترغیبوں کے باوجود اس کے پائے استقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا جس وقت عبداللہ خاں سے مغلوں کی سازش ہو رہی تھی شہنشاہ کے جاسوس شش ہزار می منصب و شش ہزار سوار اور دیگر عنایات کے وعدے لیکر اس کے پاس بھی آئے لیکن نہایت غصے میں اس نے شہنشاہ کا ترغیبی فرمان شہنشاہ کے آدمیوں کے سامنے چاک کر دیا، اور:۔

”جواب داد کہ این جنگ بلا تشبیه بجنگ کر بلا میماند عبدالرزاق  
امیدوار است کہ تا نفس باقی است در جوگہ بست دو ہزار سوار کہ  
با امام بیعت نمودہ آخر تیغ بر روئے آن شہید کر بلا کشیدند  
در نیاید بلکہ منجملہ ہفتاد و دو تن سرخسروی دنیا و آخرت

حاصل نماید“ (خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۰۔)

۱۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۲۔

اور اگرچہ اس نے بہ مشکل اپنے گھوڑے پر سنبھالے رکھا لیکن گھوڑے کے اختیار میں تھا، اور خود گھوڑا جو زخموں سے کانپ رہا تھا سوار کو آہستہ آہستہ نگینہ باغ میں لایا، اور ایک پیرائے ناریل کے درخت کے قریب کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالرزاق اسی درخت کا ٹیکہ لیکر زمین پر گر پڑا تاکہ کچھ آرام لے دوسری صبح کو حسینی بیگ کے آدمی اتفاق سے وہاں پہنچے۔ عبدالرزاق اور گھوڑے کی بعض علامتوں سے اس کو پہچان گئے اور اس کو اپنے گھر پہنچا دیا چنانچہ اس کے عزیز واقارب نے اس کی مرہم پٹی کی۔

مغلوں کا قلعے میں اچانک داخل ہونا بالکل خلافت توقع تھا! اس خبر سے تمام قلعے میں ایک ہڑت مچ گئی اور ہر شخص ایک اضطراب میں نظر آ رہا تھا، کیونکہ قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ تھا۔ اس پُرانی سلطنت کے ہمدرد یہ سمجھتے تھے کہ قطب شاہی سلطنت کے دن پھر نہیں پلٹ سکتے، لیکن اس عالم اضطراب میں ابوالحسن قطب شاہ سے جو غیر معمولی غماط جمعی اور استقلال کے جذبات ظاہر ہوئے وہ قطب شاہی تاریخ کے بہت دھچپ اور سبق آموز واقعے تھے کسی اور تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ چونکہ تین بجے شب کو مغل فوج قلعے میں داخل ہو گئی تھی ظاہر ہے کہ اس وقت بادشاہ سوریہ تھے، جب ان کو قلعہ فتح ہونے کی خبر ملی تو یہ اٹھے اور پہلے اند جا کر محل والوں کو دلاسا دیا کہ وہ پریشان نہ ہوں اور سب سے نصحت چاہی اور پھر پورے اطمینان قلب کے ساتھ وہ اپنے شاہانہ لباس میں دیوان خاص میں آئے اور حسب عادت اپنی مسند پر بیٹھ گئے اور ان ناخواند مہمانوں کا انتظار کرنے لگے جو ان کو گرفتار کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ اور آخر وقت تک اپنی بادشاہی کے پورے فرائض ادا کیے۔ گویا حکومت کا جائزہ دینے تک وہ سلطنت کے بادشاہ تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ملازمین سے کہا گیا تھا کہ جب ناشتے کا

لے۔ خافی خال جلد سوم ص ۳۶۳۔

لے۔ ۱۰ ماہ نامہ کا موصوف بیان کرتا ہے کہ جب مغل فوج قلعے میں داخل ہوئی تو ابوالحسن گانا سن رہا تھا (ماہ نامہ ص ۱۳۸) اور ایشور داس کہتا ہے کہ ابوالحسن گانا سن رہا تھا اور جب قلعے میں شور ہوا تو گائین خاموش ہو گئی تو ابوالحسن نے

وقت ہو تو حسب معمول کھانا لائیں، چنانچہ بادشاہ کے حکم کے مطابق شاہی دسترخوان چُن دیا گیا۔ اسی دوران میں مختار خاں اور روح اللہ خاں اور دیگر مغل افسر ابو الحسن کو لینے کے لیے آگئے جب یہ لوگ سامنے آئے تو بادشاہ نے سبقت کر کے پہلے سلام علیک کہا، لیکن اپنی مسند پر بیٹھے رہے اور شاہانہ وقار میں کوئی فرق آنے نہیں دیا اور جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے بیٹھ گئے تو ان کے ساتھ نہایت گرم جوشی سے گفتگو ہونے لگی جس میں کافی فصاحت بھی تھی، ابو الحسن کے خدو خال اور بیان سے ذرہ برابر انتشار نہیں ظاہر ہوا، جب صبح ہوئی تو ملازمین نے دسترخوان کے تیار ہونے کی اطلاع دی تو بادشاہ کھانے کے لیے اُٹھے اور ان مغل امراء کو بھی دعوت دی کہ وہ کھانے میں شریک ہوں۔ بعضوں نے پس و پیش کیا، لیکن مختار خاں اور اس کے ساتھی دو ایک اور آدمی کھانے میں شریک ہو گئے چنانچہ مہمانوں کے ساتھ میزبان نے پورے اطمینان کے ساتھ کھایا۔ روح اللہ خاں کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی حیرت چھپا نہیں سکا، چنانچہ اس نے بادشاہ سے پوچھا کہ یہ کھانا کھانے کا وقت کونسا ہے؟ ابو الحسن نے اس حیرت کو نہیں سمجھا، یا جان بوجھ کر یہ جواب دیا کہ میرے کھانے کا وقت یہی ہے! روح اللہ خاں نے کہا یہ سمجھ ہے کہ آپ ہمیشہ اسی وقت کھانا کھاتے ہیں لیکن اس پریشانی میں آپ کی طبیعت کھانے کی طرف کیونکر مائل ہوئی؟ ابو الحسن نے نہایت ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ آپ کا کھانا اس طرح درست ہے کہ اس پریشانی میں کوئی کھانا نہیں کھاتا لیکن میرا حال بالکل دوسرا ہے میں راضی بہ رضا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قدرت کا فیصلہ حسب مصلحت ہوتا ہے خدائے تعالیٰ اپنی مصلحت سے ایک شخص کو بادشاہ اور دوسرے کو فقیر بنادیتا ہے۔ جس خدانے مجھے اور میرے زرگوں کو بادشاہ بنایا، اور عزت دی تھی وہ مجھ سے اب سلب کر لینا چاہتا ہے۔ بادشاہ ہونے سے پہلے میرے پندرہ سو سال تقریب میں گزرے اور اب بھی خدا کا منشاء یہ ہے کہ میں فقیر بن جاؤں۔

---

کہا گئے جا، جو محلہ مسرت میں صرف ہوا چھاپے (تاریخ اورنگ زیب جاوونا تھ سرکار جلد چہارم ص ۱۳۸۶)۔  
لیکن تین بجے شب کے گانا ہونا غلات قیاس ہے۔

اس کے لیے میں بالکل تیار ہوں اور میرے دل میں کوئی ہوس باقی نہیں اور میں خوش ہوں کہ اس سلطنت کی باگ  
جواب تک میرے ہاتھ میں تھی عالمگیر جیسے دین دار بادشاہ کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے۔

سرارات ماہستان حضرت دوست کہ ہر چہ برسر مامی رودارات دوست

اس کے بعد بادشاہ نے گھوڑا منگوایا، اور اپنے شاہانہ لباس کے ساتھ سوار ہو گئے، اور مغل افسروں کے ساتھ  
دروازے کے باہر آگئے جہاں محمد اعظم انتظار کر رہا تھا اس وقت قلعے میں واویلا مچی ہوئی تھی اور عورتیں و مرد  
بادشاہ کو جاتا ہوا دیکھ کر دھاڑیں مار کر رو رہے تھے جب مغل افسر بادشاہ کو محمد اعظم شاہ کے پاس لے گئے تو  
ابو الحسن نے موتیوں کا ہار اپنے گلے سے نکال کر محمد اعظم کے گلے میں ڈال دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد اعظم نے  
ابو الحسن کی خاص مدارات کی اور ان کو شہنشاہ اورنگ زیب کے سامنے پیش کر دیا، شہنشاہ نے اس کی

لے ماہ نامہ کا مولف کہتا ہے کہ ابو الحسن، مہابت خاں کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر گیا تھا جب یہ فتح دروازے کے  
باہر نکلا تو حضرت شاہ راجہ کی درگاہ کی طرف سجدے کرنے لگا، اس پر مہابت خاں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟  
ابو الحسن نے جواب دیا کہ حضرت راجہ نے ہی میرے سر پر تاج شاہی رکھا تھا، اور وہ اب دوسرے کے  
سر پر رکھنا چاہتے ہیں اس لیے شکریہ ادا کر رہا ہوں (ماہ نامہ ص ۳۱۹)۔

شہنشاہ کا درباری مورخ محمد ساقی کہتا ہے کہ شہنشاہ نے ابو الحسن کے تمام قصور معاف کر دیے اور  
بہت مہربانی کی اور ایک عیمے میں ٹھیرانے کا حکم دیا یہی مورخ لکھتا ہے کہ جب ابو الحسن شہنشاہ کے سامنے  
آیا تو یہ شعر پڑھا تھا۔

آخر مرا بہ خاک درت روشتاں کرد منت گداز سجدہ پیشانی خود دم دناثر عالمگیری ص ۳۰۰

لیکن ایشور داس کہتا ہے کہ ابو الحسن کو فیروز جنگ نے تخت سے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا، اور شہنشاہ کے سامنے  
لے گیا، اور ابو الحسن شہنشاہ کے سامنے سیدھا آیا، کوئی کورنش یا سلام نہیں کیا شہنشاہ نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟

عزت کی اور دلاسا دیا، اور اس کی تمام ضروریات مہیا کر دیں اور شاہی کیمپ میں ٹھیرنے کا حکم دیا۔ روح اللہ خاں اور دوسرے متصدیوں نے قلعے کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا، اور اس کی فہرست تیار کی، اس کی جملہ مالیت جواہر و آلات مرصع، ظروف طلا کے علاوہ چھ کروڑ اسی لاکھ دس ہزار روپیے تھی۔ یہ سب چیزیں شاہی خزانے میں داخل کر لی گئیں۔ اس سلطنت کے بے شمار لوگ ملازم اور عہدہ دار و پیشہ ور مغل ملازمت میں داخل ہو گئے، ان سب کو خطابات اور مناصب ملے۔ ابوالحسن کے بیٹوں کو مناصب دیے گئے اور بیٹیوں کی شادی کا انتظام کیا گیا۔ عبدالرزاق لاری مصطفیٰ خاں کی وفا داری سے شہنشاہ بہت متاثر ہوئے اور اس کے علاج کے لیے

اس پر اس نے جواب دیا کہ مجھے خوشی ہے نہ رنج۔ بلکہ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ جو چیز یہاں پر دُغیب میں چھپی ہوئی تھی وہ آنکھوں کے سامنے آگئی۔ (تاریخ اورنگ زیب جلد چہارم ص ۳۸۶)۔

۱۔ منوچی کہتا ہے کہ ابوالحسن قید کر دیا گیا تھا، اس کو ہاتھی پر بٹھا کر پہلے اعظم کے خیمے پر لے گئے، شہزادہ اعظم سو رہا تھا، اس کے بیدار ہونے تک اس کو دھوپ میں کھڑا رکھا گیا، اور بڑی منت سماجت کے بعد پینے کے لیے پانی دیا گیا۔ اعظم نے مہربانی کر کے اس کو اپنے سامنے بٹھایا، اور شہنشاہ کے پاس لے گیا۔ اعظم تو خود اندر گیا لیکن اس کو بہت دیر تک دھوپ میں کھڑا کر دیا، اس کے بعد اورنگ زیب نے اس کو قید خانے میں رکھنے کا حکم دیا، اور اس سے دریافت کیا کہ اس کے خزانے کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے سب خرچ کر دیے ہیں اور مجھے اس کا حق تھا! اس گستاخی پر شہنشاہ نے اس کو مارنے کا حکم دیا، چنانچہ مغل عہدہ داروں نے اس کو بے رحمی سے پیٹا، اور پھر اس کو دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا (منوچی جلد دوم ص ۳۰۷-۳۰۸)۔

۲۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۶۷۔

۳۔ محمد ساقی نے ایک بیٹے کا نام عبداللہ سپر خواندہ ابوالحسن بیان کیا ہے، اس کو چار ہزاری منصب و چار ہزار سوار دیے گئے تھے (ماثر عالمگیری ص ۳۰۳) غالباً یہ کوئی دوسرا شخص تھا۔ لیکن ابوالحسن کا ایک صلیبی بیٹا بھی تھا

ہندوستانی اور پورپی جراح مقرر کیے اور یہ کہا کہ اگر قلعے میں اس کے جیسا ایک اور شخص وفادار ہوتا تو قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا۔ تیرہ روز کے علاج کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور لکنت سے گفتگو کرنے لگا۔ جب شہنشاہ کو اس کی صحت کی اطلاع ہوئی تو اس کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم تمہارے قصور معاف کرتے ہیں، تم کو اور تمہارے بیٹوں کو منصب اور اعزاز دیے جائیں گے، لیکن جب عبدالرزاق کو یہ پیغام پہنچا یا گیا تو اس نے مغل سلطنت کی نوکری سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کے بیٹے عبدالقادر، عبدالکریم، رزاق علی اور خلیل محمد مختلف مناصب سے سرفراز ہوئے اور اورنگ آباد میں ان کو جاگیریں دی گئی تھیں۔

جس کا نام خدا بند یا بندہ سلطان بتایا جاتا ہے، یہ دولت آباد کی نظربندی کے زمانے میں پیدا ہوا تھا، جب یہ سن شعور کو پہنچا تو شہنشاہ کے دربار میں اس کی آمدورفت ہونے لگی چونکہ یہ قطب شاہی تاجدار کا بیٹا تھا اسی لیے پُرانے قطب شاہی ملازم دربار میں اس کی تعظیم کرتے تھے اور جب یہ دربار میں آتا اُنکے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس نظارے سے شہنشاہ بہت خائف ہوئے اور اس کو ایک نامعلوم جگہ نظر بند کر دیا، اس کا پھر پتا نہیں چلا۔ حقیقۃ العالم مقالہ اول ص ۴۱۴) اس بیٹے کے علاوہ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں جو قلعہ گولکنڈہ کی فتح سے پہلے سن شعور کو پہنچ گئی تھیں شہنشاہ نے ان تینوں کی شادیاں کر دیں۔ بڑی بیٹی سکند عادل شاہ کے ساتھ بیاہی گئی جو غالباً اچھا سنجوگ تھا، دوسری بیٹی محمد عمر کے ساتھ جو شیخ محمد نقشبندی سہرندی کا بیٹا تھا، اور تیسری بیٹی عنایت خاں ولد جملۃ الملک اسد خاں کے ساتھ بیاہی گئی (ماثر عالمگیری ص ۳۱۲)۔

لے جراحوں نے رپورٹ دی تھی کہ اس کے سر پر زخموں کی گنتی کرنا بہت مشکل ہے ویسے ستر زخم معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک آنکھ زخم سے محفوظ ہے لیکن شاید بعد کو دونوں آنکھ بیکار ہو جائیں (خافی خاں جلد دوم ص ۳۱۶)۔

لے جب شہنشاہ کا پیغام پہنچا تو عبدالرزاق لاری نے اپنے ستر علالت پر یہ الفاظ کہے تھے:-

”ہر چہ این سخت جان تا حال بر نیامدہ اما امید حیات بدیں حال معلوم۔ اگر حیات



۱۹۱۷ء ذیقعدہ کو مغل فوج قلعے میں داخل ہوئی تھی لیکن تمام تسخیر مکمل ہونے تک محرم کا مہینہ شروع ہو گیا، اس لیے گولکنڈہ کے خاتمہ ۱۹۱۸ء کا واقعہ سمجھنا چاہیئے چنانچہ میر عبد الکریم نے جس کا ملتفت خان خطاب تھا فتح گولکنڈہ مبارک باد سے اس واقعے کی تاریخ اخذ کی تھی اس سے ہی سنہ مستخرج ہوتا ہے۔ نعمت خان عالی نے ذیل کے قلعے سے اس واقعے کی تاریخ نکالی تھی:-

قطعہ

ابو الحسن داشت جامہ چار محل      کرو بیرون ازان مکان تقدیر  
چون برون رفت او بجاش نشست      شاہ اورنگ ریب عالمگیر

قلعہ گولکنڈہ سے فارغ ہونے کے بعد شہنشاہ محرم ۱۹۱۸ء میں شہر حیدر آباد آئے، تمام شہر اور شاہی عمارتوں کا

ہم شدید ست و پائے مجروح تقدیم مراسم نوکری ہم نہ تو انہم کسے کہ گوشت و پوست او  
بہ نیک ابو الحسن پرورش یافتہ باشند نوکری عالمگیر بادشاہ نتواند نمود

اس سے شہنشاہ خفا ہوئے، لیکن حکم دیا کہ جب پوری صحت ہو جائے تو مجھے اطلاع کرنا۔ جب صحت کے بعد قبول منصب کی بابت کہا گیا تو پھر اس نے یہی جواب دیا، اور حجاز جانے کی خواہش کی اس بات سے شہنشاہ بہت خفا ہوئے اور حکم دیا کہ اس کو مقید کر کے میرے ہاں پہنچایا جائے، فیروز جنگ نے بیچ بچاؤ کر کے ادھر عبد الرزاق لاری کو سمجھایا کہ وہ مان جائے اور ادھر شہنشاہ کے پاس سفارش کی۔ چنانچہ ایک سال بعد وہ قبول منصب کے لیے بڑی مشکل سے راضی ہوا، اور چار ہزاری منصب، تین ہزار سوار خان کا خطاب، گھوڑا، اور ہاتھی عطا ہوئے۔ پہلے راہیری کی اور بعد کو کن کی فوجداری دی گئی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل سے نوکری نہیں کی، چند سال کے بعد اصرار کر کے حج بیت اللہ کی زحمت لے لی اور وہاں سے واپس نہیں آیا۔ انگریزی شاعروں نے اس کی وفاداری کی تعریف میں نظمیں لکھی ہیں (ماثر الاملا جلد دوم ص ۸۱۰-۸۱۱۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۶۶-۳۶۷)۔

معاینہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ قطب شاہی تمدن اور معاشرت کے نظامت بہت متاثر ہوئے۔ گو بنگالہ ہر س کا انتہاء نہیں کیا بلکہ کہیں غیظ و غضب کا اظہار کر دیا تاکہ شاہی مملکت ہاتھ سے نہ جائے اور یہاں کی آب و ہوا اس قدر خوشگوار و طبیعت کے موافق ثابت ہوئی کہ اس شہر میں دو مہینے سے زیادہ رہ گئے اور یکم ربیع الاول ۱۰۹۸ھ کو بادل ناخواستہ بیچاپور کے ارادے سے کوچ کیا۔ بیچونگہ، بھونگلی، بونی، ناگزیر تھی۔ لیکن جانے سے پہلے حیدر آباد کے تمام ضروری بند و بست کیے اور اس کا نام دارالبھاؤ رکھا۔ پہلے عارضی طور پر روح اللہ خاں اس کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، لیکن چند روز کے بعد جاں سپار خاں کو جس کا اصل نام سید بہادر دل خاں تھا، اس خدمت کا مستقل جائزہ دے دیا گیا۔ شہنشاہ کے اس سفر میں جو حیدر آباد سے شروع ہوا تھا، ابوالحسن بھی ہمراہ رکاب تھا، لیکن جب شہنشاہ بید پٹے تو ان کے مجبوراً درخواست کی کہ مجھے کسی جگہ گوشہ نشینی کی اجازت دی جائے، چنانچہ اس درخواست پر اس کے لیے قلعہ دولت آباد تجویز ہوا۔

۱۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چار مینار کے مشرقی گوشے میں جہاں جامع مسجد کا حمام واقع ہے شہنشاہی قمر نصب ہوا تھا۔ یہیں شہنشاہ نے سکونت اختیار کی۔

۲۔ درباری مورخ نے شہر حیدر آباد کی بہت بلند الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً شہنشاہ کے بھی یہی تاثرات تھے، کیونکہ محمد ساقی جو درباری مورخ ہے کوئی چیز شہنشاہ کے نقطہ خیال کے خلاف نہیں بیان کرتا۔

۳۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۷-۳۰۸۔ خافی خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ نے ربیع الثانی کے اوائل میں حیدر آباد سے کوچ کیا تھا اس طرح ان کا قیام حیدر آباد میں تین ماہ کے قریب ہوتا ہے (خافی خاں جلد دوم ص ۳۷۱)۔

۴۔ محمد ساقی کہتا ہے کہ ابوالحسن اس قدر تن آسان آدمی تھا کہ در پانزدہ سالہ حکومت بفرگین نشہ و سواری ہر روزہ برد و شوار بود (مآثر عالمگیری ص ۳۰۹)۔ یہ عجیب نہیں ہے، غالباً اس کی خود داری اس

اور جاں سپار خاں کو حکم ہوا کہ وہ ابو الحسن کو دولت آباد میں پہنچا دے۔ غالباً ایک محافظ دستے کے ساتھ اس مظلوم بادشاہ کو قلعے میں نظر بند کر دیا گیا تاکہ وہ یہاں اپنے باقی ایام حیات گزارے۔ گو اس کی تمام ضروریات کا انتظام ہوا، اور بہ قول خانی خاں تاکیدِ احکام نافذ ہوئے کہ ابو الحسن کی تمام ضروریات خور و نوش وغیرہ کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے لیکن اس کی ضروریات کے لیے صرف پچاس ہزار روپیے سالانہ مقرر ہوئے تھے۔

ان حالات میں آخر قطب شاہوں کی دو سو سالہ سلطنت ختم ہو گئی اور آثارِ قدیمہ کے سوا ان کا کوئی شے لگا نہیں رہا۔ آج پچاس سال سے مغل شہنشاہت اس کی بیخ کنی کے درپے تھی، غالباً پہلے اس کا خاتمہ آسان معلوم ہوتا ہوگا، لیکن آخری محاصرے میں معلوم ہوا کہ اس سلطنت کا استیصال مغلوں کے لیے بہت دشوار گزار ہے اور دنیا کے مشہور محاصروں میں اس کا شمار ہونا چاہیے۔ مغلوں کی تاریخ میں قلعہ اسیر گڑھ کے بعد گولکنڈے کا درجہ ہے جو بہت صبر آزمات ثابت ہوا کیونکہ اس قلعے کی تسخیر میں بھی آٹھ مہینے لگ گئے جس طرح اکبر کو اسیر گڑھ کی

بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہمیشہ شہنشاہ کے جلوس کے ساتھ منسلک رہے، اسی لیے گوشہ نشینی کی اجازت چاہی تھی۔

۱۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۷۱۔

۲۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۹۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ابو الحسن کے ساتھ اس قدر تنگ نظری سے کیوں کام لیا گیا کیونکہ جب کچھ مہینے پہلے بیجا پور کی سلطنت فتح ہوئی تھی تو سکندر عادل شاہ کو خلعت خاصہ خنجر مرصع با علاقہ مردارید۔ پھول کٹارہ قیمت ہفت ہزار روپیہ۔ مالائے مردارید بہ آوینہ ہر قیمت سیزدہ ہزار روپیہ۔ کلفی و عصائے مرصع۔ سکندر خاں خطاب و ایک لاکھ روپیے سالانہ عطا ہوئے دوسری مرتبہ سو بیچ الماس مرحمت ہوئے تھے اور اس کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت ملی تھی، اس کے خاص ملازم اور عزیز و اقارب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ (مآثر عالمگیری ص ۲۸۰)۔

فکر دامن گیر تھی اور وہ اس کی نامی کو اپنے لیے ایک بہ نما داغ سمجھتا تھا۔ کچھ اسی طرح گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے اورنگ زیب کا حال تھا۔ کیونکہ محاصرے کی یہیم ناکامیوں میں جو مغل محاصرین کو برداشت کرنی پڑیں مغل سلطنت کے وقار اور نیک نامی کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ قطب شاہی قوتِ مدافعت مغلوں سے کم نہیں تھی، بادشاہ کی حوصلہ مندی ہر وقت محصورین کا دل بڑھاتی رہی۔ خود شہنشاہ کے الفاظ میں اگر عبدالرزاق لاری کی طرح دو ایک آدمی قلعے میں اور ہوتے تو قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا اور قلعہ کشانی بھی کچھ مغلوں کے زور بازو سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی باعث عبداللہ خاں اپنی کی بے وفائی تھی جس نے اپنے ولی نعمت کے خلاف غداری کر کے دشمن کے سامنے دروازے کھول دیے ورنہ آٹھ مہینوں کے دوران میں بار بار ایسے مواقع آئے تھے جبکہ مغل فوجوں نے ہار مان لی اور ان مصیبتوں سے تنگ آکر خود مغل سپاہی قطب شاہی حکومت کی پناہ میں جا رہے تھے۔ شہنشاہ نے بھی اس بات پر غور کیا تھا کہ قلعے کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے۔

قلعہ گولکنڈے کی تسخیر میں کوئی عافیت اندیشی نہ تھی کیونکہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہے کہ گولکنڈہ اور بیجا پور کی فتح سے مغل سلطنت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اُلٹے اس کا نقصان ہی ہوا کیونکہ جیسے بیان کیا جاتا ہے اگر ان سلطنتوں کے خاتمے سے مغل شہنشاہ کا یہ مقصد تھا کہ مرہٹوں کا استیصال کرے تو وہ پورا نہیں ہوا کیونکہ باوجود اورنگ زیب کی تمام کوشش کوشش کے گولکنڈہ اور بیجا پور کی سلطنتوں کا خاتمہ تو ہو گیا مگر مرہٹوں کی طاقت جوں کی توں رہی، بلکہ غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اورنگ زیب کے بعد مرہٹہ طاقت اس قدر ابھری کہ جنوب سے نکل کر شمال پر بھی چھا گئی اور مغل سلطنت کے اسباب زوال میں بھی یہ شریک تھی، کیونکہ ان سلطنتوں کے بے روزگار سپاہی یا تو پنڈاروں میں شریک ہو گئے یا مرہٹوں کی فوج میں داخل ہو گئے اس سے زیادہ مغل سلطنت کی اور کیا ناکامی ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر مغل شہنشاہت ان سلطنتوں کو قائم رکھتی اور مرہٹوں کے استیصال کے لیے ان سلطنتوں سے اتحاد مل کرتی تو قرائن یہ ہیں کہ یہ طریقہ عمل زیادہ مفید مطلب ہوتا، بلکہ اس طریقے سے دکن کی یہ سلطنتیں مغلوں کے ساتھ متحد رہتیں اور ظاہر ہے کہ مرہٹوں کو ان سے کوئی امداد نہیں

ملتی اور شمال و جنوب کی متحدہ طاقت آسانی سے مرہٹوں کا خاتمہ کر سکتی تھی چنانچہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت میں یہ اتحاد عمل ہوا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ جے سنگھ کے دکن آنے سے پہلے اور جنگ نرب نے مرہٹوں کے خلاف بیجا پور سے مدد طلب کی تھی اور علی عادل شاہ نے اس صدا پر لبیک کہا تھا، کیونکہ سیواجی جس طرح مغلوں کا دشمن تھا اسی طرح دکن کی اسلامی سلطنتوں کا بھی حریف تھا اور انہیں کوتاہ کر کے اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ مغل شہنشاہت نے وقت پر بیجا پور کے تعاون سے فائدہ تو اٹھایا اور اس کی مدد سے شکست دی لیکن اٹلے سیواجی سے اتحاد کر کے اسی سلطنت کے سر ہو گئی اس بد اخلاقی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سلطنتوں کو اب آئندہ مغلوں کی سرپرستی پر کوئی اعتماد نہیں رہا اور اس کی جگہ وہ باوجود نقصانات کے مرہٹوں کو اپنا ہمدرد سمجھنے کے لیے مجبور تھیں کیونکہ مرہٹے آخر دکن کی طاقت تھی، اور ان سے دکن کی ایک برادری بن جاتی مغل سلطنت نے ان عواقب پر قطعاً غور نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ اور بیجا پور کی تسخیر اور جنگ نرب کا ایک جذباتی مسلک بن گیا تھا اور یہ آج سے نہیں بلکہ اپنی شہزادگی کے زمانے سے جبکہ یہ دکن کے ناظم تھے ان سلطنتوں کو ہضم کرنا چاہتے تھے۔ گولکنڈے سے تو ہمیشہ شہنشاہ کو زیادہ نفرت رہی۔ بیجا پور کے ساتھ ہمیشہ رعایت کی گئی، برخلاف اس کے گولکنڈے کے ساتھ بہت غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا اس کا نام دارا بھادڑ رکھا، حالانکہ یہ ایک اسلامی سلطنت تھی واد الملکفرہ تھا جو قاضی شیخ الاسلام اور قاضی عبداللہ کے فتوے سے ظاہر ہے۔ خود ابوالحسن کے ساتھ بھی جو برتاؤ کیا گیا تھا وہ قابل غور ہے۔

گولکنڈے اور بیجا پور کی تسخیر سے مغل سلطنت کو نقصان پہنچا ہی تھا، لیکن دکن کو بھی ناقابل تلافی ضرب لگی، اس کے تمدن کی رفتار ترقی بہت دنوں تک رکی رہی بلکہ دکن کے بعض اقطاع تو ہمیشہ کے لیے بے چراغ ہو گئے۔ قطب شاہوں نے تلنگانے میں جو تمدن پیدا کیا تھا، اس کا بڑی طرح شیرازہ بکھریا، شام عالم کے محلے میں شہر حیدر آباد کی اس قدر افسوسناک تاخت و تاراج ہوئی کہ تمام قطب شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔ مغل قبضے کے بعد بھی شاہی محلات کی خاطر خواہ نگہداشت نہیں کی گئی، چنانچہ یہ سب براہوی کے نذر ہو گئے۔

مغل فاتح یہاں سے لاکھوں روپیے، زر و جواہر توے گئے، لیکن قطب شاہی عمارتوں کو برباد ہونے دیا۔ اس وقت حیدر آباد اور اس کے گرد و نواح میں قطب شاہی مساجد کے سو کسی محل کا پتا نہیں چلتا حالانکہ مختلف بادشاہوں کے بنائے ہوئے بے شمار محل تھے۔ داد محل، لیکن محل اور چار محل کے نام تو اہل حیدر آباد کو یاد ہیں لیکن ان کا کہیں نام و نشان نہیں۔ داد محل کو تو جس کی تمام ایشیا میں شہرت تھی، دانستہ توڑا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے قبضے کے بعد مغل گورنر یہاں مامور ہوئے تھے انھوں نے ان کی نگہداشت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے علاوہ گولکنڈہ کی آبادی بھی جس میں امیر و غریب دونوں شامل تھے بہت گھٹ گئی۔ شاہی محل کی صد ہا عورتوں نے اپنے کو باولیوں میں گرا کر خودکشی کر لی۔ قلعے کے بے شمار حبشی پہرہ دار بہ تیغ ہو گئے۔ شہر حیدر آباد کے صد ہا شرفاء، اور اہل علم جن میں زیادہ تر مسلمان تھے اور گولکنڈہ کی سرکار سے فیض پاتے تھے اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیا، اور کرناٹک کے جنوبی قصبات میں جا کر آباد ہو گئے، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی محلات کے علاوہ سینکڑوں گھر ویران ہو گئے اور آفاتِ سماوی سے منہدم ہو گئے۔ چنانچہ یہ شہر ایسا بے چراغ ہو گیا کہ حضرت غفران مآب نواب نظام علی خاں کے عہد تک جنھوں نے بالآخر اورنگ کو چھوڑ کر حیدر آباد کو اپنا پائے بنالیا، آباد نہیں ہوا لیکن بہ قول کچھی ناراین شفیق آصف جاہی سرپرستی کے باوجود اس کی ویرانی کے آثار باقی تھے۔ ویران مکانات میں آبادی نہیں ہوئی کیونکہ بہت سے خاندان

۱۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعے کے مشرقی دروازے پر تقریباً پانچ سو حبشیوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ جب قلعہ فتح ہو گیا اور مغل فوج مشرقی دروازے سے آنے لگی تو ان حبشیوں نے مزاحمت کی، ان وفاداروں نے کہا کہ جب تک ان کو قتل نہیں کیا جائے گا وہ اپنی جگہ سے قدم نہیں اٹھائیں گے، چنانچہ یہ سب اپنی وفاداری میں بہ تیغ ہو گئے۔  
۲۔ کچھی ناراین شفیق نے آصف جاہی دور میں دکن کا اسی طرح نقشہ کھینچا تھا۔

ٹیجا پور۔ برہان پور و بیدر ہر پنج بلدہ نامی کہ سابق تخت گاہ سلاطین دکن بودند

احمال کمال خستگی دارند..... مگر حیدر آباد درین ایام بنا بر چھاؤنی متواترہ

واپس نہیں آئے۔ نعمت خان عالی کے پُر درویشی سے جس میں حیدر آباد کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ اس وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ایک فاتح کے قلم سے نکلا ہے۔ نعمت خاں نے اس میں اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں اس کی اہمیت غالباً وہی ہے جو شیخ سعدی کے مرثیے کی ہے جو زوال بغداد پر لکھا گیا تھا۔ جہاں فتح گولکنڈے کی مبارک باد میں قصیدہ ہمنیت لکھے جا رہے تھے نعمت خاں نے اپنے سچے جذبات کا اظہار کیا ہے گو وہ فاتح فوج کے ساتھ قلعے کی تسخیر کے لیے آیا تھا۔

## قصیدہ شہر آشوب

درین ملک خراب موز کس را نیست سامانے      جو گنج افتادہ انداہل ہست در کنج ویرانے

بہ آن حد رسیدہ خلق را افلاس و ناداری      کہ معنی ہم ندارد این زماں حرفِ سخن دانے

سپاہی ہم بہ میدان قناعت می کند جولاں      ز شمشیر و سپہ دارد دوم آبے لب نانے

رسیدہ پان سپاری کار بے برگی و تنہولی      برائے سرخ روی چون ندارد بیڑہ پانے

تور آسا بہ خاکستر نشسته نانبایں غم      کہ از افتادن نان برہش افتاد تاوانے

رہیں اسی سال رونق تازہ دارد و گذرگاہ مردم ہمارا دور دست است ....

با وصف گذرگاہ عالم مردم از آفاق اکثر جاویران است۔ پیش ازین چند سال

سہ لک و پچاس ہزار منزل از چتہ و سفال پوش ہترہ بودند ... بحال از ان آبادی پدید

نیست۔ مگر جاہ سنگھائے آن افتادہ اند۔ ہر گاہ داد محل را شکستند۔ در عرصہ سی سال

شکست رسید ... اکثر عمارات عمدہ شہر تباہ شد ہنوز تہ خانہ ہائے آن بعضے قائم۔ (زال حیدر آباد پچی نا رہن شفیق)

درین لشکر ہانم یاروم ہا خوش می سجد  
نمادہ درد کان بقال راجز سنگ میزانے

.....  
.....

یکے لغتہ خدا دنداجتی ازخ پیغمبر  
برائے قلعہ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے

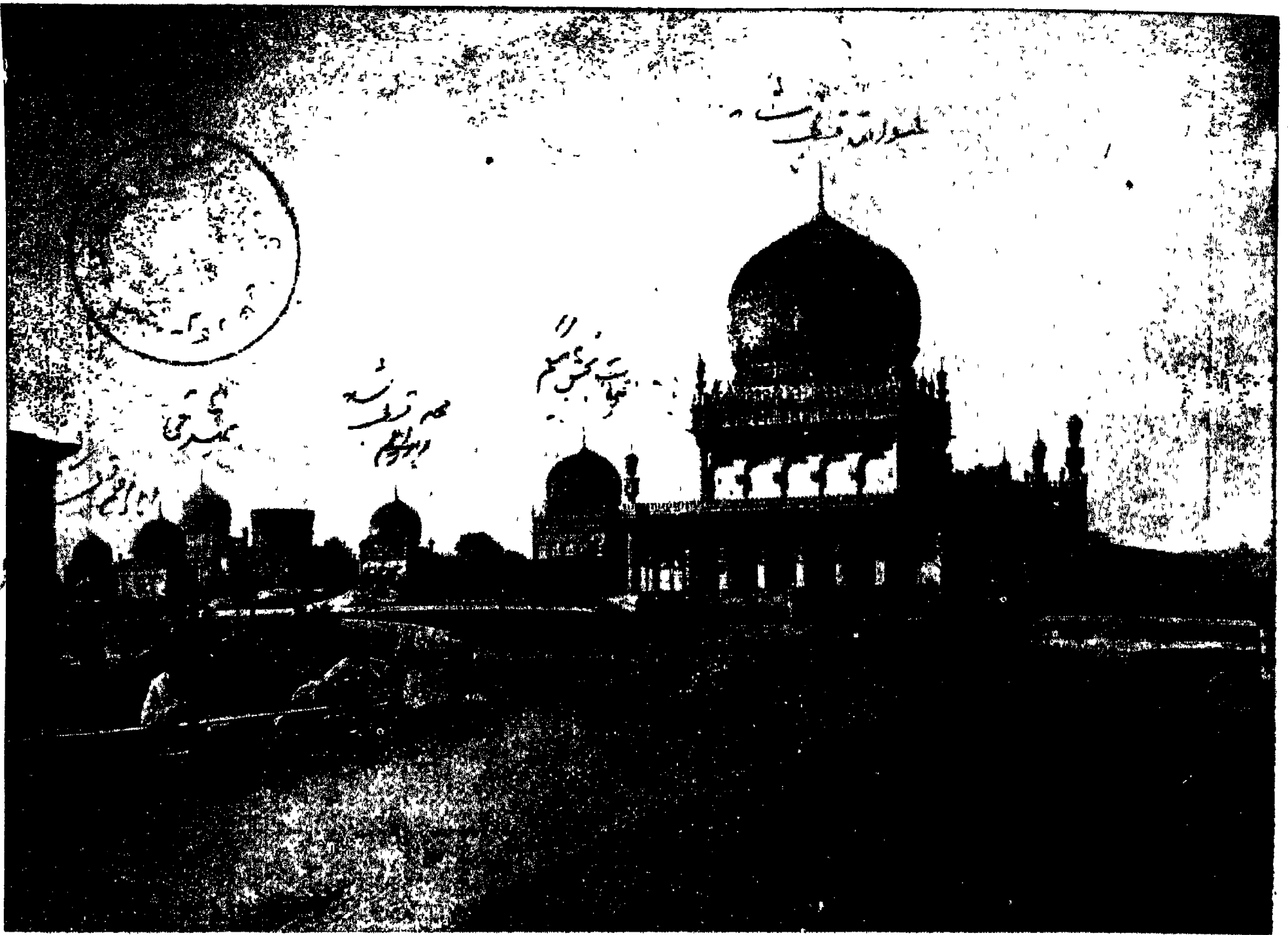
اس کے علاوہ ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ قطب شاہی سلطنت کی تباہی سے مشرقی ساحلوں پر مغربی کسپینوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل گیا کیونکہ غل شہنشاہت کار و منڈل پر اپنا اثر ڈالنے سے قاصر تھی اور قطب شاہی حکومت پورے طور پر اثر انداز تھی اور اس کے ہوتے ہوئے انگریز و فرانسیسی، ولندیزی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

نظر بندی کے بعد ابو الحسن کا پھر نام نہیں سنائی دیا، اپنی زندگی کے آخری چودہ سال اس نے قلعہ دولت آباد کی چار دیواری میں گزارے۔ ایک بادشاہ کے لیے جس نے تانگانہ جیسی وسیع سلطنت پر پندرہ سال فرما رکھی تھی وہ نظر بندی میں گزارنا کتنا مشکل تھا۔ بسا اے میں دولت آباد کے قلعے میں

۱۔ وقاع گولکنڈہ نعمت خان عالی۔

۲۔ منوچی کہتا ہے کہ مرہٹوں نے ابو الحسن کو قلعے سے باہر کے چہ بادشاہ بنانے کی سازش کی تھی، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ جب اورنگ زیب کو اس کا پتا چلا تو اس نے ابو الحسن کو قلعہ دولت آباد سے نکال کر قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا، اور وہیں اس کا انتقال ہوا (منوچی جلد دوم ص ۱۹۳)۔ لیکن مقامی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ غالباً وہ دولت آباد سے منتقل نہیں کیا گیا، اسی قید میں اس کے ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام خدا بندہ یا بندہ سلطان بتایا جاتا ہے۔





مقابر سلطین قطب شاہی



مقبرہ تانا شاہ

مقبرہ تانا شاہ

ان کا انتقال ہوا، اور خلد آباد کی پرسکون فضا میں یہ پیوند خاک کر دیے گئے۔ ابو الحسن کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ اس کی خواہش اور سیاسی زندگی بے سرو پا الزامات کی وجہ سے جس میں مغلوں کی اشتہار بازی کو بہت بڑا دخل ہے، ایک راز سر بستہ ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ شہنشاہ کی نظر میں اس کی اتنی برائیاں تھیں جو احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی تھیں۔ درباری مورخ محمد ساقی جو شہنشاہ کا عین ہنجیال ہے اس کو ابو الحسن سفیہ بواہوس کے قبچ الفاظ سے یاد کرتا ہے اور شہنشاہ سے زیادہ اس کی برائیاں گناتا ہے۔ خانی خاں نے اس کو ابو الحسن قبچ کر دار لکھا ہے ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الحسن میں کوئی انسانی خوبی نہ تھی بلکہ وہ ازسرتاپا برائیوں میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ وہ بہ ظاہر کسی ہمدردانہ ذکر خیر کا مستحق نہیں ہے۔ ان برائیوں کے علاوہ کہ اس نے مادنا کو وزیر بنا کر اسلام کو ذلیل کر رکھا تھا، اور سنبھاجی کی مدد کرتا تھا، فسق و فجور کو علانیہ ملک میں رائج کر دیا تھا، اور خود درانواع کا نر روز و شب مستغرق تھا، اور تمام اہل ملک بھی انہیں برائیوں میں مبتلا تھے۔

اگرچہ اس زمانے کی کوئی مقامی تاریخ دستیاب نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے صحیح حقیقت کا پتا چلانا بہت مشکل ہے، لیکن اس کے برخلاف مغل مورخوں کے بیانات بھی صداقت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے چونکہ مغل گوکنڈے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتے تھے اس لیے اپنی دست درازی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے قطب شاہی سلطنت اور اس کے والی کو بدنام کرنا ضروری سمجھتے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ابو الحسن اس قدر بے مایہ آدمی

۱۔ ابو الحسن کے انتقال کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ حدیقۃ العالم کا مولف ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۲ھ کہتا ہے حدیقۃ العالم

مقالہ اول ص ۴۱۴، بعض لوگ ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۲ھ بتاتے ہیں (منوچی جلد سوم ص ۱۹۳)۔

۲۔ عالمگیر نامہ ص ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۳۔ خانی خاں جلد دوم ص ۳۴۲۔

۴۔ جو تاریخیں آصف جاہی دور میں لکھی گئی ہیں وہ بھی براہ راست مغل تاریخوں سے متاثر ہیں، ان میں بھی کوئی تحقیق نہیں کی گئی بلکہ اندھی تقلید ہوئی ہے۔

ہیں تھا جس طرح اس کو مغل تاریخیں پیش کرتی ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ اس نے سنبھاجی سے اتحاد کر رکھا تھا، مغلوں کا کوئی الزام اس پر صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سیاست کسی قدر کمزور تھی، اور جن وزراء کو اس نے عنانِ حکومت سپرد کی تھی وہ بڑی حد تک اس کے مستحق نہ تھے، تاہم یہ عیاش آدمی نہیں تھا بلکہ اگر ایک مقامی تاریخ پر اعتماد کیا جائے تو یہ ایک ذی علم اور متقی آدمی تھا، اور اس نے کبھی مسکرات کا استعمال نہیں کیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ابو الحسن، حضرت شاہ راجو جیسے پیرِ طریقت کا مرید تھا تو اس کے متعلق قبیح افعال کا اہتمام لگانا صحیح نہیں ہے۔ حضرت شاہ راجو کا اخلاقی اور مذہبی اثر جس طرح اس کے بادشاہ ہونے سے پہلے تھا بادشاہ ہونے کے بعد بھی رہا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ بادشاہ ہونے کے بعد اس کی عقیدت مندی بہت بڑھ گئی تھی اور اکثر وہ اپنے مرشد کے گھر پیدل جایا کرتا تھا جو اس شعر سے ظاہر ہے۔

جل آیا ہے شاہ تیرے گھر شاہ راجو

۱۔ اس اتحاد کے بیجا پور اور گولکنڈہ دونوں ذمہ دار تھے۔ چونکہ خود مغلوں نے اتحاد کا کوئی موقع نہیں دیا تھا اس لیے یہ سلطنتیں بالآخر مرہٹوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہو گئیں کیونکہ یہ ایک دکنی طاقت تھی۔

۲۔ باہر کے سیاحوں نے بھی ابو الحسن کی خائگی زندگی سے متعلق اچھے خیالات ظاہر نہیں کیے۔ فرار کہتا ہے کہ ”ابو الحسن مسلسل عیاشیوں میں غرق رہتا تھا، اور اس طریقے سے اس نے اپنے کو غفلت میں رکھنے کی کوشش کی“ فرار جلد اول ص ۸۵۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اوائل حکومت میں سید مظفر کو دھوکا دینے کے لیے دانستہ عیاشی بننے کی کوشش کی تھی، دراصل وہ عیاش نہیں تھا۔

۳۔ ”ماہ نامہ کائنات“ کہتا ہے کہ ”ابو الحسن شب و روز بہ دظایف و خدمت گذاری قرومی گذرانید“ اور اگرچہ فقرا، گناہ و غیرہ پینے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن ابو الحسن نے کبھی اس کا شوق نہیں کیا، گو اس نے فقرا کے لیے یہ چیزیں ضرور فراہم کی تھیں۔ (ماہ نامہ ص ۱۲۱)۔

اس کے علاوہ اپنے چودہ سالہ عہدِ حکومت میں اس نے خارجی اور داخلی مسلک میں جس بیدار مغزی اور انہماک سے کام کیا تھا، اس کی ایک عیاش آدمی سے کبھی توقع نہیں کی جاسکتی، نیز اس کی غیر متزلزل خود داری اور استقلال کے سبق آموز مظاہرے جو فتح گو لکھنؤ کے وقت ظاہر ہوئے تھے ان الزامات کی صریح تردید کر دیتے ہیں۔ یہ ایک عیاش آدمی کا کردار نہیں ہو سکتا، برخلاف اس کے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن ایک بڑا آدمی تھا، اور اگر اس کو موقع ملتا تو وہ ایک مدت تک دکن کی صحیح رہنمائی کرتا، اس میں ایک اچھا ذوق سلیم تھا۔ اس نے علم و فن اور فنونِ لطیفہ کی بھی خدمت کی ہے، اس کے دربار میں کئی شاعر و عالم تھے، اس انشراح کے زمانے میں بھی جبکہ اس کو ہمیشہ غلِ سیلاب کا خدشہ لگا ہوا تھا لطیف عمارتیں بھی بنائی تھیں۔ منجملہ ان کے بعض عمارتیں اب تک موجود ہیں اس کے لطیف ذوق کے قویٰ آداب میں عجیب قصبے مشہور ہیں، اگرچہ اس نے چودہ سال سے زیادہ حکومت نہیں کی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابوالحسن اپنے بلند کردار اور اوصاف کی وجہ سے تمام قلوب شاہوں میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھا، اور کچھ اسی وجہ سے اس زمانے کے اہل الرائے اس قلب شاہی سلطنت کو بہت امید افزا سمجھتے تھے اور اس کی بقا کے آرزو مند تھے۔ چنانچہ ایک محصر مورخ نے ان الفاظ میں اپنی حلیٰ تمنا کا اظہار کیا تھا:۔

”ہمین تائیدات ایزداد گرد حسن اعتقاد بہ آئمہ اثنا عشر علیہم الصلوٰۃ

من الملک الاکبر این دولت ابد قرین تاحالت تھری این صفحات فردوس آئین کہ

سنہ ہزار و نو و دو است یک صد و ہشتاد سال می شود کہ در آن سلسلہ علیہ تہ اول

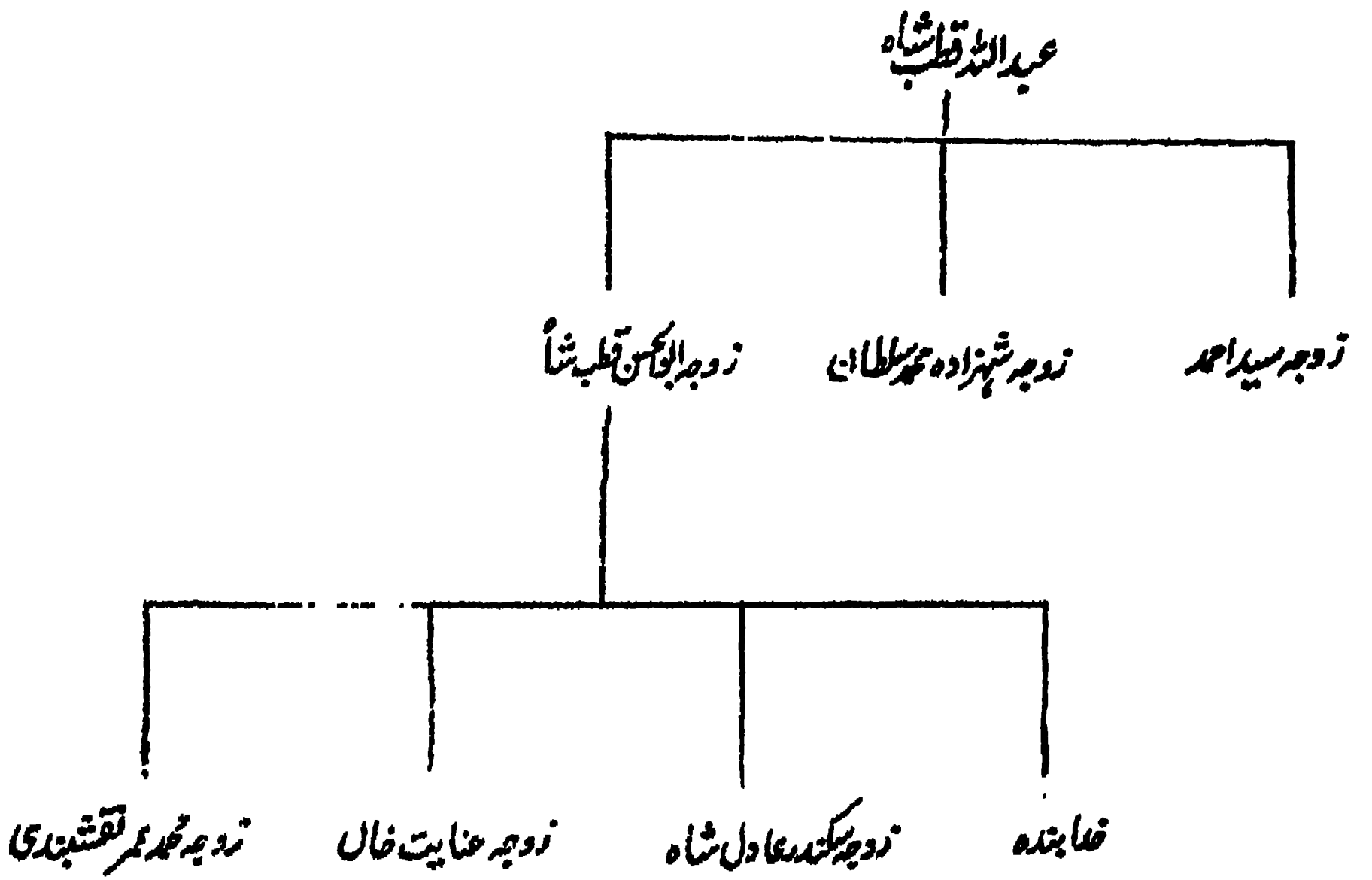
است۔ امید از حضرت مالک الملک اللہی بخرمی بہ امرہ الفلک آن است کہ

انتہائے این سلطنت ابد نشان بہ ابتداء دولت حضرت صاحب العصر والزمان

علیہ و علی آباء الصلوٰۃ من الملک المنان اتصال پذیرد۔“

اور اسکا مورخ نے ذیل کے اشعار میں ابوالحسن قلب شاہ کو عادی ہے:۔

یہ تخصیص شاہ جہاں بو احسن  
 کہ در سایہ اوست مارا وطن  
 خدایا بہ اعزاز خیر الوراے  
 بحق نجوم سپہر ہداے  
 کہ آن خسرو عادل پاک دین  
 ہمیشہ بہ اقبال بادا قرین  
 بہ دنیا بمانا و بسیار سال  
 نگہبان او حضرت ذوالجلال<sup>لہ</sup>



نوٹ۔ یہ شجرہ کلام الملوک مولفہ سعادت علی صاحب رضوی سے ماخوذ ہے۔

۱۵۔ حدائق السلاطین مولفہ علی بن طیفور سطاہی۔ آخری ورق۔ یہ تاریخ جس میں گولکنڈے کے سلاطین اور امراء کا حال درج ہے ۱۰۹۲ھ میں لکھی گئی ہے۔ ابو احسن کے عہد کا یہ ایک ہی ماخذ ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مولف علی بن طیفور کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا، اور گیا، لیکن اپنی تاریخ اس نے گولکنڈے میں لکھی ہے اور بادشاہ نے اس کو بہت کچھ انعامات دیے۔

خوش  
حاضری  
گلشنِ کائنات

# کیسواں باب

## سیاست و معاشرت

قطب شاہ تمدن کے بہت بڑے شمع بردار تھے۔ تلنگانے کی سرزمین میں جہاں ان لوگوں نے راج کیا ایک ایسا پاکیزہ تمدن پیدا کیا تھا جس کے نقوش اب تک موجود ہیں۔ اس تمدن میں جس کو قطب شاہی تمدن کہنا چاہیے مختلف عناصر کا امتزاج تھا۔ پہلے تو یہ لوگ ایران و ترکستان سے بھی جو ان کا جنم بھوم تھا کچھ تمدنی عناصر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کی یا لگتا ہے بھنا کچھ خلافت قیاس نہیں ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترکستانی سیاست اور معاشرت کے کچھ نہ کچھ تاثرات ضرور ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطب شاہوں کا تمدنی سرمایہ زیادہ تر گلبرگہ اور پید کے تمدنی ذخائر سے ماخوذ تھا، کیونکہ قطب شاہ اس سلطنت بھنی کے براہ راست حلقہ بگوش اور خوشہ چین تھے جس نے چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں دکن کی پرزور سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کی تھی۔ دکنی اہل ت کا صحیح تخیل اور اس کی انوکھی سیاست و معاشرت جسے دکن کے مخصوص جغرافیہ اور قومیتوں کا عکس سمجھنا چاہیے، اسی سلطنت کی پیداوار تھی، اسی سلطنت نے دکن کے لیے بہترین نظام حکومت بنایا۔ معاشرت کے زرین اصول سکھائے اور نئی وضع قطع پیدا کی، اہل دکن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اچھا سامان جمع کیا جو اس کے پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکن کے تمام طول و عرض میں جہاں اس سلطنت کا پرچم اہراتا تھا، بھمنیوں کے گہرے نقوش موجود تھے اور یہ آج بھی ہیں۔ کوئی ذہن ان تاثرات سے خالی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں جو جدید نظام حکومت اور معاشرت قائم ہوتا وہ

کبھی ان تاثرات سے خالی نہیں ہوتا سلطان قلی نے برسوں بہمنی نظم معاشرت اور سیاست میں سانس لی تھی اور جب وہ تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تو اس کے سامنے سولے بہمنی آئین کے اور کیا ہو سکتا ہے، اسی آئین کی اس پابندی کی، یہ اور اس کے تمام جانشین بہمنی معاشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکے۔ اس طریقے سے تلنگانے میں جو قطب شاہی تمدن تیار کیا گیا اس کی بنیاد اور سراپا سب بہمنی تھا۔ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت پر کچھ حصر نہیں ہے بلکہ اس کی تمام سمعہ سلطنتیں جو بہمنی سلطنت کے مکھنڈروں پر قائم ہوئی تھیں، وہ سب بہمنی معاشرت اور سیاست کی خوشہ چیں تھیں، ان کا نظام حکومت بہمنی تھا، اور جس قدر معاشرت تھی اس پر بہمنی رنگ چڑھا ہوا تھا اس سے اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں نے جو اپنی راجدھانیاں قائم کی تھیں ان میں بھی بہمنی عناصر تھے اور آج بھی دکن اسی تمدن کا رہنما منت ہے۔

لیکن یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ قطب شاہوں نے اپنے تمدن کو تلنگانے کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا تھا کہ ایک مقامی چیز معلوم ہوتی تھی، ان لوگوں نے اس بات کو بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ان کی سلطنت تلنگانے میں ٹھیک ترکستانی اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی اس طرح شامل ہونے چاہئیں کہ یہ اس سرزمین کی خصوصیات کا پورا جواب دے سکے۔ یہ قطب شاہی سلطنت کا سرمایہ افتخار ہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلنگانے کی قومی اور جغرافیائی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہوئے لگی اور شاہان قطب شاہی آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے کیونکہ تلنگانے کو ان لوگوں نے اپنا گھر بنالیا۔ تلنگی عورتوں سے شادیاں کیں اور ترکستانی دھبہ قطع چھوڑ کر مقامی لباس اور طرز و طریق اختیار کیے اور تلنگی زبان سیکھی اور اس میں شاعری کی ملک کے ہر طبقے کو مذہب کی پوری آزادی دے رکھی تھی اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ تھا کہ قطب شاہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ تلنگانے کی قومی اور جغرافیائی خصوصیات کی صحیح پرکاش کر کے بہت جلد ایک تعمیری خاکہ تیار کر لیا، اور اس ملک کی ہر طرح سے تعمیری،



آندھرا قوم کو اپنی رعایا سمجھ کر آگے بڑھایا۔ تلنگی زبان کی سرپرستی کی اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیے اور غالباً یہ تاریخ تلنگانے کا سنہری زمانہ تھا۔

بادشاہ | اگرچہ قطب شاہی دستور میں بہمنی نظام حکومت کا چربہ اُتارا گیا تھا، اور یہ قطب شاہوں کے لیے ناگزیر تھا، تاہم اس میں زمانی اور مقامی خصوصیات نظر انداز نہیں کی گئی تھیں۔ مرکزی اور مقامی حکومتوں کی ترتیب میں اس بات کا پورا لحاظ تھا کہ وہ عصری ضروریات کا جواب ہو، اس لیے گو دستور کی بنیاد تمام تر بہمنی تھی لیکن بایں ہمہ اس میں فردی اختلافات بھی تھے۔ بہمنیوں کی طرح قطب شاہی حکومت بھی ایک "شاہی" تھی یعنی بہمنی بادشاہوں کی طرح قطب شاہ بھی مطلق العنان تھے۔ دستور میں کوئی ایسا آلہ حکومت نہ تھا جس کی بدولت وہ رائے عامہ کا مظہر ہوتا، اور بادشاہوں کو عام خودنودی کا پابند کرتا۔ بادشاہوں کی ذات ظاہری و باطنی مختلف صفات کی حامل سمجھی جاتی تھی اور اس میں تقدس بھی تھا۔ قرون وسطیٰ کے تمام اسلامی بادشاہوں کی طرح یہ بھی ظل اللہ سمجھے جاتے تھے، یہ خود بھی اپنے کو ظل اللہ کہتے تھے اور بعض تو ظل اللہ تخلص کرتے تھے۔ یہ شاہی رعب داب قائم کرنے کا اچھا ہتھیار تھا جو قرون وسطیٰ میں ہر جگہ استعمال کیا گیا۔ تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ تمام قطب شاہ بڑے ذی علم شایستہ انسان تھے اور حکمرانی میں اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرتے تھے اکثر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے وزراء سے مشورہ لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اور خاص معاملات میں علمائے عصر سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان میں رواداری اور رعایا پروری بے حد تھی اور عدل گستری ان کا خاص شعار تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔

۱۔ محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ تخلص کرتے تھے۔

۲۔ عبدالقدوس قطب شاہ نے ۱۵۴۱ء میں علماء سے مشورہ کر کے شاہجہاں کی شریں تسلیم کی تھیں (مدتیۃ السلاطین ۱۶۳۶ء)

اس لیے اہل تلنگانہ قطب شاہی سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ کو تلنگانے میں آئے ہوئے ابھی بہت روز نہیں ہوئے تھے کہ تلنگی رعایا اس کو بڑے ملک کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کرنے لگی۔ اس کے جانشینوں کے ساتھ بھی یہی محبت تھی اور ملک اکثر ماں صاحب کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔

جب بادشاہ کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی تجہیز و تکفین سے پہلے ہی اس کی جانشینی کا انتظام جلوس و تخت نشینی کیا جاتا تھا تاکہ حکومت کی رفتار میں کوئی فرق نہ آئے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کی

اسی طریقے پر محمدی محل میں تخت نشینی ہوئی، اس میں تمام امراء و عمائد سلطنت اور فوجی افسر جمع ہوتے تھے اور سلام کرتے تھے اور اس کے بعد عوام کو بھی موقعہ دیا جاتا تھا کہ وہ نئے بادشاہ کو دیکھ لیں اور اس کو دوبارہ عام کہا جاتا تھا اس کے علاوہ عام اطلاع کے لیے ہاتھیوں اور اونٹوں پر تمام شہر میں منادی کی جاتی تھی، یعنی جارچیاں اور منادیاں ہاتھیوں اور اونٹوں پر بیٹھ کر شہر میں گھومتے تھے اور اوپر سے نئے بادشاہ کا اعلان کرتے تھے۔ یہ ایک موقتی انتظام تھا لیکن اس کے دو چار روز کے بعد جب تجہیز و تکفین اور سوگ سے فراغت ہو جاتی تو باضابطہ تخت نشینی کا انتظام ہوتا تھا، اس کے لیے ایک مناسب اور مبارک تاریخ مقرر ہوتی تھی اور خاص اہتمام کے ساتھ تخت نشینی کا دربار ہوتا تھا۔ صبح سے اس کا اہتمام ہوتا تھا، پہلے نقارے۔ دماے۔ کرنا و صفیر بجتے تھے تاکہ دور دور تک اس کی اطلاع پہنچ جائے! اس کے بعد تمام امراء و عمائد سلطنت اور ملک کے تمام علماء و فضلاء ایوان شاہی میں جمع ہوتے اور بادشاہ کو قطب شاہی تخت پر بٹھاتے تھے اور پھر اپنی جگہ کھڑے ہو کر آداب سلام بجالاتے تھے اور دعا دیتے تھے، اور بالعموم ایسے درباروں میں قصیدہ مبارک باد بھی پڑھے جاتے تھے سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت میر مومن نے دوزیر دست قصیدہ تہنیت پڑھے تھے جن کی تاریخی اہمیت ہے! اس دربار کے بعد اظہار مسرت میں صرف تمام ارکان سلطنت کو جام دارخانے سے غلعتیں تقسیم ہوتی تھیں جو مرکزی حکومت کے حامل ہوتے تھے بلکہ دوسرے قلعہ داران اور نایک واریوں کو بھی حسب مراتب کپڑا اور انعام دیے جاتے تھے تاکہ سب اس مسرت میں برابر کے

شریک ہوں اس کے علاوہ عام لوگوں کو بھی ہاتھیوں اور توپ خانوں پر شیرینی اور شکر بھر کر تقسیم کی جاتی تھی تاکہ ہر طبقہ اس مسرت سے بہرہ اندوز ہو۔ اور پھر ایسے موقع پر ہمسایہ سلطنتوں کی طرف سے سفیر آتے تھے اور مرحوم بادشاہ کی تعزیت اور جدید بادشاہ کی تہنیت کرتے تھے چنانچہ قطب شاہوں کے پاس نہ صرف احمد نگر اور بیجا پور سے سفیر آئے بلکہ بعض موقعوں پر سلاطین مغلیہ اور سلاطین صفوی نے بھی سفیر بھیجے اور تعزیت و تہنیت کی۔

شاہی دربار

بہمنی سلاطین کی طرح قطب شاہ بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اپنے دربار جاتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں شاہی بارگاہ اور دربار سیدھے سادھے تھے لیکن ابراہیم کے عہد میں جب دولت خانہ عالی کی تعمیر ہوئی تو اس میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دربار ہونے لگا اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تو اس کی رونق بہت بڑھ گئی۔ دولت خانہ عالی کا بڑا ایوان جہاں دربار ہوتا تھا کوئی ہزار گز کے قریب طویل تھا، اور اس کے چاروں طرف عالی شان ایوان اور محرابیں تعمیر ہوئی تھیں۔ اس کا دروازہ جو ہندو طرز کا تھا مشرقی جانب تھا، اور میں گز بلند رفیع الشان ستونوں پر قائم تھا، دروازے کے بالائی حصے میں ایک نہایت بلند عمارت تھی اور اس کے سامنے نقار خانہ تھا جس میں نوبت بجتی تھی جو شاہی اعیانہ ہر روز صبح دربار ہوتا تھا، تمام امراء و عمائد کو حکم تھا کہ اپنی فوج اور ہاتھیوں کے ہمراہ سلام کے لیے دربار میں آئیں۔ یہ اپنے خدم و حشم کو باہر چھوڑ دیتے تھے اور خود تنہا آکر سلام کرتے تھے۔ شاہی رعب داب کے لیے شاہی فیل خانے کے ہاتھی اور شاہی فوج کے ہزار پیادے دولت خانہ عالی کے سامنے دو رویہ صفیں باندھ کر کھڑے رہتے تھے اور اس کے علاوہ جیشی سرداروں کے تحت کئی سو مسلح سپاہی پہرہ دیا کرتے تھے۔ اس بارگاہ شاہی کے جنوبی جانب شاہی دفتر خانہ اور مغرب میں جام دار خانہ اور شاہی کارخانوں کی

عمار تیں تھیں۔ جب شہر حیدر آباد میں شاہی قصر یعنی داد محل اور محمدی محل تعمیر ہو گئے تو یہاں بھی یہ دربار ہونے لگے۔ ان درباروں میں اُمراء و عمائد سلطنت بیٹھ نہیں سکتے تھے بلکہ اپنے مراتب کے مطابق کھڑے ہوتے تھے اور جب کبھی کسی کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی تو وہ بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ان بڑے درباروں کے علاوہ قطب شاہوں کی چھوٹی اور خاص مجلسیں بھی ہوتی تھیں جہاں شاہی تخت کی جگہ صرف مسند بچھی ہوتی تھی اور وزراء و سب سے گفتگو ہوتی تھی۔

## وزرا

اگرچہ بادشاہ سلطنت کا نفس نا طلق تھا لیکن حکومت کے عاملانہ فرایض کے لیے مرکز میں کئی وزیر مقرر تھے۔ پیشوا اور ان پر خاص سلیقہ کے ساتھ فرایض اور اختیارات کی تقسیم کی گئی تھی بعض وزراء تو بالکل وہی تھے جو پہلی وزارت میں تھے یعنی وزیر اعظم ”وکیل مطلق“ یا پیشوا کہلاتا تھا جس کے سپرد امور سلطنت کی نگرانی، داخلی اور خارجی مسلک حکومت کی تشکیل تھی۔ بادشاہ بالعموم اسی وزیر سے مشورہ کرتے تھے، اس خدمت پر اکثر بڑے پایہ کی شخصیتیں مامور کی جاتی تھیں جن کی علمی و عملی قابلیت مسلمہ ہوتی تھی اور عطائے عہد کے موقع پر خلعت پیشوائی اور دوسرے اعزازات عطا کیے جاتے تھے اور بالعموم میر جملہ کے عہد سے پیشوائی پر ترقی دی جاتی تھی، چنانچہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں مصطفیٰ خاں اردستانی اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں میر محمد مومن، اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں شیخ محمد ابن خاتون جیسی شخصیتیں فائز تھیں جعفریہ مومن اور شیخ محمد کی تو اس قدر ہوتی تھی کہ ان لوگوں کو پالکی میں بیٹھ کر دولت خانہ عالی میں آنے کی اجازت تھی اور یہ تخت کے بائیں جانب بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے ابتدائی عہد میں جب شاہ محمد پیشوا تھا تو

اس کی امداد کے لیے شیخ محمد کو اس کا نائب بنایا گیا۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں ایک مدت یہ ہوئی کہ پیشوا کو دیوان کے لقب سے یاد کیا گیا۔ مادنا جو پیشوا کے فرایض انجام دیتا تھا دیوان کہلاتا تھا نہ کہ پیشوا۔

پیشوا کے بعد دوسرا بڑا وزیر میر جملہ تھا جس کو بہمنی اصطلاح کے مطابق امیر جملہ کہنا چاہیے۔ اس کو میر جملہ جملۃ الملک خطاب ہوتا تھا، اور اس عہدے کو وزارت جملۃ الملکی کہتے تھے۔ فرایض کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ زمانہ حال کا وزیر مالیات تھا، یعنی تمام سلطنت کے داخل اور مصارف کی جانچ پڑتال اسی کے سپرد ہوتی تھی یہ سلطنت کی تمام مالگزاری کی گرفت اور ہر محکمے کے خرچ کی تنقیح کرتا تھا کیونکہ مالیات کے ساتھ بالعموم حسابی تنقیح شامل رہتی ہے۔ دوسرے شعبوں کے ساتھ یہ بالخصوص کو توالی اور فوج کی بھی تنقیح کرتا تھا۔ اس طریقے سے اس عہدہ دار کے اختیارات اور اثرات بہت وسیع تھے جو خود پیشوا کو بھی حاصل نہ تھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں سلطنت کا روپیہ اور تنقیح کا اختیار تھا چنانچہ بعض موقعوں پر قطب شاہی میر جملہ پیشوا سے بھی بڑھ گئے اور بعض جلیل القدر میر جملہ خود پیشوا کے اختیارات بھی استعمال کرتے تھے چنانچہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مرزا محمد امین اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ملا تقی اور میر محمد سعید اردستانی بڑے میر جملہ گزرے ہیں ان کے ہوتے ہوئے لوگ پیشوا کو نہیں پہچانتے تھے محمد امین اور ملا تقی کو تقرر کے وقت قلندران مرصع دیا گیا تھا جو دوسروں کو نہیں دیا گیا۔

قطب شاہی دستور میں ایک اور بڑی وزارت تھی جس کو وزارت عین الملکی کہتے تھے اور وزیر عین الملک اس وزیر کو عین الملک خطاب دیا جاتا تھا۔ اس وزیر کے فرایض اور اختیارات تو واضح نہیں ہیں لیکن قرائن یہ ہیں کہ یہ محکمہ فوج کا صدر ہوتا تھا، اگر یہ صحیح ہے تو اہل فوج کا تقرر و تنزل اور ان کی دیکھ بھال اس کے ہاتھ میں تھی اور یہ غالباً قطب شاہی افواج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا، چونکہ

فوجوں کی رہنمائی بڑی امتیازی چیز ہوتی ہے اس لیے اس وزیر کی بہت اہمیت تھی، یعنی ”سرمداری عین الملکی کہ از اعظم وزارت است“ اس خدمت پر ابتدا میں سیف خاں عین الملک اور آخری زمانے میں منصور خاں بٹی فائز تھے۔

یہ بھی ایک بڑا عہدہ دار تھا جو مرکزی حکومت میں تمام سلطنت کی مالگزاری جمع کرتا، اور غالباً مجموعہ دار مرکزی خزانہ اسی کی نگرانی میں رہتا تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ منصب رفیع مجموعہ داری کہ عبارت از استیغاثہ ممالک است۔ لیکن ان فرایض کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعہ دار میر جملہ کے ماتحت اور اس کا شریک کار تھا، اور اس طریقے سے غالباً یہ وزیر کے رتبے سے کمتر تھا عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں ناراین راؤ اس خدمت پر فائز تھا، نہ صرف اس عہد پر بلکہ محکمہ مال میں بھی اکثر عہدہ دار مامور کیے جاتے تھے۔

جس کو ناظر الممالک خطاب دیا جاتا تھا آمد و خرچ کا حساب رکھتا تھا، اور غالباً یہ بھی مجموعہ دار کی طرح ناظر وزیر کے رتبے سے کم اور میر جملہ کے ماتحت منظور ہوتا تھا، مجموعہ دار جمع بندی کرتا تھا تو ناظر خرچ کی تصدیق کرتا تھا محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ابو طالب اور عبد اللہ کے عہد میں میر قاسم اس عہدے پر فائز تھے اور بہت مشہور تھے۔

جس کو کبھی دبیر الممالک اور کبھی منشی الممالک خطاب ہوتا تھا بادشاہ کے خاص فرایض انجام دیتا تھا دبیر یعنی یہ شاہی فرامین اور احکام شایع کرتا تھا، اور ملک کے عرایض بادشاہ کے پاس پیش کرتا تھا، اس کو زمانہ مال کی اصطلاح میں پریوٹ سکرٹری کہنا چاہیے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں خواجہ مطلق علی اور عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں مولانا اویس وغیرہ اس خدمت پر مامور تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرامین

فارسی اور تنگی دوزبانوں میں شایع ہوتے تھے تاکہ سب رعایا ان کو سمجھیں اور فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ آخر الذکر  
 فرامین کے لیے جن کو فرامین ہندی کہا جاتا ہے ایک برہمن دبیر مامور ہوتا تھا، چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں  
 تنگی فرامین لکھنے کے لیے اعتماد راؤ برہمن مامور تھا۔

گو یہ وزیر نہیں تھا لیکن شہر کے قیام امن کے لیے اس کی بڑی اہمیت محسوس ہوتی تھی خصوصاً ایسے  
 کو تو ال موقوفوں پر جبکہ شورش کا ڈر ہوتا تھا کو تو ال کے فرایض بہت اہم ہو جاتے تھے۔ چونکہ اس خدمت پر  
 کار کردہ لوگ مامور ہوتے تھے اس لیے کو تو ال یا پولیس کا انتظام بہت اچھا تھا اس کی باہر کے سیاحوں نے  
 بڑی تعریف کی ہے اور تھیونو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی کو تو ال ایسے کار کردہ ہوتے تھے جیسے  
 زمانہ حال کے کو تو ال ہوتے ہیں۔ بغیر کو تو ال کی اجازت کے کوئی اجنبی شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، جنبیوں پر  
 بڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ جب نئے لوگ باہر سے آتے تھے تو ان کو دروازوں پر روک لیا جاتا تھا، اور  
 ان کی تحقیق کی جاتی تھی تاکہ وہ مایہ فساد نہ ہوں، اور ان کا سامان بھی دیکھا جاتا تھا۔ کو تو ال کی امداد  
 کے لیے ایک نایب کو تو ال بھی مامور تھا۔

ان بڑے وزراء، اور عہدہ داروں کے علاوہ چند چھوٹے عہدہ دار بھی ہوتے تھے مثلاً  
 فوج کے چھوٹے افسر تھے جو سرخیل کہلاتے تھے غالباً یہ عین الملک کے ماتحت ہوں گے۔ جو سرخیل خاص بادشاہ کی  
 حفاظت کے لیے مقرر ہوتے تھے وہ سرخیل شاہی کہلاتے تھے۔ بعض عہدہ دار ایسے تھے جو جام دار خانے

۱۔ حدیقۃ السلاطین ص ۳۱۔

۲۔ سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۹۷۔

۳۔ سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد ۱۲۵۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ شہر میں نہایت اچھی پولیس ہے اور اس کی  
 وجہ سے اچھا انتظام ہے۔

اور فیل خانے کا انتظام کرتے تھے، یہ ”حوالدار“ کہلاتے تھے۔ یہ تمام چھوٹے بڑے عہدہ دار انہیں سلطنت کے پورے پابند تھے اور جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی یا یہ آئین شکنی کرتے تو ان کو سزا دی جاتی ۱۰ اور بلا لحاظ عہدہ برطرف کر دیے جاتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم قطب شاہ نے اپنے پیشوا منیع خان کو اور سلطان محمد نے اپنے میر جملہ مرزا محمد امین کو ان کی خلاف ورزی کی عاقبت میں برطرف کر دیا۔

حکومت میں کوئی قانون سازی کا شعبہ تو نہ تھا، البتہ طلبہ کا رستم درویش اور شہنشاہی احکام قانون کا درجہ رکھتے تھے جو حکومت شاہی کا خاصہ ہے، لیکن ان اعضاء عالیہ کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا، شہنشاہی پابندی کا عدلیہ کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا جس پر قطب شاہ بہت زور دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں بالعموم فصل مقدمات کا کام قاضیوں اور پنڈتوں کے تفویض تھا، لیکن بادشاہ بھی بہ ذات خود اس میں کچھپی لیتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اور اس کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ بڑے انصاف پسند حکمران تھے، اول الذکر نے معدلت گستری کے لیے ”داد محل“ کے نام سے ایک بہت بڑی عمارت بنائی تھی جس کی بہت شہرت تھی، باہر کے سیاحوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے، اسی میں بیٹھ کر بادشاہ مظلوموں کی فریاد سنتے تھے، اس کے دروازے بازار کی طرف کھلتے تھے اور یہ عام حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو وہ بلا مزاحمت بادشاہ کے سامنے آجائے۔ دربان اور چوہدار مزاحمت نہیں کرتے تھے، لیکن جب یہ عمارت بجلی کے عہد سے غراب ہو گئی تو سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد نے ”امان محل“ کے نام سے ایک اور عمارت بنائی تھی جس کا مقصد بھی یہی تھا، یعنی وہ مظلوموں کی پناہ گاہ سمجھی جاتی تھی۔ یہ شاہی دادرسی ہر عہد میں برابر قائم رہی، ہر بادشاہ نے اس کا پورا لحاظ رکھا، جب فرانسیسی سیاح ٹیورنیر عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا تھا، اس نے اپنی آنکھوں سے شاہی عدل گستری کا انتظام دیکھا تھا، وہ کہتا ہے کہ بادشاہ خود دادرسی کرتے ہیں اور طریقہ کار یہ ہے کہ بادشاہ محل کے برآمدے پر آتے ہیں اور سب لوگ ان کے سامنے میدان میں نیچے اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن لوگوں کے کھڑے رہنے کا انتظام یہ تھا کہ زمین میں لکڑیاں



نصب کر کے رستیوں کی تین قطاریں باندھی جاتی تھیں اور یہ قطاریں تمام میدان میں پھیلی ہوئی تھیں ان میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر طلب کیے کوئی رستیوں کو پھاند کر نہیں جاسکتا شاہ نشین کے سامنے جہاں بادشاہ ہوتے ہیں ایک رستہ چھوڑ دیا جاتا ہے جس میں سے وادخواہ بادشاہ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی سامنے ایک رستی ہوتی ہے، جب کسی کو بلایا جاتا ہے تو دو آدمی شاہ نشین کے سامنے کی رستی نیچے جھکا دیتے ہیں تاکہ وہ وادخواہ بادشاہ کے سامنے پہنچ جائے۔ ایک وزیر برآمدے کے نیچے کھڑا ہوتا ہے اور عرایض لیتا ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں پانچ یا چھ عرایض جمع ہو جاتے ہیں تو وہ ان کو ایک تھیلی میں رکھ دیتا ہے جو ایک ڈوری کے سہارے اوپر سے چھوڑی جاتی ہے اور ایک خواجہ سرا جو بادشاہ کے برابر کھڑا ہوتا ہے اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ دوسرے سیاح تھیونو کا بیان ہے کہ عبداللہ قطب شاہ بہت انصاف پسند ہے، وہ بہ ذات خود عدل گستری میں دلچسپی لیتا ہے اور اُمرا بھی سزا سے نہیں بچتے۔<sup>۱۲۵</sup>

مقامی حکومت | مرکزی حکومت کی طرح مقامی حکومتوں کا نظم و نسق بھی تھا۔ سلطنت مختلف صوبوں پر منقسم تھی

۱۔ سیاحت نامہ نیورنیر جلد ۱ ص ۱۲۵-۱۲۶۔

۲۔ تھیونو ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک امیر نے ایک صراف کو محل میں بند کر کے اس سے زبردستی پانچ ہزار روپیے وصول کر لیے اس کی اطلاع ہوتے ہی بادشاہ نے اس کو سزا دی اور رقم واپس کرا دی (سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۹۷)۔ دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عہدہ دار اچھی بیگ نے تاجروں سے قرض لے لیا تھا اور ادا نہیں کرتا تھا۔ تاجروں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی تو عبداللہ نے تیس یا چالیس ہزار ہون اس کی آمدنی سے ادا کر دیے اور بڑا باقی رہ گئے تھے وہ شاہی خزانے سے ادا کیے۔<sup>۱۲۶</sup>

جن کو بہنی تقلید میں طرف بہتے تھے، آخری زمانے میں سلطنت کے کوئی چھ صوبے ہو گئے تھے، منجملہ ان کے کرناٹک کا بہت بڑا صوبہ تھا جہاں ساحلوں کی بہ دولت تاجروں سے بہت آمدنی ہوتی تھی، ان کے انتظام کے لیے صوبہ دار ہوتے تھے جو صوبوں میں بادشاہ کی نیابت کرتے تھے اور "طرفدار" کہلاتے تھے۔ بہنی انتظام کے مطابق یہ اپنے صوبے کے "سر لشکر" بھی تھے، یعنی صوبے کی تمام فوج انھیں کے ماتحت ہوتی تھی اور ضرورت کے وقت یہی فوج کشتی بھی کرتے تھے، لیکن ان کے ماتحت "سرخیل" کے نام سے ایک چھوٹا فوجی افسر بھی ہوتا تھا جو فوجوں کی رہنمائی کرتا تھا اس خدمت پر لائق لوگ مامور کیے جاتے تھے۔ چنانچہ کرناٹک میں محمد سعید میر حیدر نیک نام خاں۔ اکنا۔ محمد ابراہیم۔ خلیل اللہ خاں اور لنگیا مامور ہوئے تھے صوبے میں ان کے بڑے اعزاز تھے، دن کو ان کے سر پر چھتر بکڑی جاتی تھی اور رات کو ان کے ساتھ بارہ "مشعلیں" ہوتی تھیں صوبے کی جمع بندی کے لیے ایک اور عہدہ دار ہوتا تھا جس کو "دیوان" کہتے تھے، غالباً یہ سال میں ایک یا دو مرتبہ اضلاع کے اجارہ داروں سے مالگزاری جمع کر کے خزانہ شاہی میں داخل کرتا تھا اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی طرح ہر صوبے میں قاضی و پنڈت بھی مقرر تھے جو عدل گستری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ صوبے کی "سرکاروں" میں منقسم تھے جن کو زمانہ حال کی اصطلاح میں "ضلع" کہنا چاہیے اور "سرکار" کی تقسیم "سمت" تھی جس کو "پرگنہ" بھی کہتے تھے، اور ہر سمت میں کئی محال یا موضعے ہوتے تھے۔ ان چھوٹی سمتوں کا نظم و نسق بالکل وہی تھا جو صوبوں کا تھا۔ صرف فرق یہ تھا کہ یہاں طرفدار یا سر لشکر کی جگہ فوجدار ہوتے تھے اور سمتوں و محلات میں امن و امان کی حفاظت کے لیے حوالدار مقرر تھے۔ مدراس۔ مسولی پٹنم پٹی کٹ جیسے اہم ساحلی قصبوں پر جہاں مغربی اقوام کی تجارتی منڈیاں تھیں ذی اختیار حوالدار مقرر تھے جو مغربی تاجروں کی نگرانی کرتے تھے۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ عدالتی فیصلوں کے لیے تو قاضی و پنڈت تھے، مگر ایک نیا عہدہ دار بھی تھا جس کو خطیب کہتے تھے۔ یہی عہدہ دار اپنے علاقے میں شاہی فرامین کی تشہیر بھی کرتا تھا۔ ان سب عہدہ داروں کی تنخواہیں خزانہ شاہی سے وصول ہوتی تھیں جس کی وجہ سے کافی گرفت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور ان کے وزراء بھی

اپنے اضلاع اور قصبات کا دورہ کر کے مقامی حالات کا خود معائنہ کرتے تھے تاکہ مرکزی حکومت مقامی حکومتوں سے وابستہ رہے۔ چنانچہ ابوالحسن قطب شاہ اور اس کے وزیر مادنانے چار مرتبہ صوبہ کرناٹک کا دورہ کیا تھا۔

قطب شاہی سلطنت میں وصول مالگزاری کا ایک بے ڈھنگا طریقہ رائج تھا یعنی مقامی حکام خود رعیت سے طریقہ مالگزاری براہ راست مالگزاری وصول نہیں کرتے تھے بلکہ سرکار یعنی اضلاع ایک مقررہ رقم کے لیے اجارہ داروں کے سپرد کر دیے جاتے تھے جو موعودہ رقم وصول کر کے خزانے میں داخل کرتے تھے۔ یہ اجارہ دار جو اکثر ہندو ہوتے تھے ایک سال کے لیے مقرر ہوتے تھے اور سال ختم ہونے پر ان کا تعلق منقطع ہو جاتا، اور ضلع ہراچ کے جاتے تھے اور جو شخص بڑی بولی لگاتا اس کو ضلع سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اس میں دوسری خرابی یہ تھی کہ اضلاع کی طرح بندرگاہیں بھی اجارہ داروں کے سپرد کر دی جاتی تھیں۔ سال بھر اجارہ دار اپنے مقبوضہ ضلع کے مالک ہوتے تھے کہ جو چاہے ہو کریں۔ ان کو اضلاع میں فوجداری اور دیوانی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے چنانچہ یہ لوگ رعیت سے زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرتے تھے۔ حکومت کو تو موعودہ رقم ادا کرتے تھے کیونکہ اس رقم کے وہ پابند تھے لیکن فاضلات سے اپنا حبیب بھرتے تھے، اس کے علاوہ ان کو جمع بندی کا معاوضہ ملتا تھا اگر مالگزاری تین قسٹوں میں ادا ہوتی تھی لیکن بہت سختی سے وصول کی جاتی تھی جب اجارہ دار اپنی موعودہ رقم ادا کرنے میں تساہل کرتے تو ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور کبھی ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلا جاتا تھا چنانچہ مسولی پٹم کا اجارہ دار دوسویلی راؤ نے اپنی مقررہ رقم ادا نہیں کی تو اس کو شاہ راہ عام پر کوڑے لگائے گئے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس بے ڈھنگے انتظام کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک زرخیز ہونے کے باوجود مفلس تھا اور رعایا تنگ دست تھی اور بہت سے قصبات ویران ہو گئے تھے۔ یا غالباً یہ لوگ اپنی حکام اور ٹھیکہ داروں سے بچنے کے لیے اپنا اندوختہ چھپاتے تھے لیکن ابوالحسن قطب شاہ کے عہد حکومت میں جبکہ مادنانا دیوان تھا اس بے ڈھنگے طریقے کو مسدود کر دیا گیا۔ اجارہ داروں کے بجائے جن سے ملک کو نقصان پہنچ رہا تھا

حصول مالگزاری کے لیے تنخواہ یا باج حکام مقرر کیے گئے اس جدید انتظام سے ملک کو بہت فروغ ہوا۔  
صوبوں اور سرکاروں کی تقسیم حسب ذیل تھی۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کے چھ صوبے  
ستتیس سرکار اور پانچ سو سترہ سمت بنائے گئے تھے :-

- صوبہ ۱۔ سرکار محمد نگر۔ سرکار میدک۔ سرکار کولاس۔ سرکار ملنکور
- صوبہ ۲۔ سرکار ایلگندل۔ سرکار ورنگل۔ سرکار انجم میٹ۔ سرکار دیورکنڈہ
- صوبہ ۳۔ سرکار پانگل۔ سرکار مصطفیٰ نگر۔ سرکار بھونگیر۔ سرکار آگرکرا
- صوبہ ۴۔ سرکار کوئل کنڈہ۔ سرکار گھن پورہ۔ سرکار مرتضیٰ نگر۔ سرکار مچھلی پٹن
- صوبہ ۵۔ سرکار نظام پٹن۔ سرکار ایلور۔ سرکار راج بندری۔ سرکار سیکا کول
- صوبہ ۶۔ کرناٹک، یعنی ارکاٹ، اس میں ۱۶ سرکار تھے

قطب شاہوں کی فوجی تنظیم بھی خاطر خواہ تھی۔ تمام قطب شاہی فوج دارالسلطنت اور صوبوں و اضلاع میں  
پھیلی ہوئی تھی تاکہ جہاں ضرورت ہوتی اس سے کام لیا جاتا تھا اگرچہ دارالسلطنت میں عین الملک وزیر فوج کا  
ذمہ دار تھا مگر اس کے علاوہ ایک اور عہدہ دار بخشی اسمالک کے خطاب سے اس غرض کے لیے مقرر ہوتا تھا کہ وہ فوج  
بھرتی کرے اور ان کی تنخواہیں تقسیم کرے۔ نیز میر جملہ فوج کی تنقیح کرتا تھا تاہم بادشاہ بھی براہ راست فوج کا معائنہ کرتے  
اور اس سے وابستہ رہتے تھے۔ یہ روایت مشہور ہے کہ ہفتے میں دو تین مرتبہ گولکنڈے میں تمام فوج مشرقی دروازے سے  
داخل ہو کر شاہی سلام کی عزت حاصل کرتی تھی اور بادشاہ شاہ نشین پر بیٹھ کر سلام لیا کرتے تھے پچھلے قطب شاہ تو

۷۔ یہ تقسیم ابوالحسن قطب شاہ کے عہد کے ایک گوشوارے سے لی گئی ہے۔ اس میں سوائے کرناٹک کے اور  
صوبوں کے نام درج نہیں ہیں۔ یہاں امتیاز کے لیے ۱۔ ۲۔ ۳ کے بعد سوں سے واضح کیے گئے ہیں۔  
تاریخ ظفرہ ص ۱۷۴۔

خود فوج کی کمان کرتے تھے۔ سلطان قلی۔ جمشید۔ ابراہیم اور محمد قلی قطب شاہ نے اکثر موقعوں پر خود فوجوں کی رہنمائی کی اور میدانِ کارزار میں غنیمت کا مقابلہ کیا تھا۔ جو فوجیں صوبوں میں متعین تھیں وہ متعلقہ صوبہ داروں کی نگرانی اور قیادت میں تھیں۔ کیونکہ صوبہ دار سر لشکر بھی تھے بعض صوبوں میں جہاں فوجی نقل و حرکت زیادہ ہوتی تھی کثیر فوجیں متعین تھیں۔ چنانچہ کرناٹک میں جب محمد سعید میر جملہ اور نیک نام خاں طرفدار تھے چالیس ہزار فوج تھی محمد سعید نے اپنے ذاتی خرچ سے پانچ ہزار فوج علیحدہ نوکر رکھی تھی۔ غالباً شمالی اور مغربی صوبوں میں بھی جہاں سرحدی جدبست کا سوال تھا زیادہ فوجیں متعین ہوں گی۔ مرکزی اور صوبہ داری فوجوں کی جملہ تعداد کوئی پانچ لاکھ بتائی جاتی ہے۔ یہ فوجیں دو طرح کی تھیں۔ فوج کا ایک حصہ نظام جاگیر کی رو سے امرا اور جاگیرداروں کے ذمے تھا کہ جب سلطنت کو ضرورت ہو یہ فوج کی مقررہ تعداد ہم پہنچائیں اور فوج کے مصارف کے لیے ان کو زمینیں اور جاگیریں دی جاتی تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالعموم اتنی فوج نہیں رکھتے تھے جو ان کے ذمے مقرر تھی بلکہ اس سے کم یا صحت کے ساتھ کہا جائے تو بالعموم اس کی آدھی فوج رکھتے تھے اس کے علاوہ قطب شاہی سلطنت میں مستقل فوج بھی تھی۔ یہ فوج عبداللہ قطب شاہ اور اس کے پیشرو عہد ہائے حکومت میں بھی پائی جاتی ہے۔ تھیو تو کہتا ہے کہ عبداللہ اپنی فوج کی تنخواہ ادا کرتا ہے۔ ابو الحسن قطب شاہ نے چالیس ہزار کی تعداد میں اپنی ایک خاص فوج بنائی تھی جن کی تنخواہیں وہ خود دیا کرتا تھا۔ اس کے وزیر مالدانے دس ہزار سواروں کا ایک علیحدہ رسالہ تیار کیا تھا۔

---

۱۔ تھیو تو کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی فوج کی تعداد پانچ لاکھ ہے لیکن اسی کا بیان یہ ہے کہ امراء اتنی فوج نہیں مہیا کرتے جتنی ان کے ذمے ہوتی ہے بلکہ آدھی فوج مہیا کرتے ہیں تو اس لحاظ سے تقریباً ڈھائی لاکھ فوج ہوئی (سیاحت نامہ تھیو نو حصہ سوم ص ۱۰۲-۱۰۳)۔

۲۔ ابو الحسن نے اپنے خسر عبداللہ قطب شاہ کے خزانے سے ایک بڑی رقم حاصل کی تھی اور اس رقم سے چالیس ہزار کی ایک بڑی فوج نوکر رکھی تھی اور اس کی تنخواہ ماہ بہ ماہ وہ خود دیا کرتا تھا (ماہ نامہ ص ۲۱۷)۔

ابو احسن قطب شاہ کی فوج کی تعداد جو مرکز میں تھی پچپن ہزار سوار، چھیا تو ہزار پیدل اور باقی یورپی سپاہی تھے اور ان کی تنخواہوں کا خرچ :-

سوار - ایک کروڑ سولہ لاکھ

پیدل - سولہ لک سولہ لاکھ

اور رکابہ فرنگ - ایک لک سولہ لاکھ

ہوتا تھا۔ فوج کو باضابطہ قواعد پر یڈ سکھائے جاتے تھے۔ فوج میں مسلمان اور تلنگی سپاہی ہوتے تھے اور غالباً تلنگوں کی کثرت تھی مسلمانوں میں زیادہ تر مغل اور ایرانی تھے اور یہ مرکزی فوج میں زیادہ پائے جاتے تھے ان کی تنخواہ دس ہون ماہانہ ہوتی تھی تو تلنگوں کی دو ہون ماہانہ تھی، لیکن اول الذکر کو دو گھوڑے اور چار پانچ نوکر رکھنے پڑتے تھے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں تلنگے سپاہیوں کی تنخواہ زیادہ تھی کیونکہ اس زمانے میں مغل اور ایرانی بہت کم تھے۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل اور ایرانی بہت جمع ہو گئے۔ ابو احسن قطب شاہ کے عہد میں یورپی سپاہی بھی فوج میں مامور تھے مسلمان سواروں کی وردی قبا، اور سرخ پگڑی ہوتی تھی، اوپر سے زرہ اور سر پر خود پہنتے تھے اور تلوار و نیزے سے مسلح ہوتے تھے۔ پیادے تلون نما سرخ رنگ کے پانچا پہنتے تھے اور ان کے سر پر سیاہ کلاہ ہوتی تھی اور تلوار، بحالوں سے مسلح ہوتے تھے۔ کرناٹکی سواروں کی وردی، پانچامہ زانو تک،

۱۔ تاریخ ظفرہ ص ۱۷۵۔

۲۔ حدیقۃ السلاطین ص ۷۲۔ نصیر الملک جو نسریل شاہی تھا لشکر اور زرش سواری کہ در معرکہ کارنا وغیرہ است میفرمود۔

۳۔ سیاحت نامہ تھیو نو جلد سوم ص ۱۰۰۔

۴۔ تھیو نو کہتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں اکثر امراء ایرانی ہیں یا ان کی اولاد ہیں۔

سیاہ رنگ کا کچھ اور سریر سرخ رنگ کی پگڑی ہوتی تھی اور یہ تلوار سے مسلح ہوتے تھے۔ تلنگی سپاہی دھوتی، کچھ اور پگڑی پہنتے تھے۔ اور نانگواریوں کی وردی زیادہ اچھی ہوتی تھی کیونکہ یہ افسر ہوتے تھے۔ تمام سلطنت میں (۶۶) قلعے تھے اور یہ سب بلند پہاڑیوں پر بنائے گئے تھے، منجملہ ان کے کونڈ بیر، کونڈ پلی، گولکنڈہ، گھنپورہ۔ پانگل، کھم میٹھ کے قلعے بہت مستحکم تھے۔ ہر قلعے میں (۱۲۰۰) سپاہی رکھے جاتے تھے۔ کونڈ پلی اور کونڈ بیر میں جو بڑے قلعے تھے تین ہزار، چار ہزار سپاہی پائے جاتے تھے، اور سب تلنگے تھے اور قلعہ دار نایک ہوتے تھے۔ ان قلعوں کا اس قدر باضابطہ انتظام اور نگرانی تھی کہ رات کو قلعہ دار نایک بھی شاہی احکام کے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے جب کبھی نایک دن کو باہر جاتا تھا اور اس کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ رات ہونے سے پہلے اندر نہیں آسکے گا تو اس کی وہ بادشاہ سے خاص اجازت لیتا تھا، اور اجازت بھی خاص مواقع پر دی جاتی تھی ورنہ نہیں۔ راتوں کو ایک قلعے سے دوسرے قلعے کو مشعلوں کی حرکت سے خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔ مرکزی قلعہ گولکنڈے کی مدافعت کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ اس کی مثال ہندوستان بھر میں نہ تھی چنانچہ اس کے آخری محاصرے کے وقت اس کی اچھی خامی آزمائش ہو گئی اور مغل محاصرین ہار مان گئے۔

گولکنڈے کی معاشرت بہت بلند اور پاکیزہ تھی۔ چونکہ قطب شاہ خود بہت پاکیزہ معاشرت گولکنڈے کی معاشرت کے دل دادہ تھے، اس کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ بادشاہوں کی خامگی اور درباری زندگی اس قدر شان دار تھی کہ دوسرے ہمعصر شاہی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ان کے عظیم الشان دربار، شان دار جلوس، فلک بوس محل اور پیر لطف علمی و سماجی محفلیں ان کی عظمت کا ثبوت دیتی تھیں ان کے طریقہ بوجھ و کار کا

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات سیلک سومائٹی ص ۱۱۔

۲۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۹۔

۳۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۲۔

اندازہ کسی قدر ان کی عمارتوں سے ہوتا ہے۔ بعض عمارتیں اس وقت موجود ہیں اور بعض کی صفحات تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے۔ شاہی بارگاہ تو کجا ان کے رہنے کے قعر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مشکل سے مثال ملے گی۔ اندر سے بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلوریں آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغبنانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ ایک مغل شہزادے نے جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ شاہی درباروں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں شاہی جلوس بھی اسی قدر شان دار ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتے تھے اور ان کے ساتھ بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ امراء اور وزراء گھوڑوں اور پالکیوں میں جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور ایک بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں کے مقبرے بھی بڑے شان دار بنائے جاتے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ قبروں پر بہترین فلکات پہنائے جاتے تھے اور قبروں کے ارد گرد قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے اور سونے چاندی کی شمعیں روشن کی جاتی تھیں اور ہر روز غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ امراء کی زندگی بھی کچھ کم شان دار نہ تھی۔ یہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزل بلند ہوتی تھیں۔ ان کا جلوس بھی ایسا ہی شان دار ہوتا تھا کہ گویا خود بادشاہ ہوں کا جلوس ہے۔ جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہمراہ بھی ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں اور بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا اور سب کے پیچھے ان کا ہاتھی یا پالکی ہوتی تھی۔

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶۔

۲۔ سیاحت نامہ تھیونو ص ۱۰۳۔

۳۔ سیاحت نامہ تھیونو۔ نیوریر نے اس جلوس کی بڑی تفصیل لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے دس بارہ ہاتھی ہوتے ہیں اور یہ تعداد ان کے رتبہ امارت کے مطابق ہوتی ہے ان پر ہو دے یا عماریاں ہوتی ہیں اور ایک ہاتھی پر چھٹا ہوتا ہے۔ ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی قطار ہوتی ہے ان کے پیچھے "اٹ" ہاں آتی ہیں جن کے ساتھ



ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ بھی بہت پاکیزہ اور پُر تکلف زندگی بسر کرتا تھا۔ شہر حیدر آباد میں دو لاکھ مکانوں کی گنتی کی گئی تھی اور ہر مکان کے رہنے والے اوسط دو آدمی قرار دیے جائیں تو شہر کی چار لاکھ آبادی ہونی چاہیئے۔ اس لحاظ سے یہ قرون وسطی کا بہت بڑا شہر تھا۔ اسی آبادی اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر ایک مغل مورخ نے ”آبادی وسیع تر از احاطہ خیال“ اور ”عمارات رفیع تر از پایہ اندیشہ“ کہا تھا جو قطب شاہی تمدن کی بہت بڑی دلیل ہے۔ غالباً شمال کے شہنشاہی شہر بھی اتنے آباد نہیں تھے، اور آبادی میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ تاجر۔ عہدہ دار۔ قانون داں۔ مہاجن۔ صنّاع اور جوہری، لیکن اس میں باہر کے لوگ، یعنی مغل امیرانی۔ ترک زیادہ تھے جو حیدر آبادی تھے، ان کی معاشرت بے حد پُر تکلف تھی، اول تو ان کے رہنے بسنے کے مکانات نہایت شان دار اور بلند ہوتے تھے پھر ان کے در و دیوار سے بلند پایہ تمدن ٹپکتا تھا۔ سونے اور چاندی کی اشیاء کے علاوہ چینی کے ظروف، روشنی کے جھاڑ استعمال ہوتے تھے جن کو مورخ ”چینی آلات“ کہتے ہیں۔ شیشے اور بلوریں ظروف باہر سے جہازوں میں بھر کر آتے تھے اور مسولی ٹیم و حیدر آباد کے بازاروں میں بہ کثرت فروخت ہوتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۹۵ء میں حیدر آباد کی لوٹ ہوئی تو ہزار ہا قسم کی چیزیں ظروف اور کپڑے باہر کھلے اور قایمین کے بہترین فرش راستوں پر نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر خود مغلوں کو حیرت ہوئی اور ان اشیائے تمدن سے گھراتے بھرے ہوئے تھے کہ لوٹ مار کے باوجود یہ خالی نہ ہوئے۔ حالانکہ چار پانچ کروڑ کی لوٹ ہو چکی تھی۔ ان حقیقتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کا

پیدل ملازم ہوتے ہیں پھر ان کے پیچھے صاحب جلوس آتے ہیں اور ان کے پیچھے سوار اور پیدل ہوتے ہیں (منوچی جلد اول ص ۱۲۶)۔  
۱۔ مآثر مالگیری ص ۳۰۲۔

۲۔ سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم۔ ۳۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۲۔

۳۔ حافی جلد دوم ص ۳۰۶۔

۴۔ مآثر الامراء جلد دوم ص ۵۳۳۔

متوسط طبقہ جس قدر تمدن تھا اس کی مثال اور جگہ نہ تھی۔

چونکہ گولکنڈے کی آبادی میں ہمیشہ باہر سے اضافہ ہوتا رہا، یعنی ایرانی اور مغل بہت آتے تھے

لباس | اس لیے یہ لوگ تو اپنا وطنی لباس اور وضع قطع قائم رکھتے تھے، لیکن اہل گولکنڈے کے لباس و وضع قطع پر مقامی رنگ چڑھ رہا تھا، تین چار پشتوں کے بعد تو خود بادشاہوں کی وضع قطع اور لباس بالکل بدل گیا، اور اس میں دکنی رنگ غالب ہو گیا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے جو قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ ہے اپنے بدن سے ناتاری لباس بالکل اتار پھینک دیا تھا۔ سر پر سمور کی کلاہ کے بجائے دکنی وضع کی بیچ دار پگڑی۔ پوستیں اور بانانی قبا کے عوض ملل کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا، ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہوتے تھے اور ڈاڑھی منڈھاتا تھا جو بالکل دکنی بلکہ تلنگانے کی طرز تھی۔ اور اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دکن کے رسوم و روایات سے کس قدر شغف تھا۔ امراء اور عوام بھی جو متناسب بدن بلند قامت اور خوش رنگ ہوتے تھے تقریباً ہی لباس پہنے لگے تھے، یعنی بجائے قبا، اور پوستیں کے جو ترکستان اور ایران سے آئی تھی، جامہ اور نیمہ پہنتے تھے، اور کم درجے کے ملل کا انگرکھا اور جو بغلہ پہنتے تھے جو خاص دکن کا ہوتا تھا، اور سر پر دکنی وضع کی سفید یا رنگین پگڑی باندھتے تھے اور پیر میں آپٹا ہی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ جب عام لوگ بھی باہر نکلتے تھے تو کمر بستہ اور مسلح ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص تلوار اور لکڑی کے ہاتھ جانتا تھا جو دکن کا خاص فن ہے۔ جب امراء و دربار میں جاتے تھے تو سر پر دکنی دستار پہنتے تھے اور کمر میں بگوس باندھتے تھے۔ جہاں تک ہندو آبادی کا تعلق ہے خواہ وہ سپاہی ہوں یا غیر سپاہی ان کا لباس وہی تھا جو آج صدیوں پہلے تھا۔ کرناٹک کے

۱۔ مضمون مولوی غلام نیر دانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد رسالہ اردو ۱۹۲۱ء۔ یہ وضع قطع محمد قلی کی

ایک تصویر سے معلوم ہوتی ہے جو برٹش میوزیم میں ہے۔

۲۔ نیورنیر جلد اول ص ۱۲۸۔

باشندے سر پر لمبے بال چھوڑتے تھے اور عورتوں کی طرح اوپر جوڑا باندھتے تھے۔

اخلاقی حالت | اگرچہ اس زمانے کی اخلاقی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن قرائن یہ ہیں کہ ہر طبقے کی اخلاقی حالت اچھی تھی اور متوسط طبقے میں علمی سرگرمی بھی پائی جاتی تھی کیونکہ حیدرآباد کی جب لوٹ ہوئی تو اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ کتابیں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ صوم و صلوة کا بھی عام شوق تھا کیونکہ شہر اور اس کے نواح میں مساجد اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ شمار میں نہیں آتیں اور یہ سب قلب شاہی دور کی ہیں۔ لیکن ماننا پڑتا ہے کہ شہر حیدرآباد کی ترقی کے ساتھ اہل شہر میں تعیشات کی بھی کثرت تھی اور ہر جگہ عیش و عشرت کا سامان جمع ہو گیا تھا جو شہری زندگی کا خاصہ ہے۔ چونکہ قلب شاہی سلطنت میں اُمراء بہت تھے اور مالدار تھے اس لیے ان کی بے کاری اور فارغ البالی کی وجہ سے ملک میں عیش و عشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔ اس میں خود باشاہوں کی زندگی بھی اثر انداز تھی۔ یہ کچھ خلافت قیاس نہیں ہے کہ شہری تعیشات محمد قلی قلب شاہ کے عہد سے شروع ہو گئے ہوں کیونکہ بادشاہ خود عیش و عشرت کی طرف زیادہ مائل تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جانشین سلطان محمد قلب شاہ کی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے اس کی رفتار بہت دھن تک سست رہی، کیونکہ سلطان محمد اپنے زمانے کے بڑے زاہد اور پیارے ساتھے چنانچہ ان کے دن رات مذہبی فرامین کی ادائیگی میں گزرتے تھے، ان کا اخلاقی اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ عبداللہ قلب شاہ کے عہد میں یہ بات باقی نہیں رہی، بلکہ اس عہد میں پھر عیش و عشرت کے دروازے کھل گئے اور یہ شاہی زندگی کا لازمہ قرار دیا گیا۔ عبداللہ کو رقص و سرود کا بہت شوق تھا چنانچہ مقامی عیش و عشرت سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ لاہور۔ آگرہ اور برہان پور سے عیش و عشرت کا سامان جمع کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شاہی زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑتا ہے۔

۱۔ نیورنبرگ جلد اول ص ۱۲۷۔

۲۔ حدیقۃ السلاطین کا مولف کہتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں تلنگانہ۔ کرناٹک۔ احمدآباد۔ کابل۔ لاہور۔ آگرہ و برہان پور۔

چنانچہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں رقص و سرود کی محفلیں عام ہونے لگیں اور عیش و عشرت کی گرم بازاری ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی بغیر طوائف اور رقص و سرود کے نہیں ہوتی تھی۔<sup>۱</sup> جو ابوالحسن قلب شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی۔ غالباً انھیں مناظر کو دیکھ کر لوگ ابوالحسن اور اس کے عہد سے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

---

طوائف بلائی جاتی تھیں (مدنیۃ السلاطین ص ۳۶) یہ طوائف اکثر حیدرآباد میں قیام پذیر ہو گئیں اور ان سے عام اخلاق خراب ہوتے تھے، چنانچہ عہدائد کے عہد میں ٹیورنیر نے ان طوائف کی تعداد میں ہزار بتائی ہے، داروفہ کے رجسٹر میں ان کے نام درج ہوتے تھے (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۷)۔ غالباً ان کو خاص ہدائیں بھی ہوتی ہوں گی۔ تھیونر نے بھی ان موردوں کی تعداد کچھ اسی کے لگ بھگ بتائی ہے، یہ رنگ ابوالحسن کے عہد میں بھی قائم رہا۔ چنانچہ اس عہد میں طوائف کو سرکار سے تین لاکھ چوبیس ہزار روپیے دیے جاتے تھے (تاریخ ظفرہ ص ۱۷۵)۔

۱۔ گولکنڈہ کے تعلقات ص ۱۷۱۔

# بائیسواں باب

## معاشی حالت

دکن کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت زیادہ مالدار و خوش حال تھی۔ کیونکہ اس سلطنت کو آمدنی کے جو قدرتی اور انتظامی ذرائع حاصل تھے وہ دوسری سلطنتوں کو میر نہ تھے اول تو یہ سلطنت بہت وسیع تھی بابر ایم قطب شاہ کے عہد سے جوں جوں کرناٹک کے اضلاع سلطنت میں ضم ہوتے جاتے تھے یہ سلطنت بہت پھیلتی گئی اور ان فتوحات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا یہاں تک کہ یہ ساحل کارومنڈل کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئی چنانچہ زمینوں کی نوعیت کے اعتبار سے اس سلطنت کے دو حصے کیے جاسکتے ہیں، ایک تو ساحل کارومنڈل کا مستقل حصہ جو سمندر کے متوازی چلا گیا تھا، اسی میں دریائے کرشنا اور گوداوری کی سیراب زمینیں بھی شامل تھیں اور اس کے بعد ملک کا اندرونی حصہ تھا جس میں مشرقی گھاٹ اور کن کنی سطح مرتفع داخل تھی یہ دونوں خطے زرخیز اور بہت ہی حاصل تھے اس بحافہ سے یہ کہنا صحیح تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں ایک قطعہ زمین بے مزرعہ نیست تھی۔ نیز باہر کے سیاح بھی اس سلطنت کی زرخیزی کے بہت مدح سرا ہیں۔ اگرچہ طریقہ مالگزاری کی خرابی سے رعیت کو نقصان پہنچتا تھا تاہم آخری زمانے میں اس کی بہت کچھ اصلاح ہو چکی تھی۔ ویران دیہات آباد ہوئے اور نئے تالاب و باؤلیاں کھدوائی گئی تھیں اس سلطنت میں

---

۱۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے جو اس نے ہمیشہ نانم دکن کے لکھا تھا (رقعات عالمگیری)۔

۲۔ بیورنیر کہتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت بہت زرخیز ہے (سیاحت نامہ بیورنیر جلد اول ص ۱۲۱)۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۸

ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا تھا۔ گیہوں۔ چاول۔ جوار۔ باجرا۔ مونگ۔ چنا۔ مسور۔ تور۔ تل۔ بہتات سے پیدا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کپاس۔ تمباکو اور ارند کی بہت پیداوار تھی۔ تمباکو اور تازی سے بہت محصول وصول ہوتا تھا۔ پھلوں میں آم۔ موز۔ لیمو۔ انار۔ انناس بہت پیدا ہوتے تھے ان کے علاوہ سنگترے اور امرود بھی پیدا ہوتے تھے۔ مزرعہ زمینوں کے علاوہ اس سلطنت میں جنگلات بھی بہت تھے جس کی لکڑی اور بھانوروں سے بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ جنگلات میں شیر۔ ہاتھی۔ ریچھ۔ چیتے۔ بند۔ ہرن اور میتل پائے جاتے تھے جو اب بھی ہیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کو اپنے چھ صوبوں کی زرعی پیداوار سے جن میں (۳۷) سرکار اور (۵۱) پرگنہ تھے کافی محاصل وصول ہوتے تھے۔

معدنیات | مزرعہ وغیرہ مزرعہ زمینات کے علاوہ قطب شاہی سلطنت کو معدنیات سے بھی غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی اور خصوصاً گولکنڈہ اپنے ہیرے کی کانوں کی وجہ سے نہ صرف دنیا میں مشہور تھا بلکہ بہت مالدار تھا اور دکن کی کوئی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی ہیروں کی بہتات کی وجہ سے جو اس سلطنت میں پیدا ہوتے تھے اس کو بالعموم ہیرون کا ملک کہتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سلطنت کے حدود میں ہیروں کی کانیں کب دریافت ہوئی تھیں اور کس زمانے سے ہیرے زمین سے کھودے جانے لگے۔ ایک روایت یہ ہے کہ سولہویں صدی کے اوائل میں ایک اتفاق سے یہاں ہیروں کا پتہ چل گیا۔ قوانین یہ ہیں کہ یہ معدن سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں دریافت ہوئے ہیں، اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس دریافت میں ترقی ہو گئی اور ایک کان سے دوسری کان کا پتہ چل گیا اور حکومت نے

۱۔ گولکنڈہ کے تعلقات ص ۸۵۔

۲۔ انگریز کمپنی کا لازم ولیم مینو لڈ، جو ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا بیان کرتا ہے کہ ایک روز اتفاق سے ایک چرواہے کا چراگ تھوڑے سے ٹکرا پڑا اس نے پتھر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ چمک دار ہے، اس نے معمولی داموں میں فروخت کر دیا۔ گولکنڈہ کے تعلقات ص ۱۳۰، یہ سلطان محمد قطب شاہ کا عہد تھا، غالباً اسی عہد میں یہ معدن دریافت ہوئے تھے۔

ان کی نگرانی شروع کر دی پھر تلنگانے سے آگے بڑھ کر نائٹک میں یہ معدن دریافت ہو گئے، کھودنے والوں کو اتنی مشق اور  
 مہارت ہو گئی تھی کہ شیلے کی نوعیت، بو اور زمین کے رنگ سے ان کا پتا چلا لیتے تھے چنانچہ جب محمد سعید میر جملہ نے  
 کڑا پاسدھوٹ، کدئی کوٹ مسخر کیے تو یہاں بھی بے شمار معدن دریافت ہوئے اور لاکھوں روپیوں کے ہیرے  
 برآمد ہوئے اور اتنے ہیرے نکلے کہ ایک دو کی گنتی کرنے کی بجائے تھیلوں کی گنتی کی جاتی تھی۔ محمد سعید نے شاہجہاں کی  
 خدمت میں اپنی کمائی سے کوئی چالیس لاکھ کے ہیرے پیش کیے تھے اور ایک بہت بڑا ہیرا نذر کیا تھا جس کا وزن  
 (۳۶۰) قیراط تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کرناٹک سے کتنے ہیرے جمع کیے تھے۔ اگر ہیروں کی خوبی اور قیمت کا اندازہ  
 کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ہیرے گو لکنڈے کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ اور  
 ابوالحسن قطب شاہ کے جواہر خانوں میں بے شمار ہیرے تھے جو (۳۰۰) قیراط سے کم وزنی نہ تھے بلکہ اس سے زیادہ تھے۔  
 عبداللہ کے تاج میں بہترین ہیرے تھے۔

قطب شاہی سلطنت میں (۲۳) کانیں پائی جاتی تھیں، یہ کچھ تلنگانے میں تھیں اور کچھ کرناٹک میں۔  
 کوٹڈ پٹی جو دریائے کرشنا سے بہت قریب ہے اور نرسا پور جو راج مندری سے جانب جنوب (۳۹) میل کے  
 فاصلے پر واقع ہیں ہیروں کے مخزن تھے، یہاں متعدد کانیں دریافت ہوئی تھیں۔ ہر سا پور میں تو ہیروں کی  
 بہترین کانیں تھیں جہاں سے عمدہ اور بڑے ہیرے حاصل ہوتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب  
 گو لکنڈہ مغلوں کے زیر اثر آ گیا تو مغل شہنشاہ کی نظر اسی نرسا پور پر پڑنے لگی، چنانچہ اسی خوف سے یہاں کی

---

۱۔ گو لکنڈے کے تعلقات ص ۳۲۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے کو لور میں ہیرے دریافت ہوئے تھے اور  
 اس کا باعث یہ جملہ تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

۲۔ منوچی جلد اول ص ۲۳۔

۳۔ سیاحت نامہ حصہ سوم۔ یہ بادشاہ کے تاج کے ہیروں کی بہت تعریف کرتا ہے۔

کانیں بہت دنوں تک بند کرادی گئیں۔ اس کے علاوہ کندی کوٹ اور کولور میں جو کرناٹک میں ہیں بے شمار کانیں تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کانوں میں بیس ہزار آدمی کام کرتے تھے، منجملہ ان کے بعض مزدور کان کھودتے تھے اور بعض مٹی نکالتے تھے اور بعض پانی خارج کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان مقامات میں جو پہلے ویران تھے اب بہت آباد ہو گئے تھے۔ اکیسے کندی کوٹ کی کانوں میں محمد سعید نے کان کنی کے لیے بارہ سو آدمی مقرر کیے تھے۔ ان کانوں سے بہت آمدنی ہوتی تھی اور قطب شاہی سلطنت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ بعض کانوں کو بادشاہ نے محض اپنے استعمال کے لیے مختص کر لیے تھے، یا ولیم میٹھولڈ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو دس قیراط سے زیادہ وزنی ہیرے سب بادشاہ کے لیے مختص تھے اور ان کی نگرانی کے لیے کہ ان میں کوئی چوری نہ جائے بادشاہ اپنے حاکم مقرر کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ہیرے چوری جاتے تھے۔ اور باقی معدن تاجرا اور ٹھیکہ داروں کے سپرد کر دیے جاتے تھے کہ وہ شاہی محصول کے تحت کان کنی کر کے ہیرے حاصل کریں اور بازار میں فروخت کر لیں، یعنی جو لوگ ان کانوں سے ہیرے نکالنے کا گتہ لیتے تھے، سرکار ان سے ہر کان میں فی گھنٹہ ایک ہون شاہی معاوضہ لیتی تھی خواہ انہیں ہیرے دستیاب ہوں یا نہ ہوں۔ یا بعض کانیں تین لاکھ ہون سالانہ معاوضے پر دی جاتی تھیں۔ ہیروں کے علاوہ معدنیات میں



لوہا۔ فولاد۔ سیمہ بھی ملتا تھا اور باہر بھیجا جاتا تھا۔ گولکنڈے کا لوہا اور فولاد تو بہت مشہور تھا۔ سیاح کہتے ہیں کہ گولکنڈے میں لوہا بے حد پیدا ہوتا تھا اور اس کے فولاد کی دور تک شہرت تھی اور یہ پنجاب۔ لاہور۔ ایران جایا کرتا تھا، اسی کی دمشق تلواریں بنتی تھیں۔

صنعت

گویہ صحیح ہے کہ گولکنڈہ ایک زرعی ملک تھا تاہم اس میں صنعت و حرفت کو بھی بہت فروغ تھا۔ کیونکہ جوں جوں قطب شاہی تمدن ترقی کرتا گیا اس کی تمدن زندگی کے لیے بے شمار مصنوعات کی ضرورت ہوئی اور بادشاہ سے لے کر غریب آدمی تک ہر صاحب ذوق نے اس میں اضافہ کیا چنانچہ جب شہر حیدرآباد آباد ہوا تو اس کے پرانے اور نئے تمدن کے لیے بے شمار مصنوعات تیار ہونے لگیں اور ملک میں صنایع اور اہل حرفہ جمع ہونے لگے۔ ایک مغل مورخ کہتا ہے کہ حیدرآباد میں اتنے ہنرمندوں۔ پیشہ وروں۔ کارگروں تھے کہ ان کی تفصیل کے لیے ایک جلد کی ضرورت ہے۔ مصنوعات میں کپڑا گولکنڈے کی خاص پیداوار تھی۔ کپڑا تمام ملک میں بنایا جاتا تھا۔ غالباً یہ پہلے پہل مقامی ضروریات کے لیے بنایا جاتا تھا لیکن بعد کو اس کی باہر بھی برآمد ہونے لگی۔ اہل گولکنڈہ کے لطیف ذوق نے اس صنعت میں بڑا اضافہ کیا، ایسے اچھے کپڑے تیار ہوتے تھے کہ دوسری جگہ ان کی مثال نہیں تھی۔ جولاہے کسی کارخانے میں کام نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے گھر میں کام کرتے تھے اور خریدار پیشگی روپیہ دے کر اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق اچھے کپڑے تیار کرواتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر روز نیا کپڑا تیار ہوتا تھا، بافت و رنگ اور وضع میں ہر روز نئی اختراعیں پیدا ہوتی تھیں۔ کپڑے کی دو بڑی قسمیں تھیں، ایک سادہ اور دوسرے وضع دار۔ سادہ میں تن زیب اور کفن دار ہوتے تھے کفن دار کپڑے بھی مختلف قسم اور دبازت و رنگ کے تیار کیے جاتے تھے اور بعض بہت مضبوط بھی ہوتے تھے۔ تن زیب جو پتلا کپڑا ہوتا ہے مختلف رنگ کا تیار ہوتا تھا، اور ورمل میں بنایا جاتا تھا اور

یہ دونوں کپڑے سمندر کے راستے سے دوسرے ملکوں کو بھی جاتے تھے ان کے علاوہ وضع دار کپڑے مختلف نقش و نگار کے ساتھ بنائے جاتے تھے جن کو چھینٹ کہتے ہیں، ان پر بڑی محنت اور ترکیب کرنی پڑتی تھی۔ یہ تن زیب اور کفن دار کپڑے سے بنائے جاتے تھے لیکن ان پر رنگ کے چھاپے کیے جاتے تھے اور سادے کپڑوں پر قلمکار ہوتا تھا جو اپنے زمانے کی نایاب چیز تھی اور ایسا کہیں نہیں تیار ہوتا تھا اگرچہ رنگین نقش و نگار ہاتھ اور قلم سے بنائے جاتے تھے لیکن یہ اس قدر پچے ہوتے تھے کہ دہلنے سے کبھی بدرنگ نہیں ہوتے تھے بلکہ کپڑا پھٹنے تک رہتے۔ یہ کپڑے بالعموم ساحلی علاقوں میں اور بالخصوص مسولی پٹم اور نرسا پور میں تیار ہوتے تھے اور ہندوستان میں مشہور تھے مسولی پٹم کا قلمکار اس قدر مشہور تھا کہ ہندوستان میں کہیں نہیں پیدا ہوتا تھا، اور اس کی دور دور تک مانگ تھی۔

دوسری مصنوعات میں لوہے کے اوزار اور اسلحہ شامل ہیں۔ گولکنڈے کی سلطنت میں اچھا فولاد تیار ہوتا تھا، اور اس کے ہتھیار بنائے جاتے تھے۔ نرمل اور اندور میں جو گولکنڈے کے شمال میں واقع ہیں فولاد کی اچھی صنعت قائم تھی، یہاں اچھا فولاد تیار کیا جاتا تھا۔ تھیونو کہتا ہے کہ اندولائی میں جو اندور یا نظام آباد کے قریب ہے تلوار، خنجر اور نیزے تیار ہوتے ہیں اور تمام ہندوستان میں جاتے ہیں۔ لکڑی کی صنعت بھی اچھی ہوتی تھی اور اس کے عمدہ صندوق قلمدان اور دوسرا گھریلو سامان تیار ہوتا تھا، اور ان پر اچھی پالش کی جاتی تھی۔ یہ صنعت ابھی تک کوٹڈیلی میں جاری ہے۔ نرسا پور پیٹ جو دریائے گوداوری پر واقع تھا اپنی صنعت کی وجہ سے بہت مشہور تھا، یہاں جہاز تیار ہوتے تھے، چنانچہ یہاں متعدد کارخانے تھے جن میں مسلمان، ہندو

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۵۔ منوچی جلد دوم ص ۲۳۱۔

۲۔ بلگرامی اور ولوٹ جلد اول ص ۳۹۹۔

۳۔ سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۲۳۵۔

اور پرتگالی اپنے جہاز تیار کرواتے تھے اور انھیں جہازوں کے ذریعے مختلف سامان ندیوں کے راستے سے باہر بھیجا جاتا تھا۔ یہاں بحری سفر کے قابل بڑے جہاز بھی بنتے تھے۔ چنانچہ انگریز کمپنی کا ملازم شورر کہتا ہے کہ انگریزوں نے بھی یہاں ”گلوب“ نامی اپنا ایک جہاز تیار کروایا تھا، اس کے علاوہ ناگلو پنجا میں نیل تیار کی جاتی تھی اور اس کی برآمد ہوتی تھی۔ مسولی پٹم میں بارود اور کارتوس بھی بنتے تھے اور جہاز کے بادبان بھی تیار ہوتے تھے۔ مسولی پٹم میں نمک بھی بنایا جاتا تھا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس زمانے میں سلطنت گولکنڈہ قائم ہو رہی تھی مغربی اقوام ہندوستان کا راستہ تجارت دریافت کر رہی تھیں ان اقوام نے بھی چند ہی دنوں میں ہندوستان کے ساحلوں پر اپنے قدم جمالیے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے آنے سے ہندوستان کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ گولکنڈے کی سلطنت مشرق میں واقع تھی اور جب یہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مشرقی ساحل کا رومنڈل پر قابض ہوئی تو اس کے سامنے تجارت کی بہت سی راہیں کھل گئیں۔ سولہویں صدی میں صرف پرتگالی یہاں آئے تھے لیکن سترہویں صدی میں انگریز اور ولندیزی بھی یہاں متکمن ہو گئے، چنانچہ انھوں نے پٹی کٹ۔ سان تھوم اور مسولی پٹم میں اپنی کمپنیاں قائم کر لیں۔ جب یہ بندر گاہیں قطب شاہی مملداری میں آگئیں تو ان سے قطب شاہی سلطنت کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن کے عہد میں مسولی پٹم نے اتنی ترقی کر لی کہ یہ اس زمانے کی بھٹی ہو گئی۔ یہ نہ صرف صنعت و حرفت کا بڑا مرکز تھا بلکہ انگریز اور ولندیزی کمپنیوں کی وجہ سے جو یورپ اور مشرقی ممالک سے تجارت کرتی تھیں اس کی حیثیت بین الاقوامی تھی اور اسی بندرگاہ کی وجہ سے جس کو مچھلی بندر بھی کہتے تھے قطب شاہی سلطنت کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ یورپ اور ایشیا کے لوگ اس سلطنت سے واقف ہوئے اور یہاں کی مصنوعات اور معدنیات باہر بہت فروخت ہوتیں اور

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۳۔

۲۔ ناگلو پنجا، کم میٹ میں جنوب مشرق بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

۳۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۴۔

استمال کی باقی تھیں۔ گولکنڈے کی تجارت خشکی اور سمندر دونوں راستوں ہوتی تھی۔ ایک طرف ملکی تاجروں نے اور مصنوعات بازار میں فروخت کرتے تھے اور ممالک غیر کی اشیاء اور مصنوعات کی درآمد کرتے تھے، مگر ان تاجروں کی تجارت میں زیادہ فروغ اس وقت ہوا جبکہ مغربی تاجروں کی بدولت ملک کی مصنوعات اور پیداوار خام ملک کے باہر جانے لگی اور بیرونی مصنوعات باہر سے آنے لگیں۔ چنانچہ یہ تاجر اپنا سامان بندرگاہوں پر لے جا کر فروخت کرتے تھے اور مغربی تاجروں سے بیرونی سامان حاصل کرتے تھے۔ قطب شاہی سلطنت بیرونی تاجروں کے مقابلے میں ملکی تاجروں کے ساتھ زیادہ رعایت کرتی تھی اور ان سے بالعموم محصول نہیں لیتی تھی۔ اور آخری زمانے میں مغربی تاجروں پر یہ شرط عائد تھی کہ وہ ملکی تاجروں پر کوئی محصول عائد نہ کریں اس سے ملکی تجارت کو بہت فروغ ہوا، لیکن ملکی تاجروں میں زیادہ تر ایرانی تھے اور غالباً مذہبی یگانگت کی وجہ سے ایرانیوں پر شاہی عنایات کی جو چھار ہوتی تھی۔ ساحلوں پر یہ ایرانی تاجر بھرے ہوئے تھے اور غالباً شاہی عنایات کی وجہ سے یہ بد اخلاق اور بد مزاج ہو گئے تھے۔ لیکن دوسری طرف جو بحری تجارت ہوتی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ مسولی ٹیم کے ساحل سے ہر سال بنگال۔ اراکان۔ بیگو، اور تناسرم اور جزائر ملایا کو جہاز جایا کرتے تھے۔ ان جہازوں میں ہر قسم کا کپڑا۔ لوہا۔ فولاد۔ سفید و رنگین سوت۔ تمباکو، اور تیل جایا کرتا تھا جو گولکنڈے کی درآمد تھی، اور جب یہ جہاز واپس آتے تھے تو ان میں شکر، بعض قسم کے کپڑے۔ یا قوت۔ نیلم۔ لاکھ۔ سونا۔ ٹین، مختلف قسم کی لکڑی۔ مرتبان۔ ریشم۔ سیاہ مرچ۔ آتی تھی۔ بعض جہاز سیلون اور ملدیو کو بھی جایا کرتے تھے اور وہاں کی خاص اشیاء لایا کرتے تھے اور یہ تمام اشیاء مسولی ٹیم میں فروخت ہوتیں، اور ملکی تاجران کو خرید کے بازاروں میں لاتے تھے۔ درآمد میں یہ چیزیں بھی تھیں:- سیاہ مرچ۔ صندل کی لکڑی۔ سیسہ۔ چین کا ریشم۔ شکر۔ مشک۔ مسام دار، مٹی کے برتن۔ مرغ کپڑے۔

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶-۵۸۔

۲۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۰۔

چین کا مغل۔ لاکھ۔ بلوریں ظروف، وغیرہ۔ درآمد و برآمد پر ۱۲ فی صدی محصول بہ شکل جنس یا عہدہ دار کی صوابدید سے بہ شکل زر محصول لیا جاتا تھا، یہ محصول سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ ان محاصل درآمد و برآمد کے علاوہ مدراس اور مسولی ٹیم کے توطن کا کرایہ بھی وصول کیا جاتا تھا۔ پلی کٹ میں درآمد، برآمد کا محصول دو فی صدی تھا لیکن ہر جہاز سے جب وہ بند گاہ پر لنگر انداز ہوتا پندرہ ہون زیادہ محصول لیا جاتا تھا۔ یہ جہاز بالعموم سپٹمبر میں مشرق اور جنوری میں مغربی ممالک کو جایا کرتے تھے، ان میں دیسی تاجروں اور خصوصاً مسلمانوں کے جہاز بھی تھے اور مغربی کمپنیوں کے جہاز یہ سامان یورپ لے جاتے تھے۔

ان قدرتی اور انتظامی ذرائع کی بدولت جن کا اوپر ذکر ہوا، قطب شاہی سلطنت کی آمدنی ملک کی خوش حالی | خاطر خواہ تھی۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد کے ایک گوشوارے سے سلطنت کی آمدنی دو کروڑ سیتالیس لاکھ پچاس ہزار پانچ سو تیس روپیہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل سرکار اور پریگنوں کے اعتبار سے حسب ذیل ہے:-

صوبہ ۱۔ سرکار محمد نگر ۱۲ پریگن	سرکار میدک ۱۳ پریگن	سرکار کولاس ۵ پریگن	سرکار ملکور ۳ پریگن
موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ
۱۳	۱۶	۸	۱۷

صوبہ ۲۔ سرکار ایلیگندل ۱۲ پریگن	سرکار ورنگل ۱۲ پریگن	سرکار کھم میٹ ۱۱ پریگن	سرکار دیو کنڈہ ۱۳ پریگن
موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ
۱۴	۸	۱۳	۱۲

صوبہ ۳۔ سرکار مگل ۵ پریگن	سرکار مصلیٰ نگر ۲۲ پریگن	سرکار بھونگیر ۱۱ پریگن	سرکار اکرا ۶ پریگن
موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ	موسلمہ لکھ
۱۴	۱۵	۱۶	۱۲

انہ گولکنڈہ کے تعلقات ص ۵۲-۵۵۔

صوبہ ۴۔ سرکار کوئل کٹڈہ ۱۳ اپریل گئے سرکار گہن پورہ ۸ اپریل گئے سرکار تفتہ نگر ۳۹ اپریل گئے سرکار مچھلی پٹن ۸ اپریل گئے

لے	لے	لے	لے
لے	لے	لے	لے
لے	لے	لے	لے
۱۳	۱۴	۱۴	۱۴

صوبہ ۵۔ سرکار نظام پٹن محال سرکار رانی پور ۱۲ اپریل گئے سرکار راج بندری ۲۴ اپریل گئے سرکار سیکا کل ۱۵ اپریل گئے

لے	لے	لے	لے
لے	لے	لے	لے
لے	لے	لے	لے
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵

سرکار کانات

لے  
لے

صوبہ ۶۔ کرناٹک یعنی ارکاٹ ۱۶ سرکار ۱۲۲ اپریل گئے

لے  
لے

لیکن یہ صرف زمینات کی آمدنی تھی، معدنیات اور تجارت کی آمدنی اس کے علاوہ ہونی چاہیے، کیونکہ اکیلے سرکار کو ٹیڈ پالی کا محصول چالیس ہزار ہون، مسولی ٹیم کا محصول اٹھارہ ہزار ہون اور نظام پٹن کا محصول پانچ لاکھ پانچ ہزار سے بے کرچہ لاکھ چھ ہزار تک وصول ہوتا تھا، یہ تجارتی مرکز تھے اس طریقے سے سلطنت کی مجموعی آمدنی پانچ کروڑ روپیے ہونے چاہئیں اور قریب یہ ہے کہ مصارف سلطنت منہا ہونے کے بعد تقریباً

لے تاریخ ظفرہ ص ۱۷۳-۱۷۴۔

لے۔ منوچی نے جو گولکنڈے کے آخری زمانے میں آیا تھا، سلطنت کی آمدنی پانچ کروڑ روپیے بتائی ہے، منوچی جلد دوم ص ۲۱۵۔ انگریز کمپنی کے ملازم ولیم ہنٹولڈ نے سلطنت کی آمدنی پچیس لاکھ ہون یا ایک کروڑ روپیے اور شور رنے

ایک کروڑ روپے شاہی خزانے میں داخل رہتے تھے، گو ایک انگریز نامہ نگار شورر نے صرف انیس لاکھ ہون، یا تقریباً انسی لاکھ روپے سلطنت کی بچت بتائی ہے اس میں بالکل شبہ نہیں ہے کہ سلطنت کی بچت بہت تھی اور شاہی خزانے ہمیشہ فاضلات سے بھرے رہتے تھے، گو یہ فاضلات اکثر خارجی سیاست کے نذر ہوئے، یعنی ایک طرف مغل حکومت کو پیش کش، خراج اور تادان کی صورت میں ادا کیے گئے تو دوسری طرف مرہٹوں کو دیے گئے، لیکن اس کے باوجود شاہی خزانے میں بہت رقم تھی جو قلعے کے فاتحوں کو ملی اس کے علاوہ قلعے میں بے شمار دھنیں تھے جن سے بعد کی حکومتوں نے فائدہ اٹھایا۔

امراء اور عوام بھی بہت مال دار تھے۔ امراء کو دو طرح کی زمینیں و جاگیریں حاصل تھیں، ایک مدد معاش اور دوسرے فوجی خدمت کے لیے مشروط تھیں، لیکن آخر الذکر جاگیروں سے بھی ان کا ذاتی فائدہ بہت تھا۔

امراء و عوام

اس طرح ان کی مالی حالت بہت اچھی ہونی چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عوام میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے دو طرح کے لوگ تھے:۔ تاجر پیشہ جو اندروں ملک اور بندر گاہوں میں مغربی اقوام کے ساتھ تجارت کرتے تھے، بہت خوش حال اور مال دار تھے، لیکن ایسے تاجر زیادہ تر ایرانی تھے، یہ ایرانی سود پر روپیہ کی لین دین بھی کرتے تھے اور چارنی صد سود لیتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ بے حد مال دار ہو گئے تھے۔ لیکن دوسرے مسلمان سرکاری نوکری پر گزارہ کرتے تھے، گویا ان کی روزی سب شاہی خزانے سے ملتی تھی، ممکن ہے کہ یہ لوگ اس زمانے کی ارزانی کی وجہ سے خوش حال ہوں، لیکن ان کا ذریعہ معاش ناپائیدار تھا ہندو آبادی میں

انیس لاکھ اور دوسوں نے سترہ لاکھ ہوں بتائی ہے۔ آخر الذکر دو اعداد بہت پہلے کے ہیں، ممکن ہے تیسویں صدی کے اوائل میں آمدنی کم ہو، لیکن اس کو فاضل آمدنی سمجھنا چاہیئے۔ شورر نے تو اس کو واضح کر دیا ہے کہ انیس لاکھ ہون فاضل آمدنی ہے۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۰ - ۵۶ - ۷۷۔

۷۸۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۸ - ۷۹۔ ایک انگریز نامہ نگار کہتا ہے کہ تقریباً تمام مسلمان شاہی خزانے سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۸۔

ملازم پیشہ و تاجروں کی طرح کے لوگ تھے سلطنت کی مقامی حکومت اور وہی نظم و نسق سب انہیں کے ہاتھ میں تھا، نہ صرف اضلاع کے گورنر بلکہ تمام متاجر جو اضلاع ٹھیکے پر لیتے تھے اور مالگزاری ادا کرتے تھے سب ہندو تھے، تاجر اور کان کن بھی اکثر ہندو ہوتے تھے اور حکومت کی طرف سے معدنوں کی نگرانی بھی انہیں لوگوں کے سپرد تھی۔ ذیلی طبقے میں جو کاشتکار اور مزدوروں پر مشتمل تھا معاشی حالت کا پتا چلانا بہت مشکل ہے۔ قیاس یہ ہے کہ اجارہ داری کے قبضہ عملدرآمد کی وجہ سے جو شروع سے ابوالحسن کے عہد تک جاری تھا کاشتکاروں کو بہت نقصان پہنچا تھا، اور یہ بے حد مفلس نظر آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر دیہات ویران ہو گئے تھے، لیکن غالباً یہ بات بھی خلاف قیاس نہیں ہے کہ یہ لوگ دراصل اتنے مفلس نہیں تھے جس قدر وہ نظر آتے تھے، ممکن ہے کہ یہ گورنروں اور اجارہ داروں کے ڈر سے اپنا اند وختہ زمین میں چھپا رکھتے ہوں۔ لوہا، سونا و چاندی کا کام کرنے والوں کو تجارت گھروں سے تنخواہ ملتی تھی۔ لوہار و سنار کو سارے دن کی تین آنے مزدوری ملتی تھی، اور ان کے ملازم اور پالکی اٹھانے والے کہاں ایک آنہ پاتے تھے، لیکن ان لوگوں کا یہ فرض تھا کہ اپنی کمائی میں سے مقامی حکام کی بھی خدمت کریں۔ اس طریقے سے ذیلی طبقے کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی۔

قلب شاہی سلطنت میں غلہ اور دوسری اشیاء مندرجہ ذیل قیمتوں پر فروخت ہوتی تھیں جن سے اس زمانے کی طلب و رسد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

گیہوں۔ ۳ تا ۴ ہون	ایک کھنڈی
چاول۔ ۱ تا ۱ ۱/۲	۱
مکھن۔ ۷ تا ۱۰ فتم	ایک من (۱۲ سیر)
بیل۔ ۱ تا ۲ ہون	۱
بکرا۔ ۱ تا ۲ فتم	۱
مرغیاں۔ ۱ ہون ۶-۷-۸ یا کبھی ۸۰	۱

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۷۔

۲۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۲۷۔

مگر تاجو ہون کا سولہواں حصہ تھا قلب شاہی سلطنت میں چار قسم کے سکے رائج تھے، سب سے



بھین کا خام ریشم۔ ۴۰ تا ۴۵ ہون	ایک من	انڈے۔ ۱ فتم ۸۰	
مشک۔ ۱۰ تا ۱۲ ہون	ایک سیر	سیاہ مرج۔ ۲۵ ہون	ایک کھنڈی
پارا۔ ۲۰ تا ۲۵	ایک من	جوز۔ ۳۳ تا ۶۰	”
کافور۔ ۵ تا ۲۰	ایک سیر	لونگ۔ ۵ پتا۔ ۱	ایک من
چینی منحل۔ ۱ تا ۱۱	ایک گز	صندل کی لکڑی۔ ۱۰ تا ۱۲ ہون	ایک کھنڈی
بلوریں سامان۔ ایک	۲ یا ۳ عدد	سیسہ۔ ۱ تا ۲۰ ہون	”
لاک کا سامان ۳ تا ایک ہون	ایک عدد	ٹن۔ ۲۵ تا ۸۰	”
آئینے بھی فروخت ہوتے تھے۔		پیشکری۔ ۱۲ ہون	”

بڑا ہون تھا یہ سونے کا سکہ تھا جو نخل سلطنت کے تقریباً چار روپیوں کے برابر تھا اس سے چھوٹا فتم یا پنم تھا جو ہون کا سولہواں حصہ ہوتا تھا، غالباً یہ بھی سونے کا سکہ تھا، اور فتم آٹھ حصوں میں تقسیم تھا، اس آٹھویں حصے کو نول کہتے تھے، اور نول کے چار حصے ہوتے تھے اور اس کو تار کہتے تھے جو سب سے چھوٹا سکہ ہوتا تھا۔

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۲-۶۳۔

# تیسواں باب

## علمی سرپرستی

بیجا پور کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی علم و فن کی سچی پرستار تھی اس سلطنت نے علم و فن کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک ایسا علمی سرمایہ چھوڑا جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گویہ ایک حقیقت ہے کہ دکن کی تمام علمی سرگرمیاں ہمنیوں کی یادگاریں تھیں جنہوں نے اپنے بلند پایہ علمی ذوق سے دکن کو جگمگادیا تھا۔ اور یہ کہنا صحیح ہے کہ گولکنڈے کا علمی شغف ہمہی سلطنت سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین گلبرگہ اور بیدر کے علمی خزانوں کے ریزہ چیں تھے۔ تاہم اس خاندان کے بانی بھی ترکستان کے ایک ذی علم و شایستہ خاندان کے سپوت تھے اور اپنے ساتھ ایک اچھا علمی ذوق لے کر آئے تھے چنانچہ جب گولکنڈے کی سلطنت قائم ہوئی تو ان قطب شاہوں کی یہ دولت تلنگانے میں بھی علم کی بسا با پھ گئی، اور حیدر آباد بھی علم کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کے تمام فرماں روا سب کے سب تعلیم یافتہ اور علم و حکمت کے دل دادہ تھے جس طرح ان لوگوں نے بے لوث جہان بینی کو اپنا فرض منصب سمجھا تھا، اسی طرح علم و حکمت کی بھی سرپرستی کو اپنا شعار بنایا۔ علماء و شعرا کو اپنے گھر میں دعوت دی، خود شاعری کی اور بڑی تصنیفیں لکھیں اور اس طریقے سے اپنی ذاتی دلچسپیوں سے علمی مشغلوں میں تازہ روح پھونک دی۔ ذاتی دلچسپیوں کے علاوہ اپنی رعایا کی ذہنی تربیت کا بھی انتظام کیا کہ وہ اس نعمت سے محروم نہ ہوں۔ ملک میں جگہ جگہ مدرسے بنائے اور پیش قرار معلم مقرر کیے اور مقامی زبان تنگلی کی اس طرح سرپرستی کی کہ گویا یہ خود اس کی زبان تھی تاکہ ملک کا ہر طبقہ دولتِ علم سے مالا مال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہوں کی اس علم دوستی کی وجہ سے تمام تلنگانے میں علم کی لہریں دوڑ گئیں اور اکتسابِ علم کا

عام شوق پیدا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو پشتوں کے بعد ہی تمام ملک میں ایک علمی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کو تمام تعلیم پاتے تھے اور کتب خانے جمع کرتے تھے، کیونکہ شاہی کتب خانوں کے علاوہ جن میں ہزار ہا کتا میں تھیں عام لوگوں کے بھی بے شمار کتب خانے تھے۔ لیکن ہندو رعایا بھی اس شوق سے خالی نہ تھی۔ ہندو طبقوں میں لکھنے پڑھنے اور حساب دانی کا خاطر خواہ مشغلہ تھا۔ سرکاری محکموں میں ان سے کام لیا جاتا تھا، لیکن یہ بھی ایک کچھپ واقعہ ہے کہ مقامی زبان کے علاوہ ہندو، فارسی بھی پڑھتے تھے جو سرکاری زبان تھی چنانچہ مادنا کا تمام خاندان فارسی جانتا تھا، یہ شاہی فرامین لکھنے اور پڑھنے کے قابل تھا۔ قرائین یہ ہیں کہ ملک میں ایسے متعدد دغاندان ہوں گے جو اپنے کو ملک اور حکومت کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے۔ بلنگی زبان کی ترقی اس کے علاوہ تھی، کیونکہ حکومت اس کی بھی بڑی سرپرست تھی۔

سلطان قلی کے عہد میں جبکہ سلطنت کی تاسیس ہو رہی تھی کسی علمی سرگرمی کی توقع رکھنا بے معنی ہو گا، کیونکہ اس ابتدائی زمانے میں سلطنت کو بہت کچھ سیاسی و دفاعی کام کرنا تھا جو ہر نوخیز سلطنت کو کرنا پڑتا ہے۔ ہر سلطنت میں علمی و تمدنی کام اس وقت ہوتے ہیں جبکہ وہ چاروں طرف سے مستحکم ہو جائے اور ملک کے دل و دماغ ٹھنڈے دل سے علمی جستجو کر سکیں اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ کے جانشین جمشید نے اپنے علمی شغف کا کافی ثبوت دیا تھا، لیکن گولکنڈے کی اہل علمی سرگرمیاں ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئیں جبکہ یہ سلطنت چاروں طرف سے مستحکم ہو گئی اور اس کو سانس لینے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے عہد حکومت جو بہت پُر امن تھے علمی و تمدنی ترقیوں کے لیے مختص تھے۔ قطب شاہوں کا تمام علمی سرمایہ انھیں دو عہدوں کا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قطب شاہی سلطنت اپنے زوال کے زمانے میں بھی جبکہ مختلف دشمن اس کے گھات میں لگے ہوئے تھے اپنا علمی و تمدنی سرمایہ اسی رفتار سے جمع کرتی رہی جیسے پہلے کرتی تھی اور یہ کہنا علات واقعہ نہیں ہے کہ یہ اپنے آخری گھڑیوں تک عمرانی خدمت کرتی رہی، اس کا آخر تا جدار اپنی نظر بندی میں بھی شعرو سخن کا مشغلہ رکھتا تھا اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں کوئی علمی کام نہیں ہوا تاہم اس کا پائے تخت اہل علم سے خالی نہیں تھا اتنا تو معلوم

ہوتا ہے کہ اس نے ”آش خانہ“ کے نام سے ایک حلقہ بنا رکھا تھا جہاں علما جمع ہوتے تھے اس کے جانشین جمشید قطب شاہ نے شعر و سخن میں بڑی دھچپی کا اظہار کیا یہ اچھا شاعر تھا اور جمشید تخلص کرتا تھا بعض مرتبہ اس نے فی البدیہہ شاعر بھی کہے تھے چنانچہ احمد نگر میں جب برہان نظام شاہ کی طرف سے جو شاہی اعزاز پیش کیے گئے تو نظم میں اس کا فی البدیہہ جواب دیا تھا اس کے علاوہ فرصت کے موقعوں پر بھی اس نے بہت سے قصیدے اور غزلیں کہی تھیں۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے منجملہ ان کے چند قصیدے اور غزلیں نقل کی ہیں، ان کے چند نمونے یہ ہیں، ان سے سلاست زبان کا پتا چلتا ہے:-

## قصیدہ

اے بتو ختم ملک زیبائی	کار عشق از قیانت بالائی
کاکل و چین زلف و خال لب	ہر یکے در کمال رعنائی
در رہ عشق ہر کہ پا بہ ہزاد	آخر او سر کشد بہ سوائی انہ

## غزل - ۱

بے لب لعل بیتان بادہ حرام است مرا	لب میگون بنما چون سر جام است مرا
باسرے زلف تو سودائے سیاہے دارم	اینچہ سودا است کہ باز لعل چو شام است مرا

.....

.....

ترک این کار نخواہم من بیدل کردن	من کہ جمشیدم و این کار تمام است مرا انہ
---------------------------------	---

## غزل - ۲

اشک از دیدہ بہ بینید کہ چون می آید	قاصد سے ہست کہ از شہر جنون می آید انہ
------------------------------------	---------------------------------------

چند در عشق بتان شہرہ شوی لے بمشید      گر کند غیر تو این کار زبون می آید

غزل - ۳

آن پری روئے بہ بنید چہاں می آید      دل ز من بردہ کنون از پے جان می آید

جان بہ سود لے تو داویم کہ سودے بہ بریم      نہیچہ سود است کہ داویم بہ زیان می آید

.....

چون بہینند بتان از سرنازم گویند      عاشق دل شدہ حبشید جہاں می آید انہ

غزل - ۴

لے بہ رخ نوردہ دیدہ صاحب نظران      خون شد از محنت ہجرت دل خونین جگران

عمر ہارفت کہ رفتی و براہ تو ہمنوز      ہچنان چشم ترم ماند بہ حیرت نگران انہ

غزل - ۵

سر بلندئی من از بالائے رعنائے تو شد      ایند پریشانیم از زلف سخن سائے تو شد

غزل - ۶

سرور مان خویش را کرم درون دیدہ جا      تا پرورش باید دگران سرور آب چشم ما

غزل - ۷

بار جفا سے جز تو لگاے نمی کشیم      غیر از جفا و جور تو ہارے نمی کشیم

ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جبکہ سلطنت کی صحیح معنوں میں تعمیر ہوئی تھی علم و فن کی شاہی سرپرستی شروع ہو گئی اور ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو علم کا بڑا چسکا تھا چنانچہ اس نے اپنے ارد گرد بڑے علما و فضلا جمع کر رکھے تھے اور ان کے ساتھ بادشاہ کا

دیکھتے ہی دیکھتے بات بات پر یہ عجیب بات ہے کہ یہ اہل علم سفر میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور ان سے مختلف

مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں، چنانچہ تاریخ قطب شاہی کا مورخ کہتا ہے:-

”در سفر و حضر ہمارہ اہل فضل و ہنر و خدش می بودند۔ در مجلس ہمایون در مباحثہ علوم دینی  
پرداختہ در تحقیق مسائل یقینی شرائط اہتمام بجائے می آوردند۔“

یہ علما شاہی عنایات سے سرفراز ہوتے تھے۔ ابراہیم کے درباری علما کے چند نام یہ ہیں:۔ امیر شاہ محمد انجو۔  
امیر عماد الدین محمود شیرازی۔ جالینوس الزماں قاسم بیگ شیرازی اور حسین قلی مرزا جو علم و منطق کے بڑے عالم تھے۔  
ابراہیم نے مساجد اور دوسری عمارتوں کے علاوہ مدرسے بھی بنائے تھے:۔ ”مساجد و مدارس رفیعہ و عمارات رفیعہ کہ  
بیرمین آن حضرت اتمام یافتہ۔“ اس عہد میں تالیف کا کام بھی شروع ہو گیا تھا، چنانچہ خورشاد شاہ بن قباد کہسینی نے  
تاریخ قطب شاہی کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی۔ اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں یہ علمی سرگرمی  
بہت بڑھ گئی اور اس کی عام دوستی اور قدردانی کی وجہ سے بے شمار اہل علم گو لکندے میں جمع ہو گئے چنانچہ علامہ میر یونس  
استرآبادی جو بہر کو سلطنت کے پیشوا ہو گئے اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے، غالباً علمی تہجدوران کی اخلاقی زندگی  
کی وجہ سے وہ مرتضائے ممالک اسلام کے لقب سے موسوم تھے، یہ فارسی کے بڑے شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔  
ان کا فارسی دیوان بھی پایا جاتا ہے، ان کے علمی حلقوں سے حیدرآباد میں تعلیم و تعلم کی بڑی گرم بازاری تھی۔ ان کے علاوہ  
قاضی ہمنانی۔ میرک معین ہنرداری۔ مرزا محمد امین سیستانی علمائے دربار تھے۔ مرزا محمد امین نے خمسہ نظامی کے جواب میں  
چار مثنویاں لکھی تھیں:۔ شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ فلک البروج اور مطمح الاشعار۔ محمد قلی قطب شاہ نے مسجد شفاخانوں

۱۔ ماخوذ از مخطوطات مولفہ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔

۲۔ تاریخ قطب شاہی ورق ۲۲۵۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر۔

۳۔ یہ تاریخ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں شمس آباد میں جا کر ختم ہوئی، اس میں قطب شاہوں کا حال نہیں ہے، اس کا  
ایک اچھا نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے۔

۴۔ مخطوطات مولفہ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔

اور عاموں کے ساتھ مدرسے بھی بنائے تھے جن کے آثار اب تک موجود ہیں، اور اس بادشاہ کی علم دوستی کا پتا دیتے ہیں۔  
یہ خود بھی فارسی کا اچھا شاعر تھا، اور فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا، اس کے کلام کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں،  
یا استادانہ کلام معلوم ہوتا ہے:-

## غزل-۱

باشمخ بگو گرمی دیوانہ خود را	کاش زند از رشک تو پروا نہ خود را
ہوش و خرد از پائے در افتند چو مستان	چون سرمہ کشی تر گیس مستانہ خود را

## غزل-۲

ملک محبت کہ داد خواہ ندارد	ملک حنین ہیچ بادشاہ ندارد
----------------------------	---------------------------

تکیہ کہ قطب شاہ کہ چون و گران نیست	جز کرم دوست تکیہ گاہ ندارد
------------------------------------	----------------------------

## غزل-۳

حرف ز لب یار شنیدیم شنیدیم	صد شکر کہ این بادہ چشیدیم چشیدیم
----------------------------	----------------------------------

لے قطب شاہ از در دل بخش چہ گوئیم	مشتاق تراز خویش ندیدیم ندیدیم
----------------------------------	-------------------------------

## غزل-۴

یہ دو خط ز چہمت کم نشد شوخی و سیادی	کہ این دام و گرشہ بہر دل بے خطہ آزادی
-------------------------------------	---------------------------------------

اگر چہ نیست زیبہ بہ ز عدل و داد شاہان را	از ان زیندہ تر باشد بہ عاشقی از تویدای
--	--

سلطان محمد قطب شاہ اپنے باپ دادا سے زیادہ علم پرور بادشاہ ثابت ہوا، جیسے یہ مذہب پرست تھا  
 ۱۔ ویسے وہ بہت بڑا عالم بھی تھا، اور تاریخ کے الفاظ میں: ”از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است“  
 تاریخ سے اس کو خاص دلچسپی تھی، چنانچہ نظام الدین کہتا ہے کہ سلطان محمد ہمیشہ کتب سیر و تواریخ پڑھتا تھا، اور اس کا  
 حافظہ اس قدر زبردست تھا کہ ایک مرتبہ پڑھی ہوئی چیز اس کو ازبر ہو جاتی تھی اور جو واقعہ اس کے سامنے بیان کیا جاتا تھا  
 وہ اپنے معلومات سے اس کی وضاحت کر دیتا تھا، اور یہ جو کتاب پڑھتا تھا اس کی پشت پر اپنے ہاتھ سے مصنف یا مولف کا  
 حال اور ضروری توضیح کر دیتا تھا، چنانچہ اس وقت شاہی کتب خانے کی کئی کتابیں ایسی موجود ہیں جن پر سلطان محمد کے  
 ہاتھ کی تحریریں پائی جاتی ہیں اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو ان سے سلطان محمد کے عہد کی اچھی تاریخ ہو سکتی ہے۔  
 ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد اپنے ہمصر علما سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ بڑے فضلاء پائے سریر و  
 فصحاء، خوش تقریبہ کمالات و استعداد آن مغفور و مبرور اعتراض داشتند۔ یہ اچھا شاعر بھی تھا اور  
 فارسی میں غزل اللہ تخلص کرتا تھا، کلام سے شاعری کا صحیح ذوق اور بلند خیالی معلوم ہوتی ہے اس کے دربار میں  
 سید جمال الدین مازندرانی، میر قطب الدین نعمت اللہ جیسے لائق لوگ تھے اس عہد میں کئی بلند پایہ تصنیفیں لکھی گئیں۔

---

۱۔ مدیقتہ السلاطین قطب شاہی ص ۲۲-۲۳۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے ان الفاظ میں سلطان محمد کی  
 علمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

”از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است۔ و اختصار آن حضرت  
 در تواریخ بہ مرتبہ است کہ مورخان زمان ہرگز نہ حکایتہ را کہ ابتدا نمایند آن حضرت  
 بہ اختلاف روایات بہ اتمام رسانند۔ و ہمارہ بہ ارباب فضل و حکمت صحبت داشتہ  
 بہ افادات دانشمندانہ اہل مجلس را مستفیض می گردانند۔ و بے شائبہ تکلف ہر شے کہ  
 در فنن از فنون دانشوری چہ از حکمت پرستان بالغ نظر و چہ از صنعت پردازان



تاریخ قطب شاہی جو قطب شاہی خاندان کی مستند تاریخ ہے اسی عہد میں اور اسی بادشاہ کے ایمان سے لکھی گئی تھی۔ یہ بات کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ خود بادشاہ نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا تھا، چنانچہ ذیل کی نو کتابیں اسی بادشاہ سے منسوب کی جاتی ہیں:-

(۱) روح القدس (۲) ظفر القلوب (۳) قدرت نامہ (۴) مصباح الارواح (۵) احکام المحبین

(۶) نہایت الحکم (۷) ہدایت المحبتہ (۸) ہدایت المعرہ (۹) فتح ابواب ۔

کتابوں کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم مثلاً تصوف - اخلاقیات - سائنس اور فلسفہ ان کے موضوع تھے اگر یہ درحقیقت سلطان محمد کی تصنیفیں تھیں تو ان سے اس کا علمی تجربہ معلوم ہوتا ہے، اور اگر یہ اس کی نہیں ہیں تو یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سب تصنیفیں کم از کم اسی عہد میں اور اسی بادشاہ کی سرپرستی میں تالیف ہوئی تھیں اور اس سے سلطان کی علمی سرپرستی معلوم ہوتی ہے یہ بڑا شاعر بھی تھا، اس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی، نعل اللہ اور

صاحب ذوق ساہمائے دراز پیش کا ملان مشق آن علم کردہ با شد جو بہ شرف ملازمت  
نکتہ یاب دقیقہ فہم می رسد از مشاہدہ کمال دانش خود را گم کردہ در مقام حیرت می آید و  
بدائع آنکہ در مشارب مختلفہ و مدارج متنوعہ در یک مجلس آرا سر می فرمایند کہ بر طبع عالم  
دشوار نمی آید ..... نیز آن حضرت را در نظم و نثر پایہ اعلیٰ است۔

نعل اللہ تخلص اثرت می فرمایند۔“

تاریخ قطب شاہی ورق ۳۰۲ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر اس اقتباس کا ایک ٹکڑا سب سے پہلے

میں نے مخطوطات مولفہ ہاشمی صاحب میں دیکھا تھا۔

لہٰذا اس کا مولف نامعلوم ہے، اس میں ۲۶۰ کے حالات درج ہیں۔

لہٰذا ان کتابوں کا مجموعہ نواب سر سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کے سرورق پڑ لعل بد الخالق

سلطان نخلص کرتا تھا اس کا فارسی کلام بھی بہت ملتا ہے جو مختلف اصناف پر مشتمل ہے یعنی قصیدہ۔ رباعی۔ غزل۔  
مرثیے اس نے متحدہ دیکھے تھے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زبان اور خیالات پر بڑی قدرت تھی۔ فارسی کلام کے  
چند نمونے ذیل میں درج ہیں:۔

### حدیث ہادی تعالیٰ

یہاں شدہ زشتم زبان درد ہاں ما	یاد بچہ برتری تو ز وصف لسان ما
حیران وصف تست یقین و گمان ما	و حضرت یقین و گمان را چو راہ نیست
.....	.....
.....	.....
اے درگہ جلال تو دلر الامان ما الخ	ظل اللہ از مثر بدان در پناہ تست

### نعت و منقبت

نعت و مدح ہر دوشہ را می کتم با ہم ادا	مصطفیٰ او مرتفعی چون نیستند از ہم جدا
وان دگر مسند نشین بارگاہ کبریا	آن یکے فرماں روائے ہر نبی و ہر ولی
.....	.....
.....	.....

گر بدانی بعد پیغمبر علیؑ را مقتدا الخ	پہچو ظل اللہ یا نبی شاہ را ہے از بہشت
---------------------------------------	---------------------------------------

### منقبت حضرت چہار دہ معصوم

بعد ذکر مصطفیٰ او ذکر شاہ اولیا	خوش بود ذکر و درود جملہ خاصان خدا
---------------------------------	-----------------------------------

---

اس سلطان محمد قطب شاہ کے الفاظ درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں سب سلطان محمد کی تصنیفیں ہیں۔

.....  
.....  
شکر این نعمت چسان گویم که از لطف اله  
بمحو ظل اشندند غم غیر ایشان مقتدا بخ

## غزل - ۱

یافت وصل تو دلم صدق و صفا را در یاب  
اشد مهر نگر فیض وفا را در یاب  
رہنمایاں ہمہ در عشق توره گم کردند  
اند رین رہ دل بے راہ نما را در یاب بخ

## غزل - ۲

قرب یارم ز عشق و دولت اوست  
این ہمہ ششتم بہ ہمت اوست  
نعمتِ عشق کم نمی دانم  
شرمساری ز حق نعمت اوست بخ

## رباعی - ۱

لے درگہ تو سجده گہ شاہ و گدا  
در خورد تو تو حید کہ وار دیا را  
از امر مطاع قل ہوا شد احد  
شد جرات این بیان و لکش مارا

## رباعی - ۲

ہر چند کہ حق داد عطا خواہد بود  
روزے کننیک وید سزا خواہد بود  
در عرضہ میار آنخپہ لہیما نہ بود  
کز لطف کریمانہ خدا خواہد بود

## مرثیہ - ۱

آمد محرم و غم دل بر ملاست باز  
ورد ہر شور و زلزله کہ بلاست باز

## مرثیہ - ۲

دوران غم ز ماہ محرم رسیدہ است  
ہنگام آہ و نالہ و ماتم رسیدہ است

مرثیہ - ۳

اے چرخ از تورنج دہلایے عجب رسید  
شرحے کہ فتنہ تو بجائے عجب رسید

مرثیہ - ۴

آن دورِ ماتم است کہ از غم زباں نماند  
آن عہدِ غم کہ طاقت تابے تو ان نماند

مرثیہ - ۵

در کر بلا ہجوم بلا را نظر کنید  
جمعیتِ بلا ہمہ یکجا نظر کنید

عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت بھی علمی سرگرمیوں کا بہت بڑا منبع تھا۔ اپنے اسلاف کی طرح یہ بادشاہ بھی بہت بڑا علم دوست تھا، اس کی تعلیم و تربیت بڑے اچھے پیمانے پر ہوئی تھی، اس کے دربار میں بھی بڑے عالم جمع تھے اور وہ یہ ہیں: علامی میر محمد الدین، مولانا رونقی، قاضی آسن میر میراں، حکیم عبد الجبار گیلانی، شیخ عبد اللطیف، نور اللہ، مرزا محمد جوہر تبریزی، مرزا حمزہ استرآبادی، میر فضل اللہ شیرازی، شیخ ہارون، ملا تفتائی شیرازی، ملا عرب خوشنویس، ان شعراء اور علما کے ساتھ بادشاہ کی رات رات بھر علمی محفلیں گرم رہتی تھیں جہاں استادوں کے کلام پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحث ہوتی تھی اس عہد میں مختلف علوم کی کتابیں تصنیف ہوئیں جن سے قطب شاہی خاندان کو بہت بڑا امتیاز ہے۔ نظام الدین احمد نے اس عہد کی حدیقتہ السلاطین قطب شاہی کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی، علامہ ابن خاتون نے کتاب الارشاد، اور جامع عباسی پر حواشی لکھے اور اربعین کا ترجمہ کیا۔ علامہ جمال الدین نے المصباح کا اور ملا علی ابن طیفور نے حیوان اخبار کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا حسین آملی نے نہج البلاغہ کی شرح لکھی۔ ملا فتح اللہ ہمنانی نے امام یافعی کی کتاب روض الریاحین کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ابن عماد و زبہان نے خرقۃ العلما کے نام سے ایک فاضلانہ تصنیف لکھی تھی جس میں مختلف علوم و فنون مدون کیے گئے اس میں چھ جلدیں ہیں۔ جلد اول تفسیر جلد دوم

حدیث جلد سوم فقہ اس جلد کا نام مجمع الدقائق ہے۔ جلد چہارم علل اشیا، اس جلد کا نام کاشف الاسرار ہے۔  
جلد پنجم حکمت جلد ششم علوم متفرقہ۔ غرض اس ایک کتاب میں سائنس فلسفہ۔ دینیات، تمام علوم پر بحث کی گئی ہے جو  
قطب شاہی دور کی بہت بڑی یادگار ہے۔ برہان قاطع کے نام سے ایک مشہور فارسی لغت بھی لکھائی گئی جو اب بھی  
مداول ہے۔ اس کا مولف محمد حسین ہے جو برہان تخلص کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے عبد اللہ قطب شاہ کی سرپرستی میں  
ایک نعت لکھی تھی۔

## اُردو کی سرپرستی

اُردو زبان کی سرپرستی قطب شاہی خاندان کا بہت بڑا طغرائے امتیاز ہے۔ دوسرے دکنی درباروں کی طرح  
قطب شاہوں نے بھی اُردو یا دکنی کو سنوارنے میں پورا حصہ لیا۔ ان بادشاہوں نے دکنی زبان اور اس کے شاعروں کو  
وہ درجہ دیا جو مغل شہنشاہ فارسی شاعروں کو دیتے تھے۔ مغل دربار میں فیضی اور ابوطالب کلیم ملک الشعراء تھے تو دکنی  
درباروں میں وجہی غوافی جیسے دکنی شاعروں کو ملک الشعراء ہونے کی عزت حاصل تھی۔ بلکہ بادشاہوں اسی زبان میں شاعری کر کے  
دکنی زبان کو ایسا اجاگر کر دیا کہ وہ شاہی زبان ہو گئی اور لوگ اس کو اپنی زبان کہتے ہوئے فخر کرنے لگے۔ درود عادل شاہی  
اور قطب شاہی سرپرستی سے پہلے دکنی کو کون پوچھتا تھا اس سرپرستی کے غالباً دو محرکات تھے، ایک تو سلطنتِ گجرات کا  
مغل سلطنت میں اسحاق تھا جب ۹۸۰ھ میں شہنشاہ اکبر نے گجرات فتح کیا تو یہاں کے اُردو شاعر سب بھاگ کر دکنی دربار میں  
پناہ گزیں ہو گئے اور ان کی سرپرستی حاصل کی۔ حضرت شاہ میراں جی کا درود بیجا پور میں جو دکنی زبان کے بہت بڑے  
قائد تھے اس تاریخ کا پہلا باب سمجھنا چاہیئے۔ دوسرا محرک دکن کی شمال سے تمدنی کش مکش تھی۔ شمال و دکن کی  
۲ ویزش بہ ظاہر سیاہی معلوم ہوتی تھی، لیکن اگر اس کے اجزائے ترکیبی ایک کیے جائیں تو اس میں تمدنی کش مکش کے بھی

بہت سے مناظر دکھائی دیں گے۔ جس طرح دکنی دربار اپنے دست و بازو سے مغل سلطوت کا مقابلہ کرتے تھے کچھ اسی طرح اپنی تمدنی برتری ظاہر کر کے اپنی ہستی قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور چونکہ زبان تمدن کا بہت بڑا عنصر ہے اس لیے اس ہتھیار سے بھی شمالی طاقت کا مقابلہ کیا جاتا تھا، یعنی شمال میں فارسی کی سرپرستی ہوتی تھی تو اہل دکن اس کے علی الرغم دکنی زبان کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتے تھے اور دکنی ملت قائم رکھنے کا یہی ایک ذریعہ تھا، ورنہ مغل دربار کی طرح یہاں بھی فارسی کا بول بالا ہوتا تو دکنی انفرادیت ختم ہو جاتی اور مغل سیلاب میں ڈوب جاتی۔ کچھ اس طریقے سے اردو کے پیچھے جذباتی اور قومی تائید تھی جو اس کے حیات جاوید کا باعث ہوئی۔

۱ اس سرپرستی کا پہلا سہرا غالباً عادل شاہی دربار کے سر ہے کیونکہ اسی خاندان کو گولکنڈے سے پہلے مغلوں کے ساتھ کشمکش حیات کرنی پڑی اس کے علاوہ گجرات کی بساط الٹی تو اردو کا تمام سرمایہ حیات پہلے بیجاپور آیا، کیونکہ یہ احمد آباد کے پڑوس میں تھا۔ اور جو شاعر یہاں جمع ہوئے تھے وہ سب عادل شاہی دامانِ فیض سے چھٹے ہوئے مخلصانہ اردو ادب کی خدمت کرنے لگے اور دکنی کو مختلف اصنافِ سخن سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ وہ فارسی سے بہت آگے بڑھ گئی اس طریقے سے یہ کہنا چاہیے کہ گولکنڈہ اس میدان میں بیجاپور سے کچھ پیچھے تھا، اور غالباً یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ قطب شاہی سرپرستی بیجاپور کی نقشِ ثانی تھی، کیونکہ اس کی زمین دوزہر میں شاید بیجاپور سے ہی یہاں آئی تھیں۔ تاہم قطب شاہی دربار نے اردو کی کم خدمت نہیں کی جو اصنافِ سخن، بلند مضامین بیجاپور نے پیدا کیے تھے وہ گولکنڈے نے بھی کیے گولکنڈے کو یہ امتیاز ہے کہ اس کے سلاطین سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم دوست تھے، انھوں نے اردو کو اپنا اوڑنا بچھونا بنایا، اس میں شاعری کی اور بڑے دوا دین چھوڑے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ قطب شاہی دربار کا بیجاپور پر بھی اثر پڑتا تھا اگر پہلی منزلوں میں گولکنڈے نے بیجاپور کی شاگردی کی تھی تو آگے چل کر اس نے استاد کی بھی فخر حاصل کیا۔ بیجاپور کے شاعر مقیمی نے اپنے کلام میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ غواضی کا خوشہ چیں ہے۔ اس کے علاوہ بیجاپور کا آخری دور جس میں ملّا نصر قی اور اس کے ہم عصر طبع آزمائی کرتے تھے قطب شاہی رہنمائی کا ممنون تھا، کیونکہ علی عادل شاہ ثانی کی

ماں خدیجہ سلطانہ جو بیجاپور کی تاریخ میں حاجی بڑے صاحب کے نام سے مشہور ہے، تمام ادبی سرگرمیوں کی روح رواں تھی، اسی نے بیجاپور میں پھر علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سامان پیدا کیا۔ ٹوٹے ہوئے شاعروں کی دستگیری کی اور ظاہر ہے کہ یہ رہنمائی گو لکندے سے آئی تھی، کیونکہ خدیجہ سلطانہ عبد اللہ قطب شاہ کی بہن تھی۔

سلطان قلی قطب شاہ اور جمشید قطب شاہ کے عہد میں تو دکنی کی کوئی خدمت نہیں ہوئی مگر ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جبکہ قطب شاہی سلطنت مستحکم ہو گئی تو دکنی کا شوق پیدا ہو گیا چنانچہ اس عہد میں فیروز، و، محمود و اردو شاعروں کے نام آتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے شاعر تھے، گو ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا، اور ان شاعروں کے حالات بھی معلوم نہیں ہوتے تاہم ان کے وجود سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں اردو ادب کی خدمت کا پایہ بڑھ گیا تھا، اور جب اس کے جانشین بربر حکومت ہوئے تو ان کو ترقی کرنے کا موقع ملا کیونکہ محمد قلی اور سلطان محمد کے عہد میں سلطنت چاروں طرف سے بہت پُرامن تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے تئیس سالہ عہد حکومت میں اردو کی اتنی خدمت کی کہ اس کو ارتقائی منازل پر پہنچا دیا، اردو ایک شایستہ زبان ہو گئی، یہ خود بھی ایک قادر الکلام شاعر تھا، اور اردو میں معافی تخلص کرتا تھا، اس کے کلام کا ایک وسیع مجموعہ موجود ہے جس میں قصیدے، غزلیں اور مرثیے اور قطعات کے سے کئی اصناف سخن پائے جاتے ہیں۔ سیاسی، معاشرتی اور سماجی ہر مضمون پر طبع آزمائی کی گئی ہے اس کے کلام میں ادبی روانی اور بہت گھلاوٹ پائی جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا۔ غالباً دنیا کے بادشاہوں میں اتنا پُرگو شاعر جس کو زندگی کے ہر پہلو سے مس ہو نہیں پایا ہوا۔ اردو کی ادبی تاریخ اس پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ کلام کے چند نمونے یہ ہیں:-

قصیدہ عید نوروز

کہ نس دن عید ہو نوروز منج کون نت خدا دیتا

میرے دل مرغ کی خاطر پھولان عشرت نوا دیتا

## رباعی

اپ دوست سوں مل بیٹھ کہ میں جامِ منگوں      اس ہونٹ شکر ایسے تھے میں کامِ منگوں  
آرامِ دل آرام تھے ہے دل کون سدا      میں اپنے دل آرام تھے آرامِ منگوں

## نظم جلوہ

پریم پیاری می کا جلوہ گدا و ساسے      اسے چند سور سوں پر یان سگارسے  
سہاگان بھاگ پھل مستک کھلے ہیں      سہیلیاں آرتی نارسے نوارے  
رچا و تخت جلوے کا خوشی سوں      کہ چونند ہر چوک موتیاں سوں سنوارے

## غزل - ۱

ہے عشق ہر اک دہات ہر اک دل میں پیارا      مج عشق پیاری کا ہے جیو کا ادھارا

اے قلب معافی کہ ترا قلب خطا ہے      کر شکر خدا پر کہ قرار ہے سو ستارا

## غزل - ۲

باغِ دل میں تج محبت کا چنبا پھل لگیا      باس سنگ پھولاں عرقِ کلین ہوا ہوں ڈلگیا  
لے علم ہو رے کتب ہو کتب پوچھیا جائے نا      عالمان بیچارہ دکھ کرا سکی تک میں ہے تھکیا

تم معافی کے گناہاں کا رقم کرتے ہیں کی      میں محمد ناٹوں تے دونوں جہاں میانے بگیا

۱۔ محمد قلی قلب شاہ کے دربار میں اردو کے اکثر شاعر تھے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس وقت صرف



وڈ شاعروں کے حال معلوم ہوتے ہیں، ایک وجہی اور دوسرے احمد۔ وجہی ایک بلند پایہ شاعر تھا جو غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، لیکن اس کا شاعرانہ کمال سب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ظاہر ہوئے اور اس کی بڑی شہرت ہوئی، اس نے نظم میں قطب مشتری اور نثر میں سب رس کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ دونوں قصے ہیں جو بڑے لطیف اور استادانہ انداز میں لکھے گئے ہیں، یہ ادبی تاریخ کا بہت بڑا اضافہ ہے۔ احمد نے بادشاہ کے حکم سے لیلیٰ مجنوں لکھی تھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ محمد قلی کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اردو کے کوئی شاعر منظر عام پر نہیں آئے، حالانکہ خود سلطان محمد نے اردو میں ایک دیوان لکھا تھا، اور اس میں وہ قطب شاہ تخلص کرتا ہے۔ اپنے چچا کے کلام کو بھی اسی نے مرتب کیا، اور اس پر مقدمہ لکھا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اردو سے زیادہ فارسی اور عربی سے دلچسپی تھی اس لیے اس کے عہد میں فارسی میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ حالانکہ اردو کے نوخیز شاعر جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں منظر عام پر آئے تھے سلطان محمد کے عہد میں موجود تھے لیکن ان کی دربار سے آؤ بھگت نہیں ہوئی، اس لیے جہاں تک اردو کا تعلق ہے سلطان محمد کا عہد بالکل خالی معلوم ہوتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں جو پچاس سال طویل ہے اردو نے انتہائی ترقی کر لی! اس کو اردو ادب کا سنہری زمانہ کہنا چاہیے۔ اول تو خود بادشاہ نے جو بڑا عالم و شاعر تھا، اردو ادب میں دلچسپی لی، ایک دیوان لکھا۔ اس کا طرز بیان سلطان محمد سے زیادہ صاف اور سلیس سمجھا جاتا ہے۔ گوہر کے کلام میں اتنی روانی اور لوچ نہیں ہے جیسے اس کے دادا محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ عبداللہ تخلص کرتا تھا، اس کے کلام کے چند نمونے یہ ہیں:۔

غزل۔ ۱

منجے نور و زتھے اگلا صفا تم لکھ جدا دیتا      صفا جیسا جو منگتا تھا سو دیا منج خدا دیتا

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ کا اردو دیوان اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

تراقد پھول کی ڈالی من کل ملکا نے تھے خوشی پا جیو کا بل سو غم کون سب و دادیتا

بنی کے صدقے عبد اللہ سد اتون شکر کراس کا جکوئی تچ کون نوازیہ ہو رشای کا ہدایتا

## غزل - ۲

اثر عشق کا آمیرے سر چڑیا تو میں وصل سون تل برہ سوں لڑیا  
ہوا ہوں ترے روپ پر مبتلا تو تچ سوں منجے کام آ کر پڑیا

بنی صدقے عبد اللہ سلطان کے ہر اک بول کو میں سنے میں مڑیا

۱ دوسرے اس کی سرپرستی میں اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی اور بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہو گا کہ عبد اللہ کے عہد میں اردو ایک مستند زبان ہو گئی، اس عہد میں غواضی اور ابن نشاطی دو بڑے شاعر گزرے ہیں۔ غواضی نے سیف الملوک بدیع الجمال اور طوطی نامہ کی مشہور مثنویاں لکھی ہیں، یہ دونوں قصے ہیں اور اپنے فن کا کمال سمجھے جاتے ہیں۔ ابن نشاطی کی تصنیف پھول بن خاص شہرت رکھتی ہے، یہ بھی ایک قصہ ہے جو کسی فارسی قصے کا ترجمہ ہے، لیکن اپنے اسلوب بیان اور قصے کی ترتیب کے لحاظ سے یہ قلب شاہی دور کی بہت بڑی یادگار ہے۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ طبعی اور امین بھی قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے بھرام و گل اندام کے نام سے ایک دلچسپ قصہ لکھا تھا جس میں زبان اور اسلوب بیان کا کھانا کرتے بہت دل کش ہے۔ عبد اللہ کے انتقال کے بعد یہ ادبی سرگرمی ختم نہیں ہوئی بلکہ برابر جاری رہی۔ چنانچہ ابوالحسن قلب شاہ جو بہت تعلیم یافتہ صاحب ذوق آدمی تھا، اردو کا بڑا مہربانی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں

شاعری کی تھی اور قید میں بھی شعر و سخن کے مشغلے کو نہیں چھوڑا تھا لیکن دو ایک اشعار کے سوا اس کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ مرنے کے لیے ذیل میں ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔



کس درکھوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل بچھڑا ہے  
یک بات کے ہوینگے سخن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

لیکن بادشاہ کے علاوہ اس بد نصیب عہد میں کئی شاعر بھی ہوئے تھے جو شعر و سخن کے مشغلے میں مصروف تھے چنانچہ فائز۔ لطیف۔ شاہی۔ نوری۔ مرزا غلام علی مشہور شاعر تھے۔ ان میں فائز اور شاہی بلند پایہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مرزا ابوالحسن کا بہت وفادار و رباری تھا۔ ان سب کا کلام قصوں اور مثنویوں کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے اور اس طریقے سے کہا جاسکتا ہے کہ ابوالحسن کا عہد اردو شعر و سخن کی خدمت سے خالی نہیں تھا۔

تہلنگی کی سرپرستی | قطب شاہوں نے تہلنگی زبان اور ادب کی بھی اسی گرمجوشی سے سرپرستی کی تھی جیسے وہ اردو اور فارسی کی کرتے تھے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قطب شاہ تہلنگانے کو اپنا وطن، اور تہلنگی زبان کو اپنی زبان سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے اس مقامی زبان کی مخلصانہ خدمت کی، اس کے زبان و ادب اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کر کے اس کے ادب کو بہت بڑھایا۔ یہ خود تہلنگی جانتے تھے اور اس میں شاعری کرتے تھے۔ اگر قطب شاہی دور کو اندھرادیش اور تہلنگی ادب کا سنہری زمانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ قطب شاہوں سے پہلے اور پھر ان کے بعد تہلنگی کو ایسی شاہانہ سرپرستی نہیں نصیب ہوئی اور ظاہر ہے کہ ہر زبان بادشاہوں کے درباروں میں پروان چڑھتی ہے۔ ابراہیم قطب شاہ تہلنگی کا سب سے پہلا سرپرست ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی دیورکنڈیے میں گزری تھی اور اس کے بعد یہ سات سال وجیانگر میں جلاوطن رہا۔ غالباً اسی ماحول میں اس نے مقامی اثرات اپنے میں جذب کیے اور تہلنگی کا ذوق حاصل کیا، یہ تہلنگی خوب جانتا تھا اور اس کا

استادانہ کلام سمجھتا تھا۔ اس کے وہ بار میں عربی و فارسی کے علماء کی طرح تلنگی زبان کے کئی شاعر تھے اور ان کو شاہانہ سرپرستی حاصل تھی۔ منجملہ ان کے ادنیٰ گنگا دھرنامی تلنگی کا ایک مشہور شاعر تھا جو ادبیات تلنگی کا بڑا قائد سمجھا جاتا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی میں اس نے تلنگی ادب کی مشہور کتاب تپتی سمورین پاکھیہ نام جو بلند پایہ تصنیف ہے لکھی تھی۔ ابراہیم کے درباری اُمراء بھی تلنگی ادب کے بڑے سرپرست تھے چنانچہ اس کے ایک سردار امین خاں کو لوگ اب بھی جانتے ہیں جس نے ایک مشہور شاعر پنا گنڈی تلگنا آریہ کی سرپرستی کی تھی، اس شاعر نے جو پٹنچروکار ہینے والا تھا ادب کی ایک زبردست کتاب لکھی تھی جس کا نام ”یے یاتی چیر ترا ہے“ اس کتاب سے اس زمانے کے رسم و رواج سماجی زندگی اور تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح امین خاں نے جو پٹنچروکار گورنر تھا شیوپرستی کی رہبانیت کو توڑنے کی کوشش کی تھی اور اس کی بیوی عکری بی بی بیچ ذات غربا میں گھوم کر ان کو کھانا پڑا دیتی تھی۔

۱۔ خاندان قطب شاہی کا بڑا قومی معمار محمد قلی قطب شاہ نے آندھرا دس کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اگر اس کے باپ دادا تھوڑے بہت غیر ملکی تھے تو محمد قلی تو بالکل تلنگانے کا آدمی تھا، کیونکہ اگر ماہ نامے کے مولف کا خیال صحیح سمجھا جائے تو اس کی رگوں میں تلنگی خون دوڑتا تھا، اس کو تلنگانہ اور اس کی قومی و معاشرتی روایتوں سے جو انس ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کی قوم پر و تحریکوں کی بدولت تلنگانے کے طول و عرض میں نئی زندگی پیدا ہوئی قومی تعمیر کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ کا قابلِ قدر کام یہ تھا کہ اس نے تلنگی زبان کی خاطر خواہ قدر کی قیاس یہ ہے کہ اس کے عہد میں تلنگی زبان میں بہت سی ادبی کتابیں لکھی گئی ہوں گی محمد قلی قطب شاہ خود بھی تلنگی زبان کا بڑا دل دادہ تھا، اور یہ رویت مشہور ہے کہ اس نے تلنگی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کیا تھا اگرچہ یہ دیوان اب دستیاب نہیں ہوتا تاہم اس کی دوسری نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مقامی زبان سے کتنی وابستگی تھی۔

---

۲۔ یہ کتاب سباراو صاحب پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کی ہے اور تلنگی کی سرپرستی سے متعلق جو معلومات درج ہیں وہ سب پروفیسر موصوف کے مقالے سے ماخوذ ہیں۔

اس کے اردو دیوان میں اکثر تنگی کے الفاظ ملتے ہیں جو بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو نظموں میں مقامی ہندو ہواروں اور معاشرتی دھچپیوں کا ذکر ہے اور ان کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ بسنت کی عید۔ ساون بہودون کی موسمی روایات۔ تلنگن کا سراپا، اور بہو کڑی پھو کے کھیل کو اس نے ایک شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے اسلامی روایات کے ساتھ مقامی روایات کو بھی خاطر خواہ جگہ دی تھی اور اس طرح دونوں روایتوں کے امتزاج سے ایک جدید قوم تعمیر کی گئی اس کی چند انوکھی نظمیں یہ ہیں۔

### بسنت کی عید

پیارے بسنت کا ہوا آئیا      سکیاں تن مشک عرواں لائیا

پیارے مکھ میا نے کھلیا بسنت      پھولا حوض تھے چرکے چھڑکيا بسنت انھ

### بہو کڑی پھو

سکی تال دے منج ٹنکتی کھڑی      کہ ڈہان ڈکنی کھل کو ہنکتی کھڑی انھ

### تلنگن

پیارے جو ورتی میں پنت تچ پیم      منجے جیو دیونا ہے پیم میں نیم

بنی صدقے قطب شہ سالو لی سون      بچن ہندی سون بولے ایم مریم

انم رے انم

# چوبیسواں باب

## شہر و عمارات

شہر و عمارات کی تعمیر بھی قطب شاہوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے مان کا پاکیزہ ذوق۔ سلیقہ جو  
شہر حیدرآباد کی تعمیر | شہر و عمارات کی تعمیر میں ظاہر ہوا، قرون وسطیٰ کی بہت بڑی یادگار ہے، دوسری جگہ اس کی  
مثال نہیں ملتی! اگر ایک مورخ کے الفاظ مہر اے جائیں تو تاجدارانِ قطب شاہی در علو بہت فراخی حوصلہ و  
قابلیت در تمامی دنیا داران دکن ممتاز زبودندہ اکیلا شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر قطب شاہوں کو زندہ  
رکھنے کے لیے کافی ہے اس شہر نے تلنگانے کے طول و عرض میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس وقت حیدرآباد  
واحد شہر ہے جو پورے آندھرا کی تمدنی خدمت کر رہا ہے اور یہ قطب شاہوں کا عطیہ ہے اس شہر کی تعمیر کے بہت سے  
محرمات تھے۔ بات یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد تک سلطنت کا مستقر صرف گولکنڈہ تھا جہاں مرکزی حکومت تھی

لے۔ ماہ نامہ ص ۳۰۔

لے اس شہر کی آبادی کا سب سے بڑا محرک یہ بتایا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو بھاگ منی یا بھاگیا منی نامی ایک  
تلنگن سے عشق تھا جو موضع چچلم میں رہتی تھی یہ اپنے زمانہ شہزادگی میں اس عورت کی خاطر اس موضع میں  
آیا کرتا تھا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پرانے پل کی تعمیر بھی اسی عشق و محبت کی یادگار ہے جب یہ خود بادشاہ ہوا تو  
اسی عودت کی کشش میں اس نے شہر حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور اسی عورت کے نام سے بھاگ نگر نام رکھا۔

حصار کے اندر عام آبادی تھی، اگرچہ اس کی بنیاد سلطان قلی نے رکھی تھی لیکن اس کی تمام تعمیر و استحکام بہم قلی شاہ نے کیا، اور سلطنت کی ترقی کے ساتھ یہ بھی ایک بہت بڑا شہر ہو گیا تھا، اور اس میں تمام شہری ضرورتیں بہم پہنچائی گئی تھیں چنانچہ ایک مورخ کے الفاظ میں ”ازدست آن بہ مرتبہ نقل می نمایند کہ تا چہل ہزار سوار اندرون حصار می گنجید عمارتہائے عالی دل نشین با فضا داشت“<sup>۱</sup> لیکن اس کی آبادی ہر روز بڑھ رہی تھی اور آبادی کی کثرت سے نہ صرف تنگی محسوس ہوتی تھی بلکہ آب و ہوا خراب ہو رہی تھی، چنانچہ ایک مورخ کہتا ہے کہ ”بہ سبب کثرت آبادی و ازدحام مردم ہوائے آنجا تغیر یافتہ بہ فساد گرائیدہ موجب ابتلائے مردم بہ آلام و اسقام گردید“<sup>۲</sup> اس کے علاوہ خود سلطنت کے اغراض و مقاصد اس قدر وسیع ہوتے جا رہے تھے کہ ان کے رو براہ کرنے کے لیے گولکنڈے کا مستقر کافی نہیں تھا۔ باہر کے سفراء جو مختلف سلطنتوں کی طرف سے

تقریباً ہر مورخ اور ہر سیاح نے یہ روایت بیان کی ہے۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۲۔ خانی خاں جلد سوم ص ۳۸۴۔  
 یورینر جلد اول ص ۱۲۲۔ اس طرح اس روایت میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ماہ نامہ کا مولف کہتا ہے کہ محمد قلی نے یہ شہر اپنی ماں بھاگ رتی کی خواہش سے آباد کیا تھا، اور اسی کے نام سے بھاگ نگر موسوم کیا تھا۔ وہ اس کی معشوقہ نہ تھی۔ ماہ نامہ ص ۲۸۸۔ یہ روایت کچھ بحث طلب ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے جو اس عہد کی مستند تاریخ ہے اس کا سرے سے ذکر نہیں کیا، اور وہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ موضع چچلم میں جہاں اب شہر حیدر آباد ہے شکار کے لیے آیا تھا، یہ جگہ اس کو بہت پسند آگئی اور اس کو شہر کے لیے منتخب کر لیا۔ لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولف بھاگ رتی کے قصے کو چھپانا چاہتا ہے۔

۱۔ خانی خاں جلد سوم ص ۲۸۷۔

۲۔ حقیقۃ العالم مقالہ اول ص ۲۱۔ خانی خاں جلد سوم ص ۳۸۴۔

ایا کرتے تھے گولکنڈے میں قلب شاہوں کے شایان شان خیر مقدم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایشانی ملکوں کے علاوہ مغربی مالک کے سیاح بھی یہاں آتے تھے اور برسوں رہتے تھے۔ نیز سلطنت کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے علماء و تاجروں کا علیحدہ جگہ ٹھہر رہا تھا خود حکومت ان سے کام لیتی تھی اور ان نو واردوں کی وجہ سے گولکنڈے کے باہر چرچے ہوتے تھے خود محمد قلی قلب شاہ کی بلند خیالی ایک وسیع اور تمدن شہر کی طالب تھی۔ گولکنڈے کا پرانا شہر اس بلند ہمت بادشاہ کے حوصلوں کا جواب نہیں تھا چنانچہ ان حالات میں شہر بھاگ نکریا حیدر آباد کی مبارک تاسیس بہت ضروری ہو گئی۔

شہر حیدر آباد کی بنیاد محمد قلی قلب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ سال کے بعد رکھی گئی تھی۔ یہ آندھرا دیش کی مبارک گھڑی تھی جبکہ ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں شہر بھاگ نگر یا حیدر آباد کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کی تکمیل کئی سال کے بعد ہوئی، لیکن جس اہتمام اور سلیقے سے اس شہر کی تعمیر کی گئی تھی وہ قرون وسطیٰ کا عجوبہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قلب شاہ کو شہر کی تاسیس اور آباد کاری کا خاص ذوق اور سلیقہ تھا۔ شہر کا ایسا اچھا ڈھنگ ڈالا گیا کہ قرون وسطیٰ میں اس کی نظیر نہ تھی پہلے دریائے موسیٰ کی خوشگوار وادی میں اس کا ڈھنگ ڈالا گیا، اس سے نہ صرف پانی کی ضرورت پوری ہوئی بلکہ شہر کی رونق بھی بڑھی۔ دوسرے شہر کے بیچ میں

۱۔ بھاگ متی کے اصل نام سے اس شہر کا نام بھاگ نگر رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بادشاہ نے بھاگ متی کو بہت عزت دی اس کے جلوس کے لیے بارہ ہزار سوار مقرر کیے اور اس کو حیدر محل کا خطاب دیا، اور اسی خطاب کے مطابق شہر کا نام بھی حیدر آباد کر دیا گیا۔ محمد قلی قلب شاہ نے حیدر محل کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی تھی، اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

دن دن اتھ سیتے طبلان مدن کے باجے

عشق کے پاتران سب اس ملک دیکھ لاجے

حیدر محل میلنے نابات گھول سا جے

اس سرود کے ادھر جلوہ ہے نور تن کا



چارمینار کی سڈول عمارت قائم کر کے چاروں طرف سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ چارمینار کی بنیاد سے اس شہر کا آغاز بھنا چاہیئے۔ وہ عجیب و غریب منظر تھا کہ موضع چلم کے چھوٹے بڑے معمار تلنگی گیتوں کے کورس میں چارمینار کی تعمیر کرتے تھے اور اس کا مسالہ جمع کرتے تھے غالباً یہ دیر ۷۰۰ سال میں تیار ہوئی اور یا حافظ سے اس کی تاریخ اخذ ہوتی ہے۔ خود چارمینار کی عمارت تعمیر کاری کا بہترین نمونہ ہے اور دنیا میں ایسی عمارتیں بہت کم پائی جاتی ہیں اور فرانسیسی سیاح تھیونو کے الفاغان میں یہ ایک مہتمم بالشان عمارت ہے اور اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی تعمیر میں خاص ضابطہ اور سلیقہ ملحوظ تھا، اور شہروں کی طرح یہ شہر بھاگ نگر خود رو نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص نقشہ کے مطابق بنایا گیا۔ سڑکوں کے دونوں طرف عمارتوں کی تعمیر کا خاص اسلوب مقرر کیا گیا، چوراسے متساوی الاضلاع بنائے گئے اور بازار بنائے گئے تو ان میں دکانوں کا یہ انتظام تھا کہ ہر دکان کے سامنے ایک برآمدہ بنایا گیا تھا تاکہ خوش نمائی بھی ہو، اور تاجروں و گاہکوں کو دھوپ اور پانی سے آرام ملے۔

لیکن شہر کی تعمیر صرف اس مختصر خاکے پر منحصر نہ تھی۔ قطب شاہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ملک میں ایک قہقامی زندگی پیدا ہو تاکہ اہل شہر ایک جگہ رہ کر اپنے ذہنی اور اخلاقی قوتی کو ترقی دے سکیں اور اس کا اثر تمام ملک میں پھیلے اس لیے اہل شہر کی بود و باش کے لیے خاطر خواہ سہولت اور ان کی عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں۔ چنانچہ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں، چنانچہ اس شہر میں چار بازار بنائے گئے جہاں اہل شہر کی تمام مایحتاج میراقتی تھیں۔ ان بازاروں میں چودہ ہزار دکانیں تھیں۔ دکانوں کی ان تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متمدن معاشرہ کا

---

۱۔ تھیونو صاحب سوم ص ۹۵۔ اس کیلی عمارت کی تعمیر میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔

ہزار ہا اشیا فروخت ہوتی ہوں گی اس کے علاوہ اہل شہر کی معاشرتی اور مذہبی ضروریات کے لیے بے شمار محلے۔ حمام۔ خانقاہیں۔ مدرسے۔ مسجدیں۔ منگر خانے۔ مہمان خانے اور کارواں سرائیں بنائی گئیں ان عمارتوں کی تعداد کوئی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے اور غالباً اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے محلات کو چھوڑ کر محمد قلی قطب شاہ کے عہد کی اکثر عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ چارمینار کے پاس جو جامع مسجد بنائی گئی تھی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ تعمیر کاری کا بہت اچھا نمونہ ہے، اس کے احاطہ میں ایک حمام بنایا گیا جو اب تک موجود ہے۔ چھوٹے مہمان خانوں کے علاوہ بڑے کارواں سرائے بنائے گئے جہاں ایک وقت میں بڑے قافلے ٹھہر سکتے تھے پرانے پل کے پاس ایک بڑی کارواں سرائے موجود ہے۔ میونسپل کھانا ہے کہ خود شہر میں چارپانچ کارواں سرائیں موجود ہیں جو دو منزلہ ہیں۔ تعلیم کے لیے مدرسوں کا انتظام تھا۔ بیماروں کے لیے ایک بہت بڑا ہسپتال ”دارالشفائے نام سے تعمیر کیا تھا جس کے بوسیدہ درو دیوار اب تک موجود ہیں اور محمد قلی قطب کی تمدنی عظمت کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس میں شاہی طبیب اور جراح کام کرتے تھے مریضوں کو دوا و غذا مفت دی جاتی تھی اس کے علاوہ شہر میں ہر جگہ پانی کی نہریں دوڑتی تھیں اور راستوں پر سایہ دار درخت نصب کیے گئے تھے۔

۱۔ سیاحت نامہ میونسپل ۱۲۳۔

۲۔ تاریخ ظفر ص ۱۳۔

۳۔ حیدر آباد کے ایک مورخ نے شہر کے اس تعمیری اہتمام کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:-  
 ”شہر کے کل بر چہار بازار و چہار بطاقہائے رفیع۔ در ہر بازار سے چند چہار سو کہ بہندی  
 چو راہہ گویند متساوی الافلاح و سوائے آن بازار ہائے دیگر و در اکثر بازار ہا و طرف  
 جداول آب روان۔ بر کنار جداول درختان سایہ دار۔ دکائین چہار دہ ہزار گفٹہ اند  
 در پیش ہر دکان ایوانے و ماورائے این از محلہ ہا و حمام ہا و خانقاہ و مدرسہ و

اس شہر میں شاہی بود و باش اور امور سلطنت کے سرانجام کے لیے بے شمار محلات بنائے گئے تھے، ان کی بہت بڑی تفصیل ہے انھیں سے شہر کی عظمت تھی۔ چارمینار کے شمالی رخ میں مساوی فاصلوں پر چار بلند کمائیں بنائی گئیں اور ان کے درمیان گلزار حوض بنایا گیا، اور اس کی مغربی سمت میں عام شاہی محلات کی تعمیر ہوئی۔ داد محل جو عدل گستری کے لیے بنایا گیا تھا وہ بہت عظیم الشان تھا، اس کی کئی منزلیں تھیں اور ہر منزل میں بڑے بڑے ایوان تھے یہ اس قدر عظیم الشان محل تھا کہ بیرونی سیاح بھی اس کی تعریف کرتے ہیں ہوسنی ندی کے کنارے ندی محل کے نام سے ایک عظیم الشان محل بنایا گیا تھا جہاں سے ندی کا اچھا نظارہ ہوتا تھا، اس کے بہترین موقع محل اور نفیس تعمیر کاری کی بہت تعریف کی جاتی ہے اگرچہ اب وہ باقی نہیں رہا، لیکن اس کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس کے الفاظ سے اس کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔

### قصیدہ

ہین مقام خوش کہ مستغنی است از نقش و نگار  
ہست باجنات تجری تحتہا الانہا ریار  
فرخ آن منزل کہ شاہی را بود دروے نشست  
روشن آن محفل کہ ماہی را بود بروے گلزار

مسجد و لنگر و مہمان خانہا و دوازدہ ہزار مکان پر بوج بہارت کشیدند و جانب شمال را  
مرکز دولت و مستقر سلطنت قرار دادہ ایوانہائے عالی و قصر ہائے رفیع نمودار گردانیدند و  
در احسن اوقات و یمن ساعات بنائے این شہر فرخندہ اثر نہادہ مجموعہ عمارات  
کوچہ و بازار و غیرہ را از سنگ و آہک بہ تکلف ہرچہ تمام تر بر آوردند و منازل با شاہی  
یہ نوے ساختند کہ مسافران اقالیم سبعہ نظیر آن در ہیچ ملک نشان نہ میدہند۔ یا بکملہ جو  
خروندان چنان شہر را کہ در تمام مملکت ہندوستان شرقاً و غرباً جنوباً و شمالاً باعتبار مطلوبیت  
حدی نہ دار و طرح افگند۔ (حقیقۃ العالم مقالہ اول ص ۲۱۵)۔

بیقرارانِ قوارول فزاید چون در آن جانے آن دارد کہ باشد نام اودا را التقرار

چون دل وانا درو پیدا است صورتہائے غیب بسکہ مقبول است دیوار و درش آئینہ دار

ان محلات کے علاوہ داخل کے قریب ایک اور محل خدا واد محل بنایا گیا تھا جو بلند ترین تھا، اس کی سات منزلیں تھیں، چونکہ ہر منزل اتنی بڑی اور عظیم الشان تھی کہ بجائے خود ایک محل تھا، اس لیے ہر منزل کا نام علیحدہ رکھا گیا۔ ساتویں منزل الہی محل۔ چھٹی منزل محمدی محل۔ پانچویں منزل حیدری محل۔ چوتھی منزل حسنی محل۔ تیسری منزل حسینی محل۔ دوسری منزل جعفری محل اور پہلی منزل موسوی محل کے نام سے موسوم تھی، اور اس میں بزرگوں کے نام سے تقدس بھی پیدا کیا گیا تھا۔ میرک معین سبزواری نے جو احمد نگر کا حاجب تھا ذیل کی رباعی میں اس کی تعریف کی تھی۔

این قصہ کہ بہت رشک افزائے بہشت ایام بہ آب زندگانیست نوشت

تاریخ مرتب شدن اش کلک قضا بر لوح بقا بنائے جان بخش نوشت

نبات گھاٹ باغ محمد شاہی اور کوہ طور کی تعمیریں ایک علیحدہ مضمون کی طالب ہیں اور ان سے محمد علی کا بلند و بملہ ظاہر ہوتا ہے۔ کوہ طور کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی۔

قطرہ

از ان ایوان چہ گویم کز لطافت جہان را نسخہ خلد برین اسد

خم طاق بلند شش چون مرہ نو ز رفعت تا فلک پہلوشین است

جب اس محل کی جو کوہ طور میں ترتیب دیا گیا تھا تکمیل ہوئی تو اس میں بڑی مسرت کا اظہار ہوا، اور تمام اُمراء و روساء سلطنت کو خلعت فاخرہ عطا ہوئے تھے۔ میر ابو طالب جو محمد قلی قطب شاہ کا ناظر تھا بیان کرتا ہے کہ حیدر آباد اور اس کی عمارتوں کی تعمیر میں ستر لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔ گو لکنڈے کے اُمراء بھی شہ کو سجانے میں

حصہ لیتے تھے۔

شہر و عمارات کی یہ خوش اسلوبی اور عظمت کے مد نظر تاریخ کے یہ الفاظ کہ: ”در تمامی ہندوستان عدلیے تدار“ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ بیرونی سیاح اور مورخوں نے جو بالکل غیر جانبدار تھے شہر حیدرآباد اور اس کی عمارتوں کی اس سے زیادہ تعریف کی تھی۔ فرانسسیسی سیاح ٹیورنیر نے جو گو لکنڈے میں کئی مرتبہ آیا تھا بہت تعریف کرتا ہے: ”شہر نہایت سلیقے سے بنایا گیا ہے اور اس میں بڑے بڑے راستے ہیں“ ولیم مٹھولہ کہتا ہے کہ: ”شہر حیدرآباد اپنی خوشگوار آب و ہوا، اور پانی کی بہتات کی بدولت ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔“ یہ سیاح شمال کے تمام شہنشاہی شہروں سے واقف تھے۔ مورخ فرشتہ نے جس کو قطب شاہی سلطنت سے کوئی واسطہ نہ تھا ان الفاظ میں تعریف کی تھی: ”شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً و غرباً شمالاً و جنوباً مثل آن در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود“ فرشتہ کے عہد میں جو محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا شہنشاہی شہر آگرہ اور لاہور آباد تھے، خصوصاً فتح پور سیکری جو اکبر اعظم کا آباد کیا ہوا تھا بڑا بارونق شہر تھا، اور فرشتہ ان سے ناواقف نہ تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے مورخ حیدرآباد کی اس سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ خافی خاں کہتا ہے کہ: ”جو ضہائے آن شہر لطافت و آب و ہوائے آن سرزمین و حسن ہائے نمکین آن سبز قام و سیر حاصلی آن مرزبوم اگر پر دازم از سررشتہ سخن باز می مانم“ محمد ساقی نے جو شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ تھا، اور گو لکنڈے کے محاصرے کے وقت حیدرآباد میں موجود تھا اس کی پُر زور الفاظ میں تعریف

۱۔ سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۳۔

۲۔ گو لکنڈے کے تعلقات ص ۹۔

۳۔ تاریخ فرشتہ مقالہ سوم روضہ چہارم ص ۱۷۲۔

۴۔ منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۸۔

کی ہے: ”آرام گاہ ہے است بر قطعہ زمین و بہشت، راحت جسم و آرام جان۔ آبادی وسیع تر از احاطہ خیال عمارات رفیع تر از پایہ اندیشہ۔ رطوبت ہوا و عذوبت روانی چشمہا۔ شادابی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری گل و بہرہ این سرزمین لا آبیہ و رنگ زمرود و لعل است۔“ یہ دونوں مورخ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے اور ان زمانے کے لوگ تھے جبکہ مغل تمدن و شہریت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی تھی، اس کے باوجود شہر حیدر آباد کی ان الفاظ میں تعریف کرنا قطب شاہی تمدنی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ خود شہنشاہ گولڈنڈے کی تسخیر کے بعد شہر حیدر آباد میں آئے تو اس کی رونق اور شاہی عمارات کی عظمت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اس قدر دیکھی ہوئی کہ یہاں بہت دنوں تک رہ گئے۔ اس زمانے میں خود اہل حیدر آباد بھی یہ سمجھتے تھے کہ شہر حیدر آباد کے مقابلے میں ہندوستان کے شہنشاہی شہر بے حقیقت ہیں۔ جب کبھی حیدر آباد کی تعریف کی جاتی تو ایران کے شہروں کی مثال دی جاتی تھی۔ اگرہ۔ لاہور، اور شاہجہاں آباد کا کسی نے نام نہیں لیا۔ چنانچہ حضرت میر مومنؒ نے قصیدہ تہنیت میں لکھا تھا:۔

چو صفایان نوشد از شاہجہاں شاہ  
حیدر آباد از تو شد شاہ صفاہان نوے

## شاہی عمارتیں

قطب شاہی عمارتیں بھی بڑے ذوق و سلیقے سے بنائی گئی تھیں! اگر ان عمارتوں میں وہ لطافت نہیں ہے جو عادل شاہی عمارتوں میں پائی جاتی ہے تاہم یہ بہت بلند اور مضبوط ہیں، ان سے قطب شاہیوں کی بلند عیالی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت وہ تمام شاہی قصر موجود ہوتے جو حیدر آباد میں بنائے گئے تھے تو ان سے قطب شاہیوں کی حقیقی عظمت ظاہر ہوتی، تاہم جو آثار اس وقت پائے جاتے ہیں وہ بھی اس حقیقت کی رہنمائی کرتے ہیں کہ قطب شاہی عمارتوں پر لاکھوں روپیے اور بڑی محنت صرف ہوئی، بعض عمارتیں ایسی بنائی گئیں جو کئی عہدوں میں جا کر تیار

ہوئیں۔ اگرچہ ان عمارتوں کے بنانے والے جانتے تھے کہ یہ ان کی مختصر زندگی میں ختم نہ ہو سکیں گی، لیکن ان کی بلند خیالی اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی چیز ان کے حوصلے سے کم بنے۔ چار مینار اور مکہ مسجد تو ایسی عمارتیں ہیں جو دنیا کے عجائبات میں شمار کی جاسکتی ہیں ان کی رفعت و عظمت کا دنیا میں کوئی جواب نہیں بلکہ مسجد دنیا کی بہت بڑی عمارت ہے، سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ رنگیا میسٹری اور فیض ٹریڈنگ انجینیر نے اس کا کام شروع کیا تھا، لیکن ۷۷ سال میں یہ کام ختم ہوا، اور یہ اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچا جبکہ اورنگ زیب کی عمارت قاسم ہوگئی ہزاروں آدمیوں نے اس پر کام کیا ہے، اس کی اہلی محراب جو صرف ایک پتھر سے تراشی گئی ہے پانچ سال میں تیار ہوئی تھی، اور پانچ ہزار آدمیوں نے اس پر کام کیا تھا۔ جس وقت فرانسیسی سیاح ٹیورنیر گولکنڈہ آیا تھا ابھی مسجد ناتمام تھی اس نے مکمل مسجد کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ اگر یہ پوری ہو جائے تو دنیا میں سب سے بڑی اور ایشیا میں سب سے بہترین عمارت ہوگی۔ اگر اورنگ زیب کی کفایت شجاری حائل نہ ہوتی تو اس کے مینار آج سلطان محمد کی حقیقی بلند خیالی ظاہر کرتے، لیکن اس کوتاہی کے باوجود حیدر آباد کا یہ بیت الحقیق قلب شاہوں کی اصل عظمت کو یاد دلاتا ہے آج بھی حیدر آباد میں یہ واقعہ سب کو یاد ہے کہ زہد و تقویٰ کے بڑے دعوے کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، چوبیس گھنٹوں میں کبھی یہ مسجد عبادت گزاروں سے خالی نہیں رہتی۔ غالباً اسی وجہ سے یہ کہ مسجد کہلاتی ہے ایک شاعر نے کہا تھا۔

طوافِ خانہ اشرف گرت میر نیست      بیابہ کعبہ ملک دکن عبادت کن

قلب شاہوں کی حقیقی عظمت ان کے محلات سے بھی ظاہر ہوتی ہے اپنے دو سو سال کی تاریخ میں قلب شاہوں نے اتنے قصر اور محل بنائے تھے جو غالباً دنیا کے کسی شاہی خاندان نے نہیں بنائے۔ خود گولکنڈہ کے اندر جو سلطنت کا اہلی میسٹر تھا بے شمار محل بنائے گئے تھے اس کی ابتدا غالباً ابراہیم قلب شاہ نے کی تھی اس کے عہد میں سب سے پہلے

ایک ایوان شاہی بنایا گیا جو دولت خانہ عالی کے نام سے موسوم ہے اس کے علاوہ چند اور محل، باغ اور عمارتیں بنائی تھیں، چنانچہ باغ گلشن، ابراہیم باغ، لنگر دوازہ امام، بارہ دری مشہور ہیں۔ لیکن قطب شاہی سلطنت کی حقیقی تعمیر کاری محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہوئی جو اس خاندان کا بڑا مہمار ہے اس کی مشہور عمارتیں داد محل اور خدا داد محل تھیں جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خدا داد محل کی محمد قلی قطب شاہ نے ان الفاظ میں تعریف کی تھی۔

خدا داد محل کوں محمد سوارے      تو اس میں جنت کے نگاراں نگارے

بلندی محل کا ہے اسمان جیسا      سورج چاند تارے سو اس تھے سنگارے

نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسے محل کوں      گرد ہرت پر قدسیاں لا کے ٹھارے

سبحن محل اور اعلیٰ محل ان کے علاوہ تھے جن کی بادشاہ نے ان الفاظ میں تعریف کی تھی۔

سبحن محل میں ساج کر چھندان سو آتی      جان جانی ہو کے جان کا پیلا لاٹو بھون پلائی

اعلیٰ محل اعلیٰ دے اعلیٰ خوشیاں محتر گھڑی      اعلیٰ سکی اعلیٰ دے جو بن کھڑی دو دان بھری

اور دریلے موسیٰ کے کنارے ندی محل کے نام سے ایک پُر فضا محل بنایا گیا تھا جو ندی کی روانی کے ساتھ عجیب منظر پیدا کرتا تھا۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کی مشہور عمارتوں میں ”کوہ طور“، ”بنات گھاٹ“ بھی شامل ہیں یہ عمارتیں شہر سے قریب بلندی پر تعمیر کی گئی تھیں اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی تھیں اور ان کے اطراف نہریں اور آبشاریں تھیں۔ چوہدرت فوارہ دار حوض تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے خود ایک نظم میں کوہ طور کی یوں تعریف کی تھی

کہہ طور پر سدا ہے سبحان کا اُجالا      تو خلق سرمدہ کرتی رحمان کا اُجالا

اس نور کا سو ہمارا ماغہ بہشت بہشت ہے      اس نور تل چھپا ہے اسمان کا اُجالا



مشک محل اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے علیحدہ شہرت رکھتا تھا، اور گولکنڈے کی ایک تاریخ کے الفاظ میں ”مثل  
آن قصر ہاروسے زمین بنائے نشدہ“ سلطان محمد قطب شاہ نے خود کئی محل تعمیر کیے تھے، اس کا بنایا ہوا امان محل اکیلا  
بہت بڑی تفصیل کا محتاج ہے، محل کی آرائش اور اس کے ساتھ جو باغ محمد شاہی بنا تھا اس کی دیکھچیاں سلطان محمد کے  
حقیقی ذوق کو ظاہر کرتی تھیں، اس کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا تھا کہ سہ

وہ چہ قصر کو زرقعت تا فلک بوسد دیش      وہ چہ باغے کز لطافت ہست چون باغ جنان

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی بڑی بڑی عمارتیں بنی تھیں۔ نظام الدین ایک بہت بڑے  
محل کا ذکر کرتا ہے جو چار منزل بنایا گیا تھا۔ گو اس کا نام نہیں معلوم ہوتا اس میں مندر کی لکڑی اور ہاتھی دانت  
استعمال کیے گئے، اور اندر دیواروں پر رنگ کا کام کیا گیا تھا، اور اس میں تصویریں بھی تھیں اس نظم میں  
اس محل کی تعریف کی گئی تھی سہ

قصر عالی بنائے شاہنشاہ      ہست بر کلہ زمین چوکلاہ  
تاج بر سر نہادہ شخص زمین      میکند فخر بر سپہر برین انہ

اس کے علاوہ عبداللہ قطب شاہ نے نبی باغ اور باغ لنگم پل بنائے تھے، دونوں باغ شہر کے  
شمال میں واقع تھے۔ باغ لنگم پل میں تین منزلہ محل بھی بنایا تھا جس کے آثار اب تک موجود ہیں ان باغوں میں  
بڑے سلیقے کے ساتھ درخت اور پودے لگائے گئے اور کاریاں بنائی گئیں اور ان میں آب رسانی کا اچھا  
انتظام تھا۔ ابوالحسن قطب شاہ نے بھی ہندی کے کنا سے ایک بہت بڑا محل بنایا تھا جو چار محل کے نام سے  
موسوم تھا اس میں چار عمارتیں تھیں اور ان کے بیچ میں ایک بڑا حوض تھا، اور ہندی کے کنا سے بلندی کی  
وجہ سے دل فریب منظر پیدا کرتا تھا شہر کے شمالی جانب گوشتہ محل کے نام سے ایک اور محل تعمیر ہوا تھا جس کے

آثار اب تک موجود ہیں اور اس کے قریب ایک بہت بڑا حوض بنایا گیا تھا۔

اگرچہ زمانے کی ستم ظریفی نے ان عمارتوں کا خاتمہ کر دیا، اور جو باقی ہیں وہ بھی فنا ہو رہی ہیں۔ لیکن ان کی بوسیدہ درو دیوار سے قطب شاہوں کی تمدنی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عمارتوں کے مسلسل وسیع والاں۔ بادشاہوں اور بادشاہ بیگمیں کی رہائش کا شان دار انتظام اور شاہ نشین کا تزک و احتشام الفاظ سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا، اور جب شہر حیدر آباد میں شاہی قصر تعمیر ہوئے تو پھر عظمت و اوزم سے ان کی رونق بڑھائی گئی۔ کمان سحر باطل، شاہی دولت سرا کا در داخلہ تھا، اس کمان میں ایک عظیم الشان دروازہ تھا جس پر سونے کا کام تھا، اور اس کے مقابل کالی کمان کے پاس نوبت بختی تھی اور ان دونوں کمانوں کے درمیان شاہی حفاظت کے لیے فوجیں کھڑی ہوتی تھیں اور ہاتھی جھومتے تھے اور ایک عجیب حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام شاہی عمارتوں میں آب رسانی کا عجیب انتظام تھا تمام محلوں کے اندر نلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بلند دیواروں اور چھتوں پر پانی پہنچایا گیا۔ چھتوں پر بھی پانی کے چشمتے تھے۔ ہر محل کے ارد گرد باغبانی کا بڑا اچھا انتظام تھا ان کے علاوہ جو مستقل باغ تھے ان کی رونق و شادابی ایک پُر لطف منظر پیدا کرتی تھی ان میں ہر جگہ نہریں دوڑتی تھیں اور حوض و فوارے تھے اور جلابا سیدی اور خوشماروشیں بنی ہوئی تھیں جن کی دونوں جانب گل وادی کی قطاریں ہوتی تھیں اور موقع کی مناسبت سے کھجور اور ناریل کے درخت نصب کیے جاتے تھے اور غالباً یہ خاص ذوق و سلیقہ قطب شاہوں کے لیے

۱۔ تھیونوان محلات کی بہت تعریف کرتا ہے اس کا بیان ہے کہ ان بلند محلوں کی آخری منزلوں پر بھی پانی پہنچایا جاتا ہے، نیز وہ یہ بھی کہتا ہے کہ چار مینار کی بلندی پر بھی پانی پہنچتا ہے (تھیونو حصہ سوم ص ۹۴-۹۵)۔ قلعہ گوکنڈے میں اس وقت جو عمارتیں موجود ہیں ان میں نلوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔

۲۔ تھیونو حصہ سوم ص ۹۵۔

مختص تھا، اور جگہ اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ خود نخل شہنشاہ اور شہزادے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے جب شہنشاہ اورنگ زیب کا چھوٹا بیٹا شہزادہ محمد کام بخش حیدر آباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قلب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنی سکونت کے لیے ایک علیحدہ مکان تعمیر کر لیا جس کو شہنشاہ اسراٹ سمجھتے تھے۔ لیکن شہزادے نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ قلب شاہی محلوں میں رہنا اس سے زیادہ اسراٹ ہے۔ قلب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پر عظمت ہیں کہ ان کی کماحقہ پرداخت تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ ایک تہواری شہزادے کے یہ الفاظ شاہی بھائی محلات کا رہنے والا تھا بہت معنی خیز ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قلب شاہی قصر نخل عمارتوں سے کم نہیں تھے۔ دوسرے سیاحوں کے بیان سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔

بافات و محلات کے علاوہ قطب شاہوں کے رفاہ عام کے کام بھی قابل ذکر ہیں اور سب سے پہلے رفاہ عام | ابراہیم قطب شاہ نے مساجد، مدارس اور تالاب تعمیر کیے اس کے بنائے ہوئے تالاب حسین سنگریا ابراہیم پٹن اور بدویل بہت مشہور ہیں جو آب پاشی اور آب رسانی کے کام آتے تھے۔ حسین ساگر کی تعمیر جو حضرت حسین شاہ ولی کی نگرانی میں ہوئی تھی آٹھ مہینے میں ختم ہوئی اور اس پر دو لاکھ ہون صرف ہوئے۔ شہر حیدر آباد اور گولکنڈے کی آمد و رفت کے لیے ایک پل بنایا گیا جو پیرانا پل کہلاتا ہے اور ابراہیم کے جانشینوں کے عہد میں متعدد مدارس، کاروان سراہیں اور حمام و شفا خانے اور لنگر خانے بنائے گئے۔ لیکن قلب شاہی دور میں حیات شاہی کی تمدنی خدمات جو اکثر رفاہ عام کی صورت میں ظاہر ہوئے ناقابل غور ہوش ہیں۔ حیدر آباد میں حیات ماں سے لے کر انہی سالہ عمر میں تلگوانے کی اس قدر تمدنی خدمات انجام دیں کہ ان کا معجزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ پانچویں محرم کا گھنٹا لگنے کی

۱۔ گنزار آصفیہ میں ۳۔

۲۔ ولیم مہتولد جو انگریز کمپنی کا ملازم تھا کہتا ہے کہ قلب شاہی محلوں کی تہذیب نہیں ہو سکتی، یہ نخل محلوں سے بہت بڑے ہوئے ہیں۔ دو گولکنڈے کے تعلقات میں ۹۔

مشہور یادگار تھا جس دھچپ اور سنسنی خیز واقع سے اس کی ابتدا ہوئی تھی وہ ابھی تک سب کو یاد ہے اور محرم میں تقریباً ہر گھر میں دہرایا جاتا ہے اس کے علاوہ حسینی علم بی بی کا علم اور بی بی کا چشمہ حیات ماں کی یاد تازہ کرتے ہیں لیکن حیات ماں کی بہت بڑی یادگار اس کا آباد کیا ہوا حیات آباد ہے جس سے حیات بخشی بیگم کا صحیح ذوق تعمیر و آباد کاری معلوم ہوتا ہے یہ ۱۳۵۰ء میں عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے پہلے سال تعمیر کیا گیا، غالباً اس کا مقصد اس تخت نشینی کی یادگار قائم کرنا تھا، اور یہ ایک اچھی یادگار ہے! اول تو یہ حیدرآباد کے مشرق میں بہت قریب واقع ہے جہاں شاہی تقریبات اور تقریبیں ہو سکتی تھیں، دوسرے مسولی ٹیم کی شاہ راہ پر آباد کیا گیا تھا تاکہ جو مسافر مشرقی بندرگاہوں سے اور ملک کے مشرقی اضلاع سے حیدرآباد آتے تھے وہ یہاں ٹھہرتے تھے اور اس طریقے سے شہر سے قریب ایک اچھی منزل تھی حیات آباد میں شاہی قصر بنایا گیا، مسافروں کے لیے ایک کاروان سرا بنائی گئی جو سراے ماں صاحب کے نام سے موسوم ہے، اس کے کئی دروازے ہیں اس کے احاطہ میں ایک مسجد ہے جو قطب شاہی تعمیر کاری کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کے قریب جو خاص باغ "بنایا گیا تھا اب تک موجود ہے اور بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا، اس سے حیات ماں کے عہد کی رونق اور چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے، چنانچہ اس کے عہد کے ایک مؤرخ نظام الدین صاحب نے ان الفاظ میں حیات آباد کی تعریف کی تھی:۔

”حیات آباد کہ قطعہ ایست از بہشت برین و بقعہ ایست جنت آئین و در و دروغ جانب شرق  
دار السلطنت حیدرآباد و صا ہما اللہ فی ظل دولت۔۔۔۔۔“ و الفیاد۔ در

ابتداءً سال جلوس شرافت مانوس خاتقاہ یوسف جمال بہ طرح و نشین طرز فردوس  
قرین احداث فرمودہ اند۔ از و قوراہل صنعت و حرفت و جمعیت افسانہ لہقات  
انام و کثرت ابنیہ و عمارات رفیعہ و بسیارے باغات بسا تین مثابہ بہ شہر شدہ“

تمت

# صحیح نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۱	گو لکھڑے	گو لکھڑے	۳۸	۳	باہر سے	باہر سے
۱۱	۴	میر	امیر	۴۳	۱۷	رہان	برہان
۱۲	۴	نصب	نسب	۴۴	۱۵	اسد خاں	اسد خاں
"	۱۲	صلح	صلح	۴۹	۷	پڑتا	پڑے گا
۱۳	۲	نفا	تھی	"	۱۱	ہوئے	ہوئی
"	۱۳	نیرد	نیزد	۵۰	۱۲	۱۵۴۳	۱۵۴۳
۱۷	۷	قبائل	قبائل	۵۴	۲	یہجا پور	یہجا پور
۱۸	۱۳	کے	کو	۵۶	۵	ٹہے	ٹہے
۱۹	۹	پنادے	بنا دیا	"	۲	بنایا	بنایا
۲۰	۱	سے	نے	۶۲	۱۳	کوئل کھڑے	کوئل کھڑے
۲۳	۸	فرشتے	فرشتہ (ہر جگہ درست فرمایا جا)	۶۳	۱۴	تنگلھانہ	تنگلھانہ
۲۵	۱۶	بجوائے	بجوائی	۶۹	۶	پیچیدہ تھے	پیچیدہ تھے
۲۶	۵	ترغیب	ترغیب	۷۰	۱۲	گلبرگ	گلبرگ (ہر جگہ درست فرمایا جا)
۲۸	۱۶	سائیہ	سائر	۷۱	۱	رام راج سے	رام راج کی
۳۲	۴	اسی	ایسی	"	۱۲	ابراہیم عادل شاہ	ابراہیم نے عادل شاہ
۳۷	۳	مزاج	مزاجی	۷۲	۱۴	حسین نظام شاہ	حسین نظام شاہ بھی
۳۸	۳	بے چینی	بے چینی	۷۸	۶	نقصان پہنچا	نقصان بھی پہنچا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۹	۷	ہوئی نہیں اس قدر	ہوئی نہیں اس کی اس قدر	۹۱	۱۱	تھے	رہے
"	۸	حوصلہ افزا ثابت ہوئی	حوصلہ افزائی ہوئی	۹۲	۶	اس قابلیت	اس کی قابلیت
۸۰	۴	صلاح	صلاح	"	۱۴	نتہا ذمہ دار	نتہا سیاسی ذمہ دار
۸۱	۱۴	لیکن اس بات کی	لیکن اس کو اس بات کی	۹۴	۶	ناحق شناسی	حق ناشناسی
۸۲	۸	خبر نہیں ہوئی	خبر نہ ہوئی	۹۸	۲	لیئے	کیلئے
"	۹	ہو گئی	ہو گئی ہیں	۱۰۱	۲	ہٹالیں	ہٹالے
۸۳	۷	رو بہ رو	رو برو	۱۰۲	۱۰	فی	کی
۸۶	۲	پوری	پورے	۱۰۳	۱۷	دشمنوں	دشمنوں
"	۴	پتا نہیں چلتا	پتہ نہ چلتا	۱۰۶	۱۷	بے بناد	بے پناہ
۸۷	۱۲	تلنگانے کے	تلنگانے کی	"	۱۹	گر	مگر
۸۸	۱۶	طرح طرح	طرح طرح سے	۱۱۰	۱۷	میر مومن جو	میر مومن میں جو
"	۱۷	کرتے تھے	کرتے	۱۱۴	۱۶	شاہزادہ	شاہزادہ
"	۱۸	زہر نمان	زہر نمان	۱۱۵	۶	کو دی جاتی	کی کی جاتی
۸۹	۷	شمال	شمالی	۱۱۶	۵	اس وجہ	اسی کی وجہ
"	۸	چوری ترکاب	چوری کا از نکاب	"	۱۱	صحت اہم	صحت اہم
"	۱۴	علاذ	علاوہ	۱۲۲	۳	جو آئینہ	جو آئینہ
"	۱۴	علاذ	علاوہ	"	۱۲	بے بد شکون	لئے بد شکون
۹۰	۵	محبت سے فائدہ	محبت سے وہ فائدہ	"	۱۷	حسین شیرازی جو	حسین شیرازی جو
"	۷	سال تھی	سال کی تھی	۱۲۳	۸	رت	رہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲	۱۶	بدولت	بدولت	۱۵۳	۱۸	ان میں اکثر	ان میں سے اکثر
۱۱	۱۰	بعد ہی	بعد بھی	۱۶۷	۵	خدا ری کی پہلی	خدا ری کی پہلی پہلی
۱۲	۳	بڑھائی	بڑھاتی	۱۸۳	۳	الواسطہ	بالواسطہ
"	۱۷	آمدورفت کی	آمدورفت شروع کی	"	۷	ابو الحسن	سید احمد
۱۳	۳	حلاف	حلاف	۱۸۶	۱۸	سے ابو الحسن	سے وہ ابو الحسن
"	۷	دوسرے	دوسری	۱۸۹	۲	ربلا نہیں آتا	ربلا نہ آتا
۱۳۲	۳	لیت و لعل کیا	لیت و لعل کی	۱۹۹	۵	حکمہ ہی کر دیا	حکمہ کر ہی دیا
۱۳۳	۳	جیز	جنیز	"	۱۸	اور وہاں سے	پھر گو لکھڑے کا
۱۳۷	۵	ستارہ	ستارہ	۲۰۱	۵	ہو کر اپنی جاگیر	ہو کر اپنی جاگیر
۱۳۹	۶	خلفائے راشدین کے بعد	خلفائے راشدین کے بعد	"	۶	مطابق ہوگا	مطابق ہوگا
"	۱۲	صفویوں کی	صفویوں کو	"	۱۴	گزار اند	گزار اند
"	۲۰	رہنے لگتے	رہنے لگے	۲۰۳	۸	اہل ملک	اہل ملک
۱۴۹	۲	لیت و لعل کیا	لیت و لعل کی	"	۱۲	معلوم ہوتا ہے	معلوم ہوتا ہے
۱۵۰	۱۱	پچیا نو	پچیا نوے	۲۰۴	۷	باوجود ایک اپنا	باوجود اپنا ایک
"	۱۷	نذرانہ	نذرانے	"	۱۱	اب رہا	اب رہا
۱۵۱	۱۷	جانا تھا	جاتا تھا	۲۰۵	۱	کناس آباد	کناس آباد
۱۵۲	۱۳	لڑی	کرنی	"	۲	بخار نکالتے	بخار نکالا
۱۵۳	۱۴	لیکن سیوا جی	لیکن سیوا جی	"	۹	اس پر وہ توجہ	اس پر توجہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۶	۱۰	کابد فرجام	کافرید فرجام	۲۱۴	۱	سود ہاتھی	سونہا ہاتھی
۲۰۹	۲	باب	باب	"	۲	حاجب ہی	حاجب ہی
۲۱۰	۲	~	یہ	"	۴	شمال شمالی	شمال اور شمالی
"	۳	حالات کے تحت	حالات کے تحت	"	۷	مرکزی حکومت	مرکزی حکومت
"	۳	ایک مستقل	ایک مستقل	"	۱۷	ابراہیم مرشکر	ابراہیم مرشکر
"	۳	مسک فرار دینا	مسک قرار دینا	۲۱۵	۴	اور حب	اور حب
"	۴	بڑا منصوبہ	بڑا منصوبہ	"	۱۳	بقابہ	بقایا
"	۵	دکن	دکن	"	۱۳	ایک نہیں سنی	ایک نہ سنی
"	۶	ندھا دھند	ندھا دھند	"	۱۴	عبداللہ بارہ	عبداللہ بارہ
"	۷	ہندو ان	ہندوستان	"	۱۷	لقب	لقب تھا
"	۱۱	ذہن میں	ذہن میں	۲۱۶	۱	ہاتھی و گھوڑے	ہاتھی اور گھوڑے
"	۱۶	۱۹۸۳ء ۱۰۹۵ء	۱۹۸۳ء ۱۰۹۵ء	۲۱۷	۱۵	شمشیرہ نوماٹی	شمشیرہ آزماٹی
"	۱۸	چھوٹی موٹی	چھوٹی چھوٹی	۲۱۹	۳	پیدا ہو گئی	پیدا ہو گئی تھی
۲۱۱	۳	گر و سال	گر و سال	۲۲۰	۱۴	محمد تقی محمد داؤد	محمد تقی اور محمد داؤد
"	۴	مدد کر لی	مدد کر لی	"	"	نے سلطنت سے	نے بھی سلطنت سے
"	۱۳	بنایا تھا	بنادیا تھا	۲۲۱	۴	بہادر خاں کی	بہادر خاں کو طاقت
۲۱۲	۴	اس لیے ابوالحسن	چنانچہ ابوالحسن	"	۱۴	آہستہ سفر	آہستہ سفر
"	۹	فرانز	فرانز	۲۲۱	۶	ابوالحسن	ابوالحسن



صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۱	۶	گھٹ گئی	گھٹ گئی جاہ	۲۵۰	۹	ہے شاہ	ہے شہہ
۲۴۶	۶	اورنگ کو	اورنگ آباد کو	۲۵۱	۱۳	اشناعشرہ	اشناعشر
"	۱۱	پائے بنالیا	پائے تحت بنالیا	۲۵۴	۱۱	کہ ایک مقامی	کہ یہ ایک مقامی
۲۴۷	۸	بہ آں حدے	بہ آں حدے	۲۵۸	۱۵	تو اس قدر	تو اتنی قدر
"	۱۳	افتاد نانا	افتاد نانا	۲۶۲	۶	اعضائے املا	اعضائے عاملہ
"	۱۵	عالم مردم	عالم عالم مردم	۲۶۴	۲	بہ دولت	بدولت
"	۱۶	ثمرہ	شمرہ	"	۱۳	سمنوں و محالات	سمنوں اور محالات
"	"	از آن	ازاں	۲۶۶	۱۰	صوبوں و اضلاع	صوبوں اور اضلاع
"	۱۸	بعضے قائم	بعضے جا قائم	"	۱۵	پچھلے	پہلے
"	۱۸	دحوالی حیدر آباد	دحوال حیدر آباد	۲۷۲	۱۵	آج صدیوں	آج سے صدیوں
۲۴۸	۱	نماہ	نماہ	۲۷۶	۴	جنگلات	جنگلوں
"	۵	گو لکٹہ	گلکٹہ	۲۷۸	۶	کر لیے تھے	کر لیا تھا
۲۴۹	۱۴	کے انتقال	کے سہ انتقال	۲۸۰	۷	پیدا ہوتا تھا	تیار ہوتا تھا